تاریخ فحاشی نمبر

سالنامہ ۱۹۹۶ء

نگار پاکستان

بانی

علامہ نیاز فتح پوری

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مراسلت: سی ۲۸، بلاک ۱۳ ڈی، گلشن اقبال، کراچی۔ فون: ۴۹۸۰۴۴۰

بانی ---- علامہ نیاز فتح پوری ----- جاری شدہ ۱۹۲۲ء

نگارِ پاکستان

مدیر اعلیٰ:- ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مدیر:- امراؤ طارق

معاون مدیر:

سرشار صدیقی
ڈاکٹر سرفراز نیازی
عبدالرحمٰن ناصر
ریاض نیازی

مراسلت:- سی ۲۸، بلاک ۱۳ ڈی، گلشن اقبال کراچی فون ۴۹۸۰۴۴۰

سالنامہ ۱۹۹۶ء

جنسیات نمبر

۷۶ واں سال	دسمبر ۱۹۹۶ء	شمارہ ۱۲

ملاحظات

اس شمارے کی صورت میں علامہ نیاز فتح پوری کی مشہور کتاب "ترغیبات جنسی" جسے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہنی چاہیے، آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ آج سے کوئی ستر سال پہلے، پہلی بار شائع ہوئی تھی

فرمان فتح پوری

زیرِ نظر شمارہ ------------- ایک سو پچاس روپے

زرِ سالانہ ------------------- سو روپے

اختر حسین نے ایجوکیشنل پریس سے چھپوا کر اردو بازار کراچی سے شائع کیا

تاریخ فحاشی

☆

نیاز فتحپوری

نام کتاب	ترغیبات جنسی یا شہوانیات
مصنف	علامہ نیاز فتح پوری
طابع	ایجوکیشنل پریس
قیمت	دو سو پچاس روپے

ملنے کے پتے

مکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور

بیکن بکس، بوسن روڈ ملتان

اختر کتاب گھر اردو بازار کراچی

فہرست

تمہید

اس امر میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ انسان کا مطالعہ خود اپنی ذات سے شروع ہو کر دوسری چیزوں پر ختم ہونا چاہئے، یا دیگر اشیاء سے شروع ہو کر اپنی ذات تک پہنچنا چاہیے۔ لیکن اس پر یقیناً سب متفق ہوں گے کہ انسان کے فرائض علمی میں ایک بڑا اہم فرض "مطالعہ ذات" بھی ہے یہاں "ذات" سے فلسفۂ تصوف کی "ذاتِ خداوندی" مراد نہیں، بلکہ "ذاتِ انسانی" مقصود ہے جس میں اس کے صفات، خواہشات یا "وظائف و کوائف" سب شامل ہیں۔

جہاں تک صرف زندگی یا سانس لینے کا تعلق ہے انسان اور حیوان مطلق میں کوئی فرق نہیں، لیکن جس وقت ہم انسان کے تمام کاروبارِ حیات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی کیفیت اور بھی ایسی پائی جاتی ہے جو تمام حیوانات سے اس کو ممیز کرنے والی ہے اور یہی کیفیت وہ ہے جس کا نام اہل علم نے "تعقل" رکھا ہے اور جس کو دوسرے الفاظ میں

"غور و فکر" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگر کارگاہِ حیات پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عالم کی تمام رونق، دنیا کا سارا ہنگامہ منحصر ہے صرف انسانی خواہشات پر جن کی تکمیل کے لئے وہ اپنی تمام جسمانی و دماغی قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ وہ بھوکا ہوتا ہے تو حصول غذا کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا، وہ سردی گرمی محسوس کرتا ہے تو اس کے دور کرنے کے لئے شب و روز محنت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور جب اسے پیاس معلوم ہوتی ہے تو پانی کے لئے وہ دیوانہ وار دوڑتا پھرتا ہے منجملہ انھیں فطری خواہشات کے ایک خواہش وہ بھی ہے جو تعلق جنسی یا جذبۂ شہوانی سے وابستہ ہے اور اس کے لئے بھی تگ و دو کرنا اس کی عادت ہے۔ لیکن جس طرح فراہمی غذا کے سلسلہ میں انسان سدِ رمق یا نانِ جویں سے بڑھ کر مزعفر و بریانی پر بھی بس نہیں کرتا، حفاظت کے لئے کھدر سے گزر کر حریر و پرنیاں تک پہنچ جاتا ہے تشنگی رفع کرنے کے سلسلہ میں سادہ پانی سے شراب انگور تک بڑھ جاتا ہے، اسی طرح وہ خواہش جنسی پورا کرنے میں ایک جائز حد سے گزر کر ان بدعتوں تک پہنچ جاتا ہے جو بڑی حد تک غیر فطری، غیر انسانی اور غیر تمدنی ہیں۔

انھیں بدعنوانیوں و بے اعتدالیوں کو روکنا "تعقل" کا کام ہے اور اسی کا استعمال انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔

پھر جس طرح انسان نے اپنی اور تمام خواہشات میں اعتدال پیدا

کرنے کے لئے تعقل کے ذریعہ سے متعدد علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اسی طرح
اس نے اپنی خواہش جنسی کو جائز حدود میں رکھنے کے لئے جنسیات
(Sexology) کو پیدا کیا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو
ماننا پڑے گا کہ اس علم کی اہمیت اور تمام علوم کے مقابلہ میں بہت زیادہ
کیونکہ تمدن کا بڑا ہنگامہ اسی خواہش پر منحصر ہے اور اس کا تعلق ایسی
جنس سے ہے جو انسان کا بہترین نصف حصہ کہلاتی ہے اور دنیا کی
تقریباً آدھی آبادی ہے۔

مغربی زبانوں میں اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں خصوصیت
کے ساتھ گزشتہ ربع صدی میں تو نہایت زیادہ انہماک کے ساتھ اس طرح
توجہ کی گئی اور غیر معمولی طور پر بہت زیادہ لٹریچر اس موضوع پر شائع ہوا لیکن مشرقی
زبانوں اور خاص کر اردو میں کوئی قابل ذکر کتاب اس مسئلہ پر نہیں لکھی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں کوک شاستر کے اصول پر تو ضرور مرتب
کی گئیں لیکن ان کا مقصود بجائے اصلاح کے اور زیادہ ہیجان پیدا کرنا ہے اور ان سے
صرف وہی ادنیٰ ذہنیت اور معمولی ذوق کے آدمی لطف اٹھا سکتے ہیں جو اس فن کے
علمی پہلو کی جگہ محض عملی پہلو کو دیکھنا پسند کرتے ہیں چنانچہ عرصہ سے میرا خیال تھا
کہ ایک بسیط تالیف اس موضوع پر پیش کروں اور لوگوں کو بتاؤں کہ اس مسئلہ کے
کون کون سے پہلو غور کرنے کے قابل ہیں اور تاریخ و علم کی روشنی میں اس کا مطالعہ
کرنے سے کیا فائدے ہم کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

فحاشی کی تعریف

قبل اس کے کہ اس موضوع پر گفتگو شروع کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فحاشی کا وہ مفہوم متعین کر دیا جائے جس کو سامنے رکھ کر آیندہ بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے موضوع کے لحاظ سے "فحاشی" نام ہے ہر اس طریق عمل کا جو قانون قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اصول کے خلاف خواہش نفسانی پورا کرنے کے لئے اختیار کیا جائے اور اس میں وہ صورت بھی شامل ہے جس کا تعلق صرف کسب زر سے ہے اور جس کو عصمت فروشی کہہ سکتے ہیں۔

اہل مغرب نے فحاشی و عصمت فروشی کا مفہوم متعین کرنے میں بہت کاوش کی ہے اور مختلف لوگوں نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں۔

رومی الپیون (Roman Alpion) اس کو صرف اس فرد نازک کے لئے مخصوص کرتا ہے جس کا مدعا محض کسب زر ہو، گیوت (Guyot) اس میں دونوں جنسوں کو شامل کرتا ہے لیکن کسب زر کی خواہش کو ضروری شرط قرار دیتا ہے۔

بونگر (Bonger) کسب زر کی خواہش کو ضروری قرار نہیں دیتا صرف خواہشات نفسانی پورا کرنے کو اصل چیز قرار دیتا ہے۔

رچارڈ بھی وہی کہتا ہے جو گیوت کا نظریہ ہے اور لفظ عصمت فروشی میں دونوں جنسوں کو شامل کرتا ہے۔

ڈاکٹر بلاخ (Bloch) کہتے ہیں کہ ہر وہ مرد یا عورت "فحاش" کہلائے گی جو متعدد ہستیوں کو اپنے سے لذتِ نفس حاصل کرنے کی اجازت دے، خواہ باہم گرد لبستگی پائی جائے یا نہ پائی جائے اس تعریف میں وہ اُجرت لینے کی شرط کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔

الغرض اہل مغرب نے فحاشی و عصمت فروشی کے حدود متعین کرنے میں عجیب و غریب نظریوں سے کام لیا ہے اور اس وقت تک وہ کوئی جامع و مانع تعریف اس کی نہیں بیان کر سکے لیکن ہم نے ابتدائی سطور میں ان تمام نظریوں سے ہٹ کر ایک علیحدہ نظریہ قایم کیا ہے اور اس تعریف کی بناء پر ہر قسم کی فحاشی اس میں داخل ہو جاتی ہے۔

فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب | جن لوگوں نے مسائلِ جنسی کی علمی تحقیق کی ہے، ان میں اس مسئلہ پر اختلاف پایا گیا ہے کہ آیا فحاشی (یعنی بغیر نکاح کے خواہش جنسی کو پورا کرنا) عہدِ وحشت کی یادگار ہے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ عہدِ قدیم میں فحاشی کوئی عیب نہ سمجھی جاتی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ عہدِ وحشت کا انسان فحاشی کی طرف مائل ہی نہ تھا، اور جنسی تعلقات صرف رشتۂ ازدواج کے ذریعہ سے پیدا کئے جاتے تھے۔

اس تحقیق کے سلسلہ میں جب دودھ پلانے والے جانوروں کی حالت پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند نر و مادہ ایک دوسرے

کے پابند ہوتے ہیں لیکن یہ پابندی بہت تھوڑے زمانہ تک قائم رہتی ہے، بعض جانور ایسے ہیں جن کے نروں کو اپنے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر مادہ ان کو لڑ کر نہ نکال دے تو وہ بچوں کو کھا جائیں اس لئے اگر جانوروں کے حال پر قیاس کر کے عہد قدیم کے انسان پر حکم لگایا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ممکن ہے اُس وقت مرد عورت میں کوئی خاص صورت تعلق جنسی کی ہوتی ہو، لیکن اس میں استحکام تو کسی طرح نہ ہوتا ہوگا اور ایک ہی فرد پر قانع رہنا مرد کا شعار نہ رہا ہوگا۔

ویسٹر مارک کا خیال ہے کہ قدیم انسان میں نکاح کا رواج عام طور سے پایا جاتا تھا، لیکن اس کی تین صورتیں ہوا کرتی تھیں ایک یہ کہ مرد کئی بیویاں رکھتا تھا، دوسری یہ کہ عورت کئی کئی شوہر رکھتی تھی اور تیسری یہ کہ ایک عورت ایک ہی مرد کے لئے مخصوص ہوتی تھی مگر محدود زمانے کے لئے۔

بہر حال اگر مرد عورت کے تعلق جنسی میں کوئی شائبہ عائلی زندگی یا خواہش اولاد کا پایا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ نکاح یا باہمی پابندی کا خیال بھی اُسی وقت انسان میں پیدا ہوا ہوگا جب اُسے عائلی زندگی کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ مگر اب اس کی تعیین دشوار ہے کہ یہ احساس انسان میں کب اور کن صورتوں میں پیدا ہوا۔ مسٹر وائرہی ([illegible]) کا خیال ہے کہ جب تک انسان کو حصولِ غذا میں دشواریوں کا سامنا رہا اس کی خواہشات جنسی دبی رہیں لیکن جب سامان خورد و نوش کافی فراہم ہونے لگا تو اُس کی بدمستیاں بھی بڑھ گئیں، چنانچہ آپ جنگلی جانوروں کو دیکھئے جب تک وہ جنگل میں رہتے ہیں اور غذا کی

فکر سے آزاد نہیں ہوتے، صرف مخصوص زمانہ میں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں، لیکن جب انھیں پال لیا جاتا ہے اور وہ فکرِ غذا سے آزاد ہو جاتے ہیں تو وہ بے فصل بھی ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے نظر آتے ہیں۔ بہر حال تعلق جنسی کی طرف شدت میلان خواہ فارغ البالی کی وجہ سے ہوا ہو یا کسی اور سبب سے، دیکھنا یہ کہ عہدِ قدیم میں رشتۂ ازدواج کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی اور مختلف قوموں میں اس نے کیا مختلف صورتیں اختیار کیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم کو شادی یا ازدواج کی تاریخ پر غور کرنا ہے۔

شادی تمدن کے ارتقاء پر اگر گہری نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عہدِ قدیم میں انسان بالکل جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اور غذا کی تلاش میں ہر وقت اُسے سرگرداں رہنا پڑتا تھا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ حلال و حرام کی کوئی تمیز قائم نہ ہوئی تھی، سوسائٹی کا کوئی ایسا اصول مرتب نہیں ہو سکتا تھا جسے نکاح سے موسوم کیا جائے اور یقیناً جانوروں ہی کی طرح وہ ہیجانِ نفس کو بھی پورا کرتا ہوگا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب "اشتراک فی النسواں" کی بنیاد دنیا میں قائم ہوئی اور ایک عورت ہر مرد کی ملکیت قرار پائی جس کو اس پر دسترس حاصل ہو جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے انسان کو اُس وقت غور کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہوگی جب اس نے دیکھا ہوگا کہ تعلق جنسی کا ایک نتیجہ اولاد کا پیدا ہونا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اول اول بچہ کی پرورش کا کام صرف عورت ہی کے سپرد ہوا ہوگا اور مرد کو مطلق اس طرف توجہ نہ ہوئی ہوگی اور غالباً یہی وہ چیز تھی جس نے آگے چل کر

نظام "امہاتی" کی بنیاد ڈالی۔

نظام اُمہاتی "نظام امہاتی" سے مُراد معاشرت کا وہ نظام ہے جس میں قوم کی ماؤں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی بعض محققین کا خیال ہے کہ اوّل اوّل یہی نظام قائم تھا، چنانچہ اس کے ثبوت میں ڈاکٹر باچوفن (Bachofen) ایشیاء کوچک کی قوم لائسی (Lycians) کو پیش کرتے ہیں جس میں نظام امہاتی کا رواج پایا جاتا تھا اور اس کی تصدیق ہیروڈوٹس کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس نے لکھا ہے کہ اس قوم میں بچہ کا نام ماں کے نام پر رکھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جو قدر و منزلت ماں کی ہوتی تھی وہی بچہ کی ہوا کرتی تھی۔

جزیرہ سماترا میں اب بھی یہی نظام رائج ہے یعنی شادی کے بعد شوہر اپنی بیوی کے گھر جا کر رہنے لگتا ہے اور اس کے تمام مصارف لڑکی والے پورا کرتے ہیں۔ اس قسم کی شادی کو یہاں امبیل اناک (Ambil anak) کہتے ہیں۔ ہندوستان میں "گھر دامادی" کا رواج بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔

مطالعہ بائبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یعقوبؑ نے اپنی بیوی کے خاطر اپنے خسر لابن کے پاس ۱۴ سال تک مویشی چرانے کی خدمت انجام دی اور اسی طرح موسیٰؑ اپنی بیوی صفورہ کی وجہ سے اپنی سسرال میں رہے۔ اگر یہ خدمت عورت کی قیمت نہ تصور کی جائے تو اس کو بھی نظام امہاتی کی چیز ماننا پڑے گا لیکن اگر نظام امہاتی کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا قیام بہت کم رہا اور سوائے چند مخصوص قوموں کے کہیں اور رائج نہ ہو سکا۔ البتہ نظام بطریقی

(Patriarchate) نے بہت زیادہ وسعت حاصل کی اور آج تک اسی کے اثرات تمام دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔

نظام بطریقی چونکہ انسان قدیم صرف گلہ بانی کرتا تھا۔ اس لئے جس قبیلہ میں مویشیوں کی کثرت ہوتی تھی اُسے متمول خیال کیا جاتا تھا پھر چونکہ کثیر التعداد مویشیوں کے لئے وسیع سبزہ زاروں اور چراگاہوں کی ضرورت ہوتی تھی، اس لئے رفتہ رفتہ قبائل میں باہمدگر اس پر جھگڑا ہوتا تھا اور یہ نزاع مستقل جنگ کی صورت اختیار کر لیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ فریق غالب مغلوب قبیلہ کی بستیوں پر تاخت کرتا، مال و مویشی اور عورتیں بچے سب پر قبضہ کر کے اپنے ساتھ لیجاتا اور یہی ابتدا نظام بطریقی کی تھی۔

جو عورتیں بحیثیت اسیران جنگ، فاتحین کے حصہ میں آتی تھیں وہ مردوں کا "مال" متصور ہوتی تھیں اور ذلیل سمجھی جاتی تھیں۔ پھر اس کے بعد جو جو زمانہ گزرتا گیا، گھر کی بیویاں اور بیٹیاں بھی "مال" سمجھی جانے لگیں اور اس طرح عورت کی حکومت یا مالکانہ حیثیت غائب ہو کر مردوں کی حکومت وملکیت قائم ہو گئی۔ علاوہ ازیں چونکہ میدان جنگ اور مال و متاع کی حفاظت کے لئے مردوں کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے اولادِ نرینہ کو فوقیت دی گئی اور لڑکیاں ذلیل سمجھی جانے لگیں۔ ترکہ سے محروم کی گئیں اور بعض بعض قوموں میں ان کو قتل کر دینے کا رواج قائم ہو گیا۔

گرفتاری عروس دختر کشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل میں عورتوں کی کمی ہونے لگی لیکن چونکہ سرداران قبائل کا فرض تھا کہ وہ اپنی نسل کو نہ صرف باقی

رکھیں بلکہ ترقی دیں، لہٰذا وہ کسی ہمسایہ قبیلہ کو جو نسبتاً کمزور ہوتا تاک لیتے، بعد ازاں ایک مہم مرتب کر کے بے خبری میں اُس کمزور قبیلہ پر جا پڑتے، ان کی جوان بہو بیٹیاں چھین لاتے اور اپنے قبیلہ کے نوجوانوں سے اُن کی شادیاں کر دیتے۔ یہ شادی گویا بذریعہ گرفتاری ہوتی تھی۔ اس قسم کا رواج ترکستان کے ازبکوں، ترکمانوں، قرغیزوں اور قلماقوں میں اب تک موجود ہے۔ اگرچہ اب جنگ تو نہیں ہوتی لیکن برات کی صورت بالکل جنگی مہم جیسی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بھی گوجر قوم کی برات جب "چڑھتی" ہے تو تمام براتی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ آگے آگے ایک شخص گھوڑے پر سوار نقارہ پر چوب مارتا چلتا ہے۔ تمام برات اسی وضع سے دُلہن کے گھر پہنچتی ہے اور اُسے بیاہ لاتی ہے۔ اس رواج میں "عسکریت" موجود ہے۔ بعض قوموں میں دولہا اپنی گود میں دلھن کو اٹھا کر محافہ میں سوار کراتا ہے۔ گویا وہ اپنی دلھن کو "بقوتِ بازو" چھین لایا ہے۔ بعض اقوام میں جب برات دلھن کے گھر پہنچتی ہے تو دلھن کے طرفدار برات کو روکتے ہیں، یہ گویا "مزاحمت" ہے اور اُسی زمانہ کی یادگار چلی آتی ہے جب دلھن کو بذریعہ تاخت گرفتار کر کے لایا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل میں بھی یہ رواج موجود تھا۔ ملاحظہ ہو صحیفہ قاضیون باب ۲۱۔ آیۃ ۱۰۔ لغایۃ ۲۲۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"تب انھوں نے بارہ ہزار بہادر مرد روانہ کئے اور انھیں حکم دیا کہ یبیس جلعاد کے باشندوں کو جا کر قتل کریں، تمام ان عورتوں کو جو مردوں سے ہمبستر ہو چکی ہوں ہلاک کریں پس انھوں نے یبیس جلعاد میں چار سو کنواری

عورتیں پائیں جو مرد سے ناواقف تھیں اور وہ انھیں سرزمین کنعان میں سیلا
کے بیچ لشکر میں لے آئے پھر انھوں نے بنی بنیامین کو طلب کیا اور ان عورتوں
کی ان سے شادیاں کر دیں لیکن وہ ان کو کافی نہ ہوئیں، تب جماعت کے
لوگ بولے کہ جو مرد بچ رہے ہیں ان کے لئے بھی بیویوں کی فکر کی جائے تاکہ
بنی اسرائیل کا ایک فرقہ نابود نہ ہو جائے مگر لوگوں نے کہا کہ ہم نے قسم
کھائی ہے کہ بنی بنیامین کو اپنی بیٹیاں ہرگز نہ دیں گے۔ تب انھوں نے یہ
مشورہ کیا کہ سیلا میں اس جگہ جو جانب شمال بیت ایل کی سڑک پر واقع ہے
وہاں کے لوگ ہر سال خداوند کی عید مناتے ہیں پس بنی بنیامین جائیں اور تاکستانوں
میں چھپ کر گھات میں رہیں۔ جب سیلا کی بیٹیاں دف و چنگ لے کر ناچتی ہوئی نکلیں
تو کمین گاہوں سے نکل کر ہر شخص اپنے لئے ایک لڑکی گرفتار کر لے اور اپنے ملک کو
چلا جائے الغرض بنی بنیامین نے ایسا ہی کیا اور اپنے لئے ایک ایک
بیوی پکڑ لے گئے۔"

یہی کارروائی زمانۂ قدیم میں رومیوں نے کی تھی جب انھیں بیویوں کی ضرورت
پڑی تھی۔ رومیولس نے صابین (Sabine) لوگوں اور قرب و جوار کے
شہروں اور قصبوں کے باشندوں کو عام تماشہ دیکھنے کے لئے مدعو کیا۔ اور جب
اطراف و جوانب کے مرد و زن جمع ہوئے تو رومیوں نے چھاپہ مارا اور جس قدر
عورتیں شادی کے قابل ان کے ہاتھ لگیں پکڑ لے گئے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ روم
مصنفہ لڈل صاحب صفحہ ۲۰ (Liddel's History of Rome, P. 20)

بعض وحشی قوموں میں بیوی کا لانا اور بھی زیادہ سخت کام ہے۔ دولھا جھپٹ کر خسر کے گھر میں گھس جاتا ہے اور دولھن کے سر پر ایک ایسی سخت ضرب لگاتا ہے کہ بیچاری بیہوش ہو کر گر جاتی ہے۔ بعدازاں وہ لڑکی کو اسی طرح بعالم بیہوشی اٹھا کر کندھے پر لاد کر بھاگ جاتا ہے۔ سسرال والے اس کا تعاقب کرتے اور اینٹ پتھر مارتے ہیں اور اگر پکڑا جاتا ہے تو ڈنڈوں سے بھی خبر لیتے ہیں۔ الغرض دولھا کے لئے لازم ہے کہ وہ جس قدر طاقتور چست و چالاک ہو اسی قدر تیزی کے ساتھ دلھن کو لے کر فرار ہو جائے۔ یہ گویا رسم شادی ہے اور اس زمانہ کی یادگار ہے جب سچ مچ جنگ کر کے بیویاں حاصل کی جاتی تھیں۔

خریداری عروس جب ارتقائے تہذیب و تمدن کے ساتھ انسان کی چوپانی اور خانہ بدوشی، زراعت و عمرانیت میں تبدیل ہوئی تو اسی کے ساتھ ساتھ سکریت بھی ضعیف ہونے لگی اور بعد کو مستقل بستیاں بس گئیں، حکومتیں قائم ہو گئیں، سماج کے تحفظ کے لئے آئین و قوانین وضع ہونے لگے اور دوسروں کی لڑکیاں چھین لانے کا دستور بند ہو گیا۔ اب شادی کی دو صورتیں رہ گئی تھیں یا تو دلھن کو بہ رضامندی اس کے والدین سے حاصل کیا جائے یا اسے دولت کے عوض خریدا جائے۔ دولتمندوں میں تو بغیر معاوضہ کے باہمہ گر رشتۂ ازدواج آسان تھا لیکن عوام میں طریقۂ ازدواج نے یہ صورت اختیار کر لی کہ لڑکی اس کے والدین سے مال دے کر خرید لی جاتی، یا لڑکی والا داماد سے مدت معینہ تک کوئی خدمت لیتا رہتا۔ ہندوستان میں اب بھی روپیہ لے کر ماں باپ کا اپنی نوعمر لڑکیوں کو ضعیف آدمیوں سے بیاہ دینا دیکھا جاتا ہے۔ افریقہ میں بیویاں مویشیوں کے عوض خریدی

جاتی ہیں۔ ہندوستان کے جاٹوں میں بعض مقامات میں دیکھا گیا ہے کہ جو عورت کھیت میں جاکر اپنے ہاتھ سے دو من چارہ کاٹ کر سر پر لاد لائے اور پھر چارہ کاٹ کر بھینسوں کو کھلاوے اس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ خوبصورت ہو یا بدصورت۔

بیان کیا جاتا ہے کہ افغانستان میں بھی لڑکی کے عوض روپیہ لیا جاتا ہے جسے وہ اپنی اصطلاح میں "حق شیر مادر" کہتے ہیں۔ لیکن بنگالیوں میں یہ دستور الٹا ہے۔ یہاں لڑکا اپنے خسر سے اپنی قابلیت اور حیثیت کے لحاظ سے روپیہ وصول کرتا ہے۔ اسی مذموم رواج کا نتیجہ ہے کہ بہت سی بنگالی لڑکیاں جن کے والدین مفلس ہوتے ہیں مایوس ہو کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ کوہستان شملہ میں ابھی اس قسم کی زن فروشی کا میلہ ہر سال منعقد ہوتا ہے۔

بعض وحشی اقوام میں عورتیں اس لئے خریدی جاتی ہیں کہ وہ اپنے آقا کی خدمت کریں۔ فرائض زوجیت بالکل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن لوگوں میں تعداد ازدواج کا دستور ہے ان کی نسبت یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی کنیزیں ان کی بیویاں ہیں۔ نہ یہ کہ ان کی بیویاں ان کی کنیزیں ہیں۔ کیونکہ وہ لونڈیوں کی طرح خریدی جاتی ہیں اور لونڈیوں کی طرح کام کرتی ہیں۔

کناڈا میں نئی دلہن کے حجرہ میں ایک دیگچی، ایک تسمہ اور گٹھا لکڑیوں کا رکھ دیا جاتا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ آئندہ سے دلہن کا فرض یہ ہوگا کہ کھانا پکائے، بوجھ اٹھائے اور شوہر کے لئے جنگل سے لکڑیاں لائے۔
ممالک چرکس میں عورتیں ہی زمین میں کھاد ڈالتی ہیں اور ملک چین کے

بعض حصص میں عورتیں ہل بھی چلاتی ہیں۔ ہندوستان میں عورتیں کھیتی باڑی کا کام کرتی ہیں۔ مراکش اور شمالی افریقہ کے اکثر حصص میں بیوی ہی زمین کھودتی، بیج بوتی اور فصل کاٹتی ہے۔ عرب کی عورتیں اپنے شوہروں کے گھوڑوں کی خدمت کرتی ہیں، سواری کے وقت اس پر ساز لگاتی ہیں اور گھر کا تمام کام کرتی ہیں۔

کلیسا نے بھی عورت کو مرد کا غلام رکھا، چنانچہ انگریزی قانون میں بیوی اپنے شوہر کا مال متصور ہوتی تھی اور نکاح کے بعد اس کو اپنے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ اس کی ذاتی جائداد بھی شوہر کی ملکیت ہو جاتی تھی۔

نکاح دھرم شاستر میں ہندوؤں میں دھرم شاستر کی رو سے بیاہ کی آٹھ قسمیں ہیں:- (۱) برہم بواہ (۲) دیو بواہ (۳) ارشا بواہ (۴) پرجا پتی بواہ (۵) اسر بواہ (۶) گندھرب بواہ (۷) راکشش بواہ (۸) پشاچ بواہ۔

منوسمرتی میں لکھا ہے کہ نکاح کے یہ آٹھوں طریقے جائز ہیں لیکن اول چار قسمیں برہمنوں کے لئے ہیں اور چھ قسمیں چھتریوں کے لئے مناسب ہیں، راجہ اگر چاہے تو راکشش بواہ بھی کر سکتا ہے۔ اسر بواہ صرف ویش اور شودر اقوام کے لئے ٹھیک ہے۔

ان آٹھ قسموں میں تقریباً ہر قسم کی شادی آجاتی ہے، ذیل میں ان کی اجمالی کیفیت درج کی جاتی ہے۔

(۱) برہم بواہ:- وہ طریقۂ ازدواج ہے جو ہندوؤں میں عام طور پر رائج ہے یعنی لڑکی والے اپنی بیٹی کے لئے مناسب بر تلاش کر لیتے ہیں اور

تمام باتیں طے ہونے کے بعد دھوم دھام سے شادی کر دیتے ہیں۔

(۲) دیو بواہ:۔ اس میں لڑکی کی شادی کسی دیوتا سے کر دی جاتی ہے اور وہ لڑکی اسی دیوتا کے مندر میں زندگی کے دن گزارتی ہے ایسی لڑکیوں کو دیوداسیاں یا مُرلیاں کہتے ہیں۔ یورپ میں بھی کلیسا کی کنواریاں (Nuns) ہوتی ہیں جو فرضی طور پر یسوع کی بیویاں متصور ہوتی ہیں اور تمام عمر پاک دامنی کے ساتھ بسر کرتی ہیں۔

(۳) ارشا بواہ:۔ یہ در حقیقت رشیوں کا طریقۂ ازدواج ہے۔ ان مرتاض اور تارک الدنیا لوگوں کے پاس لینے دینے کو تو کچھ ہوتا نہیں۔ لوگ ان کو مقدس و بزرگ سمجھ کر لڑکی حوالہ کر دیتے ہیں۔ اُسے اصطلاح میں "کنیادان" کہتے ہیں۔

(۴) پرجاپتی بواہ:۔ اس میں لڑکا اور لڑکی خاص اہتمام کے ساتھ شادی کرتے ہیں، ذات برادری کا کافی خیال رکھا جاتا ہے۔ لڑکی والے برادری کو کھانا کھلا کر اور لڑکی کو حتی الامکان معقول جہیز دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔

(۵) اسُر بواہ:۔ ادنیٰ درجہ کا بیاہ ہے۔ کیونکہ اس میں کسی قدر خرید و فروخت کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے ذلیل سمجھا گیا ہے۔

(۶) گندھرب بواہ:۔ مرد و عورت اگر بالغ اور آزاد ہوں اور بطیب خاطر دونوں ایک دوسرے کو قبول کر لیں خواہ کوئی گواہ موجود ہو یا نہ ہو تو اسے گندھرب بواہ کہتے ہیں۔ کالی داس کی مشہور و معروف ناٹک میں شکنتلا اور راجہ دشینت کی شادی جنگل میں اسی طرح ہوئی تھی۔

(۷) راکشش بواہ:۔ اگر کسی شخص کی لڑکی کو جبراً بھگا لیا جائے اور پھر اس سے

شادی کی جائے تو اسے راکشش بواہ کہتے ہیں۔ اس قسم کی شادیوں کا نتیجہ عموماً خراب نکلتا ہے اور فریقین میں کشت و خون تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس قسم کی شادیوں نے اکثر سلطنتوں کو تباہ و برباد کردیا ہے مثلاً راجہ پرتھوی راج والی دہلی واجمیر نے راجہ جے چند والی قنوج کی لڑکی کو عین "سوامبر" سے بھگایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں سلطنتیں غارت ہوگئیں حسبِ روایت رامائن راون نے بھی سیتاجی کو لیجاکر اپنی سلطنت کو برباد کردیا۔ اسی طرح بائبل کی یہ روایت ہے جس میں اہیر حوی تمور کے لڑکے سکم نے یعقوبؑ کی بیٹی دینہ کو بھگایا اور اس کے باعث اس کی تمام قوم قتل ہوئی۔

(۸) پیشاچ بواہ: - یعنی کسی لڑکی کو شراب پلاکر، یا داروئے بیہوشی دے کر یا بحالتِ خواب اس سے اختلاط کیا جائے۔ اس تعلق کو دھرم شاستر میں نہایت ذلیل خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں عورت مُردہ کی طرح بےحس ہوتی ہے۔ اس قسم کا تعلق زناشوئی ہر ملک و قوم کی سوسائٹی میں مذموم خیال کیا جاتا ہے اور قانوناً جرم ہے۔ بائبل میں بھی اس قسم کے قصے موجود ہیں۔

شادی کی اور صورتیں ارتقائے تمدن کے ساتھ جب انسان نے عورت کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا تو لڑکیوں کو ایک حد تک انتخاب شوہر کی آزادی بھی دی جانے لگی۔

ہندوستان کے راجاؤں میں یہ دستور تھا کہ جب ان کی بیٹی جوان ہوجاتی تھی تو وہ کسی خاص شوہر کی تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ برہمنوں اور پنڈتوں سے مہورت لے کر شادی کے لئے ایک خاص دن مقرر کردیتے تھے، کچھ زمانہ قبل اس تاریخ کی اطلاع ملک کے تمام راجاؤں اور راجکماروں کو دیدی جاتی تھی۔ تاریخ

مقررہ پر جب تمام مہمان جمع ہو جاتے تھے تو ایک جلسہ کیا جاتا تھا جہاں کوئی شرط پیش کی جاتی تھی اور جو شریف النسب شخص اس شرط کو پورا کر دیتا تھا اُسی کے گلے میں وہ لڑکی اپنی رضامندی کا ہار ڈال دیتی تھی۔ اس تقریب کو "سوامبر" یعنی (جلسۂ انتخاب شوہر) کہتے تھے۔

ہندوستان میں سوامبر کے تین واقعات خالص تاریخی حیثیت رکھتے ہیں:۔

(۱) مہابھارت کا سوامبر جو راجہ دُروپد نے اپنی بیٹی دروپدی کے لئے منعقد کیا تھا اور جس میں تیراندازی کی نہایت مشکل شرط رکھی گئی تھی۔ اس شرط کو حاضرین جلسہ میں سے کوئی پورا نہ کر سکا لیکن ارجن نے جو اس وقت فقیروں کے بھیس میں تھا اس شرط کو پورا کر کے دلھن کو جیت لیا تھا۔

(۲) رامائن کا سوامبر جس میں راجہ جنک نے اپنی بیٹی جانکی عرف سیتاجی کی شادی کے لئے ہمعصر راجاؤں اور شہزادوں کو مدعو کیا تھا اس میں شرط یہ رکھی گئی تھی کہ جو شخص شِو جی کی دھنش (کمان) کو زہ کر دے گا وہی لڑکی کا شوہر منتخب ہو گا۔ دیگر امراء ادائے شرط سے قاصر رہے لیکن رام چندر جی نے اپنی قوت بازو سے اُس کمان کو نہ صرف زہ کیا بلکہ توڑ دیا اور جانکی جی کو جیت لائے۔

(۳) تیسرا تاریخی سوامبر راجہ جے چند والی قنوج کی بیٹی کا ہے جس میں لڑکی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جلسہ میں شریک ہونے والے امراء میں سے جس کو چاہے منتخب کر کے اس کے گلے میں ہار ڈال دے۔ اس جلسہ میں والی قنوج نے اپنے حریف راجہ پرتھوی راج والی دہلی و اجمیر کو مدعو نہیں کیا تھا جو منتخب جانباز راجپوتوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ پوشیدہ طور پر جلسہ میں پہنچا اور لڑکی کو اُڑا لایا۔

اسی قسم کا رواج ایران قدیم میں بھی تھا۔ بڑے بڑے گھرانوں میں جب لڑکیاں جوان ہو جاتی تھیں تو ہم کفو نوجوانوں کو مدعو کر کے لڑکی کو انتخاب شوہر کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس طریق کار کو اصطلاح میں "جشن شوہر گیراں" کہتے تھے۔ ان واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج صرف ان اقوام میں پایا جاتا تھا جنھیں یورپ کی اصطلاح میں انڈو ایرانین (Indo Iranian) یعنی "ہندی ایرانی آریا" کہتے ہیں۔

بعض اقوام میں عارضی شادی کا بھی رواج ہے یعنی زن و مرد ایک مدت کے لئے عہد و پیمان کر لیتے ہیں۔ اگر اس دوران میں عورت موافق مزاج کے ثابت ہوئی تو مستقل نکاح کر لیا جاتا ہے ورنہ فریقین میں مفارقت ہو جاتی ہے۔

داشتہ عورتیں | جزائر غرب الہند کے جزیرہ ہائٹی (Hayti) میں دو قسم کی بیویاں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا نکاح باضابطہ قوانین کلیسا کے تحت ہوتا ہے۔ اور دوسری وہ جو بغیر رشتۂ ازدواج محض رضامندی کے اصول پر گھروں میں ڈال لی جاتی ہیں۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر کا نکاح مقررہ طریقہ پر ہوتا ہے لیکن موخر الذکر کے لئے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں ہے۔ نکاح تو صرف عدالت ہی میں منسوخ ہو سکتا ہے لیکن دوسری قسم کا تعلق صرف ۲۴ گھنٹے کی نوٹس پر ختم ہو سکتا ہے۔

وہاں یہ دونوں تعلقات احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ دوسرے طریقہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور اس طرح جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کے وہی حقوق ہیں جو منکوحہ کی اولاد کے ہوتے ہیں۔

یورپ میں بھی یہ رواج بکثرت پایا جاتا تھا۔ قدیم یونان اور قدیم روم میں ایسی عورت کو ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا اور منکوحہ بیوی بھی اس کو گوارا کر لیتی تھی۔

ڈیو فورڈ (Deuford) نے لکھا ہے کہ شہنشاہ شارلیمن کے زمانہ میں لفظ Concubines (داشتہ یا حرم) معزز لفظ خیال کیا جاتا تھا اور ایسی عورتوں کا درجہ بیویوں کے برابر سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ اگر وہ کبھی فحش کی مرتکب ہوتیں تو انھیں وہی سزائیں دی جاتیں جو منکوحہ عورتوں کے لئے مقرر تھیں۔

ممالکِ مشرق میں حرموں اور کنیزوں کی طرف جس قدر توجہ کی گئی اس سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں۔

شادی کی انگوٹھی اگرچہ قدیم اہلِ روما میں عورتوں کی کافی عزت و وقعت کی جاتی تھی، لیکن قدیم جرمنوں نے جو فطرتاً نہایت جنگجو واقع ہوئے تھے بیوی کو کبھی گھر کی لونڈی سے زیادہ نہ سمجھا اور "خریداری عروس" ہی کے طریقہ کو وسعت دی اور اس طرح سارے یورپ میں "عروس فروشی" کا رواج عام طور پر پھیل گیا پہلے تو بطور بیعانہ کچھ نقد رقم وصول کر لی جاتی تھی۔ لیکن جب سوسائٹی اس بات کو معیوب خیال کرنے لگی تو بجائے رقم بیعانہ کے دلھن کو ایک بیش قیمت انگوٹھی پیش کی جانے لگی۔ اس کو جرمن اصطلاح میں "اڑھا" (Arrha) کہتے تھے جس کے معنی ہیں "شادی کا بیعانہ"۔

قرونِ وسطیٰ میں اس رسم کے ساتھ اور رسمیں شامل کر کے دلھن کو بالکل کنیز کی حیثیت دے دی گئی۔

مثلاً انگلستان میں دستور تھا کہ جب دولھا دلھن کے سامنے انگوٹھی

پیش کرے تو وہ بہن کر شوہر کے قدموں میں گر جائے۔ زیجسس میں بھی دلھن اپنے شوہر کے پاؤں چوما کرتی تھی۔ پھر بعد کو اس رسم میں کچھ تبدیلی کر دی گئی یعنی منگنی کے وقت دلھن، قصداً انگوٹھی کو ہاتھ سے نکال کر شوہر کے قدموں پر گرا دیتی اور اس کو اٹھانے کے بہانے سے شوہر کے پاؤں چھو لیتی۔

مشرقی اقوام کی عورتیں جس قدر زیور پہنتی ہیں وہ سب ان کے غلام ہونے کی نشانیاں ہیں۔ مثلاً ہاتھوں کے زیور (کڑے چوڑیاں وغیرہ) بجائے ہتکڑیوں کے ہیں اور پاؤں کے زیور بیڑیاں۔ گلے کے زیور میں ایک طوق بھی ہوتا ہے جو اپنا مفہوم خود ظاہر کر رہا ہے۔ ناک کی نتھ (اونٹ کی نکیل کی طرح) قابو میں رکھنے کی علامت ہے اور کان کے زیور حلقہ بگوشی کو ظاہر کرتے ہیں۔

آزمائشی شادیاں

یورپ میں بغیر نکاح کے جو تعلقات جنسی قائم ہو جاتے ہیں انھیں "آزمائشی شادیاں" (Trial Marriages) کہتے ہیں۔ ان تعلقات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نکاح سے قبل ہی آئندہ ازدواجی زندگی کے خوش گوار ہونے کا یقین کر لیا جائے۔

اس قسم کی آزمائشی شادیاں "کورٹ شپ" (Courtship) کا عمومی نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ اول اول باہم تعارف ہوتا ہے۔ پھر شناسائی ہوتی ہے اور یہی شناسائی رفتہ رفتہ یکجائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ طریقہ قلطی (Celtic) اور طوطانی (Teutonic) ممالک میں عام طور پر رائج ہے اور مختلف علاقوں میں اس کے لئے مختلف اصطلاحیں رائج ہیں۔ مثلاً "Bundling" "Probenachte" "Fensterln"

"Sitting up"-"Hand Fosting"-"Kilt"-"Gang" "Courting on the bed" وغیرہ وغیرہ۔

ویلز میں کسی وقت یہ رواج عام تھا۔ انگلستان کے اکثر اضلاع میں جیسے چیشائر (Cheshire) وغیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ اٹھارویں صدی میں آئرلینڈ کے اندر بھی یہ رواج موجود تھا۔ نیوانگلینڈ میں اسے (Tarrying) ٹھہرنا کہتے ہیں۔ ولندیز (Holland) میں اس کے لئے اصطلاح Questong (تلاش کرنا) موجود ہے۔ اور ملک ناروے میں اسے (Night Turning) کہتے ہیں۔

اگر فریقین کے درمیان یہ آزمائشی شادی کامیاب ثابت ہوتی ہے تو باقاعدہ نکاح کرلیا جاتا ہے۔ ورنہ اس آزمائش کے لئے دوسرا میدان تلاش کرلیا جاتا ہے۔

اگر اس قسم کے تعلقات کے دوران میں کوئی بچہ ہوجاتا ہے تو سوسائٹی میں اس عورت کو ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ انگلستان کے علاقہ اسٹیفورڈشائر (Staffordshire) میں تو یہ رواج بہت عام ہے اور وہاں مشہور ہے "کہ ایسی عورتیں نہایت اچھی رفیق، مذرہ جفاکش بیویاں اور مائیں ثابت ہوتی ہیں"۔

پورٹ لینڈ (Portland) میں جہاں کا سیمنٹ مشہور ہے اب تک یہ رواج چلا آتا ہے کہ عورت بغیر نکاح کے مرد کے ساتھ رہنا شروع کردیتی ہے اور جب استقرار حمل ہوجاتا ہے تو دونوں نکاح کرلیتے ہیں ورنہ فریقین کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں۔

آزمائشی شادیوں کا رواج صرف دیہاتی علاقوں تک محدود نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے شہروں میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً ڈیسپرے (Disperes) نے اپنی کتاب پیرس کی فحاشی (La Prootilntina Paris) میں صفحہ ۲۳۷ میں لکھا ہے کہ پیرس میں نوے فیصدی شادیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں فریقین کے مابین قبل از نکاح تعلقات پیدا ہو چکتے ہیں ممکن ہے ان اعداد میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ پیرس میں پچاس فی صدی شادیاں ضرور اسی طرح ہوتی ہیں۔

طوطانی (Teutonic) ممالک میں قبل از نکاح، تعلق کا پیدا ہو جانا بہت قدیم چیز ہے۔ مثلاً سوئیڈن کے متعلق ایلن کی (Ellen Key) نے اپنی کتاب (Lebeund Eras) میں صفحہ ۱۲۳ پر لکھا ہے کہ اس ملک کی غالب آبادی اسی آزمائشی طریقہ و نکاح کو پسند کرتی ہے۔ اسی طرح روبین و دیسٹر گارڈ (Ruben d Waster Gaurd) نے ڈنمارک کی نسبت لکھا ہے کہ زن و مرد کے تعلقات قانونی صورت اختیار کرنے بھی نہیں پاتے کہ استقرارِ حمل[1] ہو جاتا ہے۔

برلن میں اگرچہ ایسے بچوں کی تعداد ۱۷ فی صدی ہے لیکن دیگر شہروں اور اضلاع میں ان کی تعداد اس سے بھی بہت زیادہ ہے۔

---

[1] قدیم مصریوں میں رشتۂ ازدواج بہت لچکدار ہوتا تھا چنانچہ وہ اس بات کی آزمائش کے لئے کہ عورت بانجھ یا مرد بے کار تو نہیں، چند روزہ ازدواجی تعلق پیدا کر لیا کرتے تھے لیکن اس وقت جو اقرار نامہ لکھا جاتا تھا اس میں پیدا ہونے والی اولاد کے لئے پورے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا

چند سال گزرے جرمنی کے دیہاتی علاقوں میں اخلاقِ عامہ کی تحقیقات کرنے کے لئے پادریوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی تھی جس نے اپنی رپورٹ دو ضخیم جلدوں میں شائع کی اور جرمنی کے "اخلاق جنسیہ" کے متعلق نہایت مفصل معلومات بہم پہنچائیں۔ اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہنوور میں عام رواج یہ ہے کہ عورت مرد میں قبل از نکاح تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں کا قول یہ ہے کہ جس طرح بغیر دیکھ بھال کے مال نہیں خریدا جا سکتا اسی طرح بغیر جانچ کئے ہوئے عورت سے نکاح بھی نہ کرنا چاہئے۔

یہی حال علاقہ سیکسنی (Sexony) کا ہے۔

اسٹٹن (Stattin) کے بارہ اضلاع میں شادی سے قبل تعلق پیدا کر لینا عام رواج ہے باقی اضلاع میں بھی سوسائٹی اس کو برا نہیں سمجھتی اور ڈینزگ (Dantzig) کے علاقوں میں نصف سے زیادہ نکاح ایسے ہی ہوتے ہیں۔

روس میں جس قدر جنسی آزادی حاصل ہے وہ سب کو بخوبی معلوم ہے مگر اطالیہ میں لڑکیوں کو ایسی آزادی حاصل نہیں ہے۔ نہ جوان لڑکیاں تنہا باہر جا سکتی ہیں نہ کوئی مرد ان سے تنہائی میں مل سکتا ہے۔

آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی نسبت آج سے تیس سال قبل یہ مشہور تھا کہ وہاں جو شخص نیا نیا جا کر آباد ہوتا ہے تو قدیم باشندوں کی بےحیائی اور بداخلاقی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے لیکن اب اس جنسی آزادی میں اور بھی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ پادری ایچ نارتھکوٹ (H. Northcote) نے

جو عرصہ تک جنوبی دنیا میں رہ چکے ہیں اپنی کتاب "مسیحیت اور مسائل جنسیہ" (Christianity & Sex Problem) میں تحریر فرماتے ہیں کہ آسٹریلیا کے مختلف حصص میں "بے نکاحی بیویوں" کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر کوغلان (Coghalans) جو آسٹریلیا کے متعلق سب سے بڑے مستند و معتبر محقق ہیں اپنی کتاب "نیو ساؤتھ ویلز" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"آسٹریلیا کے علاقہ نیو ساؤتھ ویلز میں چھ سال کے اندر اُنچاس ہزار چھ سو اکتالیس شادیاں درج رجسٹر ہوئیں جن میں تیرہ ہزار تین سو چھیاسٹھ دلھنیں ایسی تھیں جو حقیقتاً پہلے ہی شادی کے حکم میں داخل ہو چکی تھیں۔"

جزیرۂ جامیکا (Jamaica) میں اور بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ باقاعدہ رشتۂ ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ وہاں کی عورتوں کا تجربہ یہ ہے کہ بے نکاح کا شوہر بمقابلہ جائز اور قانونی شوہر کے زیادہ وفادار ثابت ہوتا ہے۔

پی۔ لونگسٹن (P. Livingstone) نے اپنی دلچسپ کتاب "سیاہ جامیکا" (Black Jamaica) میں لکھا ہے کہ "یہاں کے باشندے یہ کہتے ہیں کہ محبت، وفاداری اور اتفاق کے ساتھ رہنا ہی شادی ہے گو اُس پر کلیسہ کی مُہرِ ثبت نہ ہو۔"

یہی حال وینی زولا (Venezola) کا ہے لیکن آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی نسبت کرّ (Curr) نے لکھا ہے کہ:۔

"یورپین اقوام کے آنے سے پہلے آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں ۱۹ برس عمر کی ایک بھی لڑکی ایسی نہ ہوتی تھی جس کا باقاعدہ شوہر موجود نہ ہو لیکن اب شادیاں زیادہ عمر میں کی جاتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ تقاضائے فطرت پورا کرنیکے لئے ناجائز طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔"

وحشی اقوام میں نکاح کی صورتیں اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام میں صرف ایک شادی کا رواج کبھی نہیں پایا گیا۔ ان کے یہاں اشتراکیت کی دونوں صورتیں پائی جاتی تھیں یعنی جس طرح ایک عورت مختلف مردوں کی بیوی بن سکتی تھی اسی طرح ایک مرد مختلف عورتوں کا شوہر ہو سکتا تھا۔

چنانچہ شمالی ہند کے بعض کوہستانی علاقوں میں اب بھی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ اگر کسی گھر میں کئی بھائی ہوتے ہیں تو شادی صرف بڑے بھائی کی ہوتی ہے لیکن عملاً تمام بھائی اس عورت سے متمتع ہوتے ہیں۔ پہلی اولاد بڑے بھائی کی، دوسری دوسرے بھائی کی، اور تیسری تیسرے بھائی کی شمار ہوتی ہے ان میں باہم کوئی جھگڑا ہوتا ہے نہ جذبۂ رقابت۔

بھوٹان اور تبت کے بعض علاقوں میں بھی یہی دستور ہے کہ ایک عورت کئی کئی شوہر رکھتی ہے اور سب کی اطاعت کرتی ہے۔ مرد جو کچھ کما کر لاتے ہیں عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور اولاد پر بھی عورت ہی کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

دارجلنگ اور دیگر کوہستانی علاقوں میں بھی یہی رواج اب تک پایا جاتا ہے اور قدیم یورپ کی تاریخ میں اسی طرز عمل کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ بلکہ جرمنی میں تو ایک دستور بہت زیادہ عجیب و غریب یہ بھی تھا کہ اگر شوہر کسی سبب سے افزائش نسل کا

اہل نہیں رہتا تھا تو بیوی اس کمی کو دوسرے طریقہ سے بھی پورا کر سکتی تھی۔

طلاق و خلع شادی اسی وقت صحیح معنی میں شادی رہتی ہے جب تک میاں بیوی دونوں میں اتفاق قائم رہے اور جب نا اتفاقی پیدا ہو تو دونوں کو علیحدہ ہو جانا چاہیئے اور اس علیحدگی کو طلاق کہتے ہیں۔ اگر شوہر بیوی سے ناخوش ہو اور موافقت کی صورت باقی نہ رہے تو مرد بیوی کو علیحدہ کر دیتا ہے۔ یہ طلاق ہے۔ اگر مرد آوارہ ہو اور اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہو اور بیوی مجبور ہو کر مفارقت اختیار کرے تو اسے اصطلاح میں خلع کہتے ہیں۔

ہندو دھرم شاستر میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہیں رکھا گیا۔ میاں بیوی کے تعلقات تا زیست قائم رہتے ہیں، پہلے مسیحی اقوام میں بھی طلاق و خلع کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ میاں بیوی کے تعلقات تا زیست ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ طلاق کا قاعدہ بنایا گیا۔ مگر یہ قاعدہ صرف اس قدر اثر رکھتا تھا کہ میاں و بیوی دونوں میں مفارقت کرائے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی تا حین حیات دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اور چونکہ اس کے نتائج اور بھی زیادہ خراب نکلے اس لئے رفتہ رفتہ اب تقریباً عام اقوام و ممالک میں طلاق و خلع دونوں کا قانون بن گیا ہے۔

طلاق قدیم قدیم روم میں دو قسم کی شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ عارضی اور مستقل، عارضی شادی کی مدت صرف ایک سال ہوتی تھی جسے اصطلاح میں (Marriage by uses) کہتے تھے۔ اس میں مرد و عورت بغیر کسی تقریب یا رسم کے تعلقات پیدا کر لیتے تھے۔ اور یہ تعلقات سال بھر تک

رہتے تھے۔ اگر اس دوران میں مرد و عورت کی زندگی لطف و محبت کے ساتھ بسر ہوئی تو وہ بعد انقضائے میعاد مستقل شادی کر لیتے تھے۔ ورنہ بغیر کسی عدالت یا پنچایت کی مداخلت کے فریقین میں خود بخود علٰحدگی ہو جاتی تھی۔

قدیم ویلز میں قدیم ویلز کی عورتوں کو شادی سے قبل و بعد بہت زیادہ آزادی حاصل ہوتی تھی۔ ریہائس و برائمور جونس (Rhys & Brymor Jones) نے لکھا ہے کہ "یہاں یہ دستور عام ہے کہ جب کبھی مرد یا عورت فسخ تعلقات کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود بخود فریقین کی رضامندی سے علٰحدہ ہو جاتے ہیں۔" یہی حال آئرلینڈ میں تھا اور تعلقات نکاح کا منقطع کر دینا بہت آسان تھا۔ جب عورت اپنی درخواست پر خلع حاصل کر لیتی تھی تو وہ اپنا تمام مال خواہ میکہ سے لائی ہو یا شوہر نے دیا ہو سب اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔

قدیم چین میں چین میں طریقۂ طلاق قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اگر میاں بیوی کے مزاج میں موافقت نہیں ہوتی اور دونوں علٰحدہ ہونا چاہتے ہیں تو باہمی رضامندی سے تعلقات منقطع کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہاں طلاق و خلع کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اگر بیوی غیر وفادار ثابت ہو یا فریقین میں سے کوئی کسی کو ضرر شدید پہنچائے تو طلاق لازمی ہو جاتی ہے۔

جاپان میں جاپان میں جدید قانون دیوانی کے مطابق شادی کی اطلاع رجسٹرار کو دیدی جاتی ہے۔ لیکن شادی ہمیشہ فریقین کی رضامندی اور والدین یا بزرگوں کی اجازت سے ہوتی ہے۔ شادی کے سلسلہ میں احباب و اعزہ کو بھی دعوت دی جاتی ہے لیکن قانون اس پر مجبور نہیں کرتا۔ ایسا کرنا

یا نہ کرنا فریقین کی خوشی پر منحصر ہے۔

طلاق کا قاعدہ بھی وہی ہے جو شادی کا ہے یعنی رجسٹرار کو نوٹس دیدیا جاتا ہے کہ نکاح فسخ کر دیا جائے۔لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ شوہر اور بیوی کی عمر پچیس سال سے زیادہ ہو۔اگر فریقین کی عمر اس سے کم ہے یا کہ فسخ نکاح کے لئے باہمی رضامندی حاصل نہیں ہو سکتی ہے تو اس کے لئے قانونی علیحدگی (Judicial Divorcy) کا قاعدہ موجود ہے۔قانونی طلاق مختلف اسباب کی بناء پر حاصل کی جا سکتی ہے۔

اسکیمو قوم میں علاقہ قطب شمالی کی اسکیمو (Eskimo) قوم میں معاشرتی وتمدنی لحاظ سے مرد و زن دونوں برابر ہیں۔شادی بیاہ میں قطعی آزادی ہے اور اسی طرح فریقین میں کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

فرانس میں فرانس میں جب قانونی طلاق ہوتی ہے تو عورت کو درجۂ مساوات دیا جاتا ہے سخت تکلیف کی صورت میں طلاق بآسانی حاصل ہو جاتی ہے (لیکن ناموافقت کا عذر بہت کم سنا جاتا ہے) علاوہ ازیں جج کو اختیار ہے کہ فریقین کو علیحدگی میں لے جاکر سمجھائے اور اگر فریقین رضامند نہ ہوں تو عدالت میں کھلم کھلا سماعت مقدمہ کئے بغیر طلاق کی ڈگری دیدے لیکن اب فرانس میں زیادہ تر رجحان یہ ہو رہا ہے کہ باہمی رضامندی سے طلاق ہو جایا کرے اور عدالت میں رسوائی نہ ہو۔

جرمنی میں ریاست پرشیا میں سنہ ۱۹۰۰ء سے بیشتر طلاق کے متعلق یہ قاعدہ جاری تھا کہ فریقین خود خاموشی سے قطع تعلق کر لیا کرتے تھے لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں

جدید قانون جاری ہوا۔ اس کی رُو سے اگر شوہر یا بیوی ایک دوسرے کو چھوڑ کر بھاگ جائے یا فریقین میں سے کوئی پاگل ہو جائے تو طلاق بآسانی ملجاتی ہے لیکن دوسری صورتوں میں بہت مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں۔

رُوس میں ۱۹۰۷ء سے پہلے رُوس میں طلاق کا حاصل کرنا سخت دشوار تھا، لیکن بعد ازاں فریقین کے لئے یہ سہولت کر دی گئی کہ اگر نباہ نہ ہو سکے تو دونوں باہمی رضامندی سے علٰحدہ ہو جائیں۔ اگر سال بھر علٰحدہ رہ کر وہ پھر رضامند ہو جائیں تو دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن جب سے رُوس میں بالشویت قائم ہوئی ہے شادی اور علٰحدگی دونوں بہت آسان ہو گئی ہیں۔

انگلستان میں ازدواج وطلاق کے مسئلہ میں انگلستان کا قانون فرانس اور امریکہ سے بہت گرا ہوا ہے ۱۸۵۷ء میں ایک قانون پاس ہوا تھا جس میں زن و مرد کو برابر کا درجہ نہیں دیا گیا تھا یعنی عورت اگر غیر وفادار ثابت ہو تو شوہر طلاق حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن اگر شوہر اسی جرم کا مرتکب ہو تو بیوی طلاق حاصل نہ کر سکتی تھی۔ عورت اُسی صورت میں طلاق حاصل کر سکتی تھی کہ شوہر اُس پر ظلم و ستم کرے یا اسے چھوڑ کر بھاگ جائے۔ ابتدا میں لفظ "ظلم و ستم" کا مفہوم محض ضرر جسمانی تک محدود تھا۔ لیکن بعد میں اُسے وسعت دیدی گئی، یعنی اب اس میں ایسی باتیں بھی شامل ہیں جن سے بیوی کی طبیعت کو رنج یا صدمہ پہنچے، علاوہ ازیں شوہر کی سرد مہری اور غفلت بھی "ظلم" میں داخل سمجھی جاتی ہے۔

امریکہ میں امریکہ میں خواہ مدعی خاوند ہو یا بیوی، بدسلوکی کا عذر فسخ نکاح

کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ جن باتوں کو "بدسلوکی یا خلافِ انسانیت" کہا جاتا ہے وہ نہایت ہی معمولی باتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر بیوی شوہر کے کوٹ یا کسی اور کپڑے میں بٹن نہ ٹانکے تو یہ بھی بدسلوکی سمجھی جائے گی یا میاں اگر اپنے پاؤں کے ناخن نہ تراشے تو اس عذر کو بھی کافی سمجھا جائے گا اور طلاق ہو جائے گی۔ ایک بار کسی عورت نے دعویٰ کیا کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے اُس وقت سے اب تک میرا شوہر کبھی گاڑی میں بٹھا کر سیر کو نہیں لے گیا۔ چنانچہ اس کا یہ فعل خلافِ انسانیت قرار دیا گیا اور طلاق کی ڈگری دیدی گئی۔

دیگر ممالک سوئیٹزرلینڈ میں اگر میاں بیوی کے درمیان ناموافقت ہو جائے تو ۲ سال کے لئے طلاق حاصل کی جاسکتی ہے۔

ناروے میں بھی قانون طلاق بہت آسان ہے۔

رومانیہ میں بھی باہمی رضامندی کے ساتھ علیحدگی ہو سکتی ہے بشرطیکہ ماں باپ اپنے مال کا نصف حصہ بچوں کو دیدیں۔

مذہبی فحاشیاں

ہیروڈوٹس کے چند بیانات بہ ظاہر یہ عنوان نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا، کیونکہ ''مذہب'' جس کا مقصود ہی یہ ہے کہ دُنیا سے ''فحاشی'' کو فنا کر دے وہ کیوں کر اس کا معاون ہو سکتا ہے، لیکن اگر آپ مذاہبِ عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے اکثر مذاہب نے نہ صرف فحاشی کو گوارا کیا بلکہ اس کے رواج و اشاعت میں سبب اولین ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلے چند بیانات ہیروڈوٹس (مشہور مورّخ) کے سُن لیجئے۔

جب ہیروڈوٹس لیڈیا (Lydia) کی سیاحت کرنے گیا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں شاہ الیاتیس (Alyates) کا شاندار مقبرہ شہر ''ساردیس'' (Sardes) کے مختلف سوداگروں اور پیشہ وروں کے چندہ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ مورّخ مذکور لکھتا ہے کہ :-

''اس شاہی مقبرہ کی چوٹی پر پانچ سنگی مینار میرے زمانہ (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح) تک قائم تھے اور ان میناروں پر جو عبارتیں کندہ تھیں، اُن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مختلف طبقہ کے لوگوں نے اس کی تعمیر میں کس قدر روپیہ ادا کیا۔ چنانچہ اس تعمیر میں سب سے بڑا حصہ پیشہ ور عورتوں نے لیا

تھا۔ لیسڈیا میں عام لوگوں کی لڑکیاں سب کی سب پیشہ ور ہیں اور اپنے جہیز کے لئے روپیہ اسی طرح جمع کرتی ہیں"۔

عہدِ قدیم میں فحاشی کے خیال کو معیوب سمجھا جانا کیونکر رفتہ رفتہ کم ہوا؟۔ اس کے متعلق ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ:۔

"اوّل اوّل مصریوں میں اس کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا کہ وہ مقدس مقامات میں عورتوں سے بات چیت کریں۔ چنانچہ عورت سے بات کرنے کے بعد جب تک وہ غسل نہ کر لیتے تھے اُس وقت تک مندر میں ہرگز داخل نہ ہوتے تھے۔ لیکن مصریوں اور یونانیوں کے علاوہ دُنیا کی تقریباً تمام قومیں اس بارے میں دوسرے نظریہ کی پابند تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جب مندروں اور دیگر مقدس مکانوں میں مختلف قسم کے جانور باہمدگر ملتفت ہوتے ہیں اور دیوتا اس کو گوارا کر لیتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ چڑیوں اور جانوروں کی طرح عورتوں اور مردوں کا اختلاط گوارا نہ ہو۔ چنانچہ یہ عمل رفتہ رفتہ مذہبی ادارہ میں داخل ہو گیا"۔

ہم اس جگہ مورخ ہیروڈوٹس کی ایک اور عبارت نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"بابل والوں میں ایک نہایت ہی شرمناک رواج یہ ہے کہ ہر عورت جو اس ملک میں پیدا ہو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ آفرودیتہ (Afhrodete) دیوی کے مندر میں جا کر بیٹھے اور آزادانہ مردوں سے ملے، چنانچہ اُس مندر میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد

ایسی نظر آتی ہیں جو اپنی چوٹیوں میں پھول گوندھے ہوئے بیٹھی رہتی ہیں۔ غیر مرد
ان کو دیکھتے ہوئے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں اور جس پر نظر انتخاب پڑتی
ہے ٹھہر جاتے ہیں۔ جو عورت ایک مرتبہ بیٹھ جاتی ہے پھر اسے اس وقت
تک اُٹھ کر جانے کی اجازت نہیں ملتی جب تک کوئی غیر محرم اُس کی گود میں
چاندی کا سکّہ نہ پھینک دے۔ جب مرد چاندی کا سکّہ گود میں ڈال دیتا ہے
تو وہ اپنے منہ سے یہ الفاظ کہتا ہے کہ: "ملیتا (Mylitta) دیوی
تیرا بھلا کرے۔" اور عورت اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں
ہوتی کہ وہ نقرئی سکّہ کتنا بڑا ہے۔ لیکن جب وہ گود میں پھینک دیا جاتا ہے تو
اس کے لینے سے انکار کرنا قانوناً جرم ہے۔ کیونکہ وہ سکّہ متبرک ہو جاتا ہے۔ جو
عورتیں حسین ہوتی ہیں وہ تو بہت جلد مخلصی حاصل کر لیتی ہیں لیکن جو بدصورت
ہوتی ہیں ان کو زیادہ زمانہ صرف کرنا پڑتا ہے اور تین تین چار چار دن تک
پڑی رہتی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی ایک رسم جزیرۂ قبرص کے بعض مقامات
میں بھی پائی جاتی ہے۔"

قدیم زمانہ کے دیوتاؤں میں کمتر ایسے ہیں جن کو خواہش نفسانی سے مبرّا کہا جا سکے۔ اسی لئے بہت سے مذہبی تہوار حد درجہ بدمستیوں کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ چنانچہ یونانیوں کے دیوتا دیونسوس (Deonosus) اور اہل روم کے دیوتا باخوس (Bachos) اس باب میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

بائبل کی بہت سی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک فلسطین کے غیر عبرانی باشندے مذہب کی آڑ میں کافی داد بدمستی دیا کرتے تھے اور یرمیاہ اور دیگر

انبیاء بنی اسرائیل نے ان رسموں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور ہیرو ڈوٹس کے
نزدیک بھی زن و مرد کے تعلقات ناپاک سمجھے جاتے تھے۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے
ہیں کہ قدیم یونان میں "مذہبی فحاشی" بکثرت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ابتدائے
اپریل و مئی میں فلوریلیا (Floralia) دیوی کے نام سے جو میلہ آٹھ روز
تک ہوا کرتا تھا اُس کا مقصود ہی عیش پرستی تھا اور اس موقع پر رومی کسبیاں
سب کے سامنے برہنہ ہو کر نہایت ہیجان انگیز ناچ ناچا کرتی تھیں۔

مذہب میں رواج فحاشی کے اسباب انسان کی ارتقائی حالتوں پر غور
کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عہد تمدن سے قبل انسان تین حالتوں
سے گزر چکا ہے، سب سے پہلی وہ جب صرف شکار پر اس کی زندگی کا انحصار
تھا، دوسری وہ جب اس نے چوپانی اختیار کی اور تیسری فلاحت و زراعت۔
اولین دور میں جب صرف شکار اس کا مشغلہ تھا، افزائش نسل کا مسئلہ اس کے
نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جس قدر کم شکاری ہوں گے،
اُسی قدر شکار زیادہ ملے گا اور اسی لئے تعلق جنسی کی کوئی اہمیت اس کے نزدیک
نہ تھی لیکن بعد کو جب اُس نے دیکھا کہ بعض اوقات کئی دن شکار نہیں ملتا تو اُس نے
جانوروں کے بچے پکڑ کر پالنا شروع کئے اور اس طرح وہ بتدریج چوپانی حالت
میں آ گیا، پھر چونکہ چوپانی حالت میں مویشیوں کی نگہداشت اور ان کو ایک
چراگاہ سے دوسری چراگاہ تک لے جانے کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے اُسے
اپنا خاندان بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور سب سے پہلے تعلق جنسی کی
اہمیت اس پر اس طرح واضح ہوئی۔ جب انسان چوپانی حالت سے گزر کر

زراعت کی طرف متوجہ ہوا تو اُسے اور زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی اور
اس نے محسوس کیا کہ جب تک خاندان میں بہت سے آدمی نہ ہوں اُس
وقت تک چوپانی اور کسانی کے کام اچھی طرح نہیں چل سکتے اس لئے
انسان نے افزائش نسل کی طرف پوری توجہ کی اور اس کو ایک مذہبی فریضہ
کی صورت دیدی کیونکہ دُنیوی باتوں کے مقابلہ میں انسان پر مذہبی باتوں
کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور اس طرح بچے پیدا کرنا اور تعلقات جنسی کو وسیع
کرنا گویا ہر مرد کا فرض قرار پایا اور اسی کے ساتھ تعدد ازدواج یا ایک ہی وقت
میں متعدد بیویاں رکھنے کا رواج پیدا ہوا اس امر کا ثبوت کہ جب تک انسان
شکاری حالت میں رہا اس کے مذہب میں سوائے پرستش ارواح کے اعضائے
جنسی کی پرستش کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ ان اقوام کے مطالعہ سے مل سکتا
ہے جو ہنوز ابتدائی شکاری حالت میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا
کی بعض قوموں، (دواہ یاہگان، اور تسمانی) کو دیکھئے کہ وہ ابھی تک
بالکل عہدِ عتیق کی شکاری حالت میں ہیں اور فحاشی کا کوئی شائبہ ان کے
مراسم مذہبی میں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ان کا مذہب صرف رُوح کی
پرستش ہے۔

یہ لوگ تعلقات جنسی کے مسئلہ میں اس قدر ناواقف ہیں کہ انھیں یہ
بھی نہیں معلوم کہ اولاد کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا عقیدہ
یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو عورت کے پیٹ میں کوئی رُوح داخل
ہو جاتی ہے، چنانچہ جب یورپین قومیں آسٹریلیا میں داخل ہوئیں اور انھوں نے

ان لوگوں کو بچہ پیدا ہونے کا اصلی سبب بتایا تو یہ لوگ بہت حیران ہوئے۔

الغرض یہ امر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک انسان اپنے ابتدائی "دور صید و شکار" میں رہا، تعلقات جنسی کی طرف سے وہ بہت بے پروا تھا، لیکن جب اس نے چوپانی اور فلاحی شروع کی تو سب سے پہلے اس نے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ ارتباط زن و مرد تھا اور اس لئے اس دور کے تمام مذاہب میں آپ کو مذہبی فحاشی کثرت سے نظر آئے گی۔

افریقہ میں مذہبی فحاشی کے آثار

سر آر برٹن Sir R. Burton سرزمین داہومی (Dahomi) کی نسبت تحریر کرتے ہیں کہ :-

"وہاں ڈاسے لے کر دارالحکومت تک کوئی راستہ ایسا نہیں ہے، جہاں اعضاء جنسی کی علامات نظر نہ آئیں۔ یوں تو عام طور پر زیادہ تر صرف اعضاء جنسی ہی پتھروں کی صورت میں نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی کسی مشہور دیوتا کے عریاں بت کے ساتھ بھی جنسی عضو کو دکھاتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا لگبا ہے جو جذبات شہوانی سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص کو احتلام ہوتا ہے تو وہ اسی دیوتا سے منسوب کرتا ہے اور صبح ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا ہے اور نذر چڑھاتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ رات کو خواب میں کسی کا بصورت مرد یا عورت دکھائی دینا، گویا خود لگبا دیوتا کا نظر آنا ہے۔ اس دیوتا کا بت سرخ مٹی کا اس طرح بنایا جاتا ہے گویا وہ اکڑوں بیٹھا ہوا اپنے آپ کو برہنہ دیکھ رہا ہے۔ اس قسم کے

بُت تقریباً ہر مکان کے سامنے ایک چھوٹے سے چھپّر یا سائبان کے نیچے بنائے جاتے ہیں۔

بعض سوڈانی قبائل میں عشق ومحبت کی دیوی ہوتی ہے جو عموماً ایک حاملہ عورت کی طرح بنائی جاتی ہے اور اُس کا مجسمہ بہت طویل اور عضو جنسی بہت بڑا بنایا جاتا ہے۔ الغرض ان ممالک میں اعضاءِ جنسی کی پرستش وسیع پیمانہ پر موجود ہے۔

ایک سوڈانی قوم ہے جس کا نام یوروبا ہے، ان کے یہاں اس دیوی کا بُت اس طرح بنایا جاتا ہے گویا ایک عورت بیٹھی ہوئی اپنے بچّہ کو گود میں لئے دودھ پلا رہی ہے۔ اُس دیوی کے ساتھ ایک دیوتا بھی ہوتا ہے اور مندر کی دیواروں پر دونوں کے اعضاءِ جنسی بحالتِ اتصال دکھائے جاتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کا کام یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ زن و مرد دونوں کے دلوں میں عشق ومحبت پیدا کرتے ہیں، بانجھ عورتوں کو بارآور کرتے ہیں اور وضع حمل کے وقت تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ بعض مندروں میں جہاں اِس قسم کی پوجا ہوتی ہے، عورتیں بھی ہوتی ہیں، جو خاص تہواروں اور میلوں کے وقت بالکل آزاد ہوتی ہیں اور ان عورتوں میں جو اُدیا شیاں ہوتی ہیں انھیں مذہبی حیثیت دی جاتی ہے۔

مغربی افریقہ کے اُس حصّہ میں جسے (Slave Coast) یا (ساحل غلاماں) کہتے ہیں۔ افریقی لوگ مردانہ عضو جنسی کا نہایت شان وتجمل کے ساتھ بازاروں میں جلوس نکالتے ہیں اور اگر اتفاق سے

کوئی نوجوان لڑکی نظر آجاتی ہے تو اُس کے جسم سے مس کر کے بہت بیہودہ مذاق کرتے ہیں۔"

سرہنیری جانسٹن نے وادی دریائے کانگو کے لوگوں کا حال بیان کیا ہے کہ:-

"وہ اپنے لکڑی کے مندروں میں بہت سے زنانہ اور مردانہ بُت ایسے رکھتے ہیں جن کے اعضاءِ جنسی بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان بتوں پہ بھینٹ چڑھا کر ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ان لوگوں کے گھروں میں بھی یہ نشان چھتوں میں لٹکتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔"

ایک اور یورپین سیاح نے وادی کانگو کی باتیری قوم کا حال لکھا ہے کہ:-

"یہ لوگ مٹی سے اس قسم کے عضو بناتے ہیں اور ان کو چڑیوں کے پروں سے آراستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ زنانہ عضو بھی بناتے اور ان دونوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان پر مرغوں کی بھینٹ بھی چڑھائی جاتی ہے کیونکہ مرغ بہت قوی خواہش کا جانور سمجھا جاتا ہے۔"

ایک فرانسیسی فوجی افسر نے حال بیان کیا ہے کہ:-

"اس نے وادی کانگو میں ایک خاص تہوار دیکھا جس میں عضو جنسی کی خاص نمائش کی جاتی ہے، ایک بڑا برہنہ بُت بنایا جاتا ہے، اور اس کے عضو کو کمانیوں کے ذریعہ سے حرکت دی جاتی ہے۔ بعض مندروں میں ایسے دیوتاؤں کے پجاری مخنث ہوتے ہیں۔"

نائجیریا کی قوم ایگوئی میں ایجا نامی ایک دیوتا ہے جس کا نمو دار بالکل لگیا

کی طرح منایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ اس قسم کی بدمستیوں سے دیوتا خوش ہوتے ہیں اور فصلیں بھی اچھی پیدا ہوتی ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ لوگ ہر سال ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی کی قربانی کیا کرتے تھے۔ لیکن اب بجائے عورت کے مرغ کی قربانی ہونے لگی ہے۔

یورپ میں مذہبی فحاشی کے آثار یورپ کے غاروں سے جو زمانۂ قبل تاریخ کے بہت سے نقوش برآمد ہوتے ہیں ان میں ننگی تصویریں بھی ہیں جو سینگ یا ہڈی پر چقماق کی باریک نوک سے بنائی گئی ہیں۔ عورتوں کے بھی چھوٹے چھوٹے مجسمے ہیں جو عموماً بحالتِ نشست بنائی گئی ہیں۔ ان کی منبع و قطع افریقی ہے اور یہ تصاویر وادی کانگو کے بتوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ان مردانہ تصاویر اور نسائی مجسموں کے اعضاءِ تولید بہت بڑے بنائے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم یورپ میں بھی اس قسم کی پرستش کا رواج پایا جاتا تھا۔

انسان اول اول تمام حوادث و مناظر قدرت کی تشریح و توجیہ ارواح کے ذریعہ سے کرتا تھا۔ وہ چاند سورج، رعد و باراں وغیرہ سب کے لئے ایک ایک روح یا مؤکل مقرر کر دیتا تھا، لیکن کوئی روح بچہ پیدا کرنے والی عرصۂ دراز تک اس کے ذہن میں نہ آئی تھی۔ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا اور وہ اس واقعہ کی نسبت خیال آرائی کرتا تو سمجھتا کہ کسی انسان یا حیوان کی روح جسد خاکی سے علیحدہ ہو کر عورت کے اندر حلول کر گئی ہے جو از سر نو متشکل ہو کر مع جسم خاکی کے پیدا ہوئی ہے وہ بالکل ناواقف تھا کہ عورت سے بچہ پیدا ہونے میں

مرد کا بھی کوئی حصہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں منازل ارتقا کی ان پست حالتوں میں انسان زراعت نہیں کرتا تھا نہ مویشی پالتا تھا۔ اس کی تمام ضرورتیں قدرت خود بخود پوری کر دیتی تھی اور سامان خورد ونوش کی کسی وحشی انسان کو قطعی فکر نہیں تھی، علاوہ اس کے ایک بات یہ بھی تھی کہ چونکہ دنیا کی تمام پست قومیں گرم ممالک میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں موسموں کا تغیر و تبدل چنداں نمایاں نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے لئے فصل بہار جب کہ تمام عالم میں نیا جوش پیدا ہوتا ہے، کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ تیسرے یہ کہ ارتقا کی اس پست حالت میں نہ باہمی جنگ و جدال پایا جاتا تھا نہ کوئی قبائلی تنظیم تھی، اس لئے انسان اوّل عادتاً غیر جنگجو تھا اور اُسے زیادہ اولاد کی تمنا نہیں تھی۔

اس کے بعد جب انسان شکاری حالت سے گزر کر چوپانی یا کسانی حالت میں پہنچا تو اُسے زیادہ آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ تمنا پیدا ہوئی کہ بچے زیادہ ہوں۔ افزائش نسل کے دیوتاؤں کی پوجا اور ان کو خوش کرنے کے لئے مختلف قسم کی رسمیں ادا کرنا پڑیں کیونکہ قوم کا سردار تو جنگ کے لئے مرد چاہتا تھا اور مرد پیدا کرنے کے لئے عورتیں درکار تھیں اور یہیں سے اعضاءِ جنسی کی پُوجا کا آغاز ہوتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے دنیا میں مباشرت کو مذہبی حیثیت دی گئی۔

مباشرت کی مذہبی حیثیت پست اور جاہل اقوام کے نزدیک بہشت نام ہے کثرتِ ازواج، کثرتِ اولاد، فراوانی کاشت کا۔ پھر جب پیٹ بھر جاتا ہے تو انسان دوسری طرف راغب ہوتا ہے اور دوسری طرف راغب ہونیکا

نتیجہ اولاد ہے اور اولاد پیدا ہوتی ہے اعضاءِ جنسی کے اتصال باہمی سے۔ لیکن چونکہ بعض اوقات سالہا سال گزر جاتے تھے اور اولاد نہیں ہوتی تھی اس لئے ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کی ضرورت پڑی جن کا تعلق افزائش نسل سے تھا اور اس طرح اعضاءِ جنسی کی پوجا شروع ہوئی۔

جن ممالک میں مغل نسل کی اقوام آباد ہیں وہاں تو اس قسم کی پرستش کا پتہ نہیں ملتا، لیکن جاپان میں بیشک کسی زمانہ میں اس کا رواج تھا، چنانچہ انیسویں صدی میں جب جاپان کے دروازے دوسری اقوام کے لئے کھل گئے تو امریکن سیاح یہ بات دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ وہاں کھلم کھلا اعضاءِ جنسی کی نمائش و پرستش ہوتی ہے بخصوصیت کے ساتھ مذہب شنتو کے پرانے مندروں میں تو دیوتاؤں کے بت ایسے بنائے جاتے تھے جن میں مردانہ اعضاءِ جنسی پوری آمادگی کی حالت میں دکھائے جاتے تھے۔

ہندوستان کے جنوب اور جنوب مشرق میں جو جزائر ہیں ان میں بھی یہ پوجا عام ہے۔ مثلاً مجمع الجزائر بار بار میں سورج کا انسانی بت مع عضو جنسی کے بنایا جاتا ہے اور جب اس کا میلہ ہوتا ہے تو پورے عیش و نشاط سے کام لیا جاتا ہے علاوہ ازیں سماٹرا، جزائر نیاس کے باشندے اپنے مرے ہوئے اعزہ کی تصویریں اپنے مکانوں کی دیواروں پر کھینچتے ہیں جو بالکل برہنہ ہوتی ہیں اور تصویروں کی پوجا کرکے وہ افزائش نسل کی التجا کرتے ہیں۔

جزیرہ بونگی کی بعض قوموں میں یہ دستور ہے کہ تمام لڑکے اور بن بیاہے نوجوان، مخصوص مکانات میں سوتے ہیں جو اسی کام کے لئے علٰحدہ کر دیئے

جاتے ہیں اور جن کی دیواروں پر رنگی تصویریں مع مختلف آسنوں کے بحالت اتصال منقوش ہوتے ہیں۔ بظاہر یہ رواج بہت اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح گویا انھیں تجرد کی زندگی کا درس دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں وہ غیر فطری ذرائع سے اپنی خواہشیں پوری کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

جزیرہ سیلی بیز میں بھی اسی قسم کی پوجا بہت ہوتی تھی۔ یہاں عورتوں کے ایسے بُت بنائے جاتے تھے جن کے عضو جنسی کے ظاہر کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا جاتا تھا، مندروں کی دیواروں پر جو پتھر کے مردانہ بت بنائے جاتے تھے وہ بالکل عُریاں ہوتے تھے بعض مندروں میں مرد بحالت اتصال دکھائے جاتے تھے۔ اس جزیرہ کے جنوبی علاقہ میں ایک خاص دیوتا افزائش نسل کا کاریگنگ آلودہ ہے جو بالکل عُریاں بنایا جاتا ہے اور مندر میں نوجوان عورتوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی ہے بعض مندروں میں اس کے طلائی بُت بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی جزیرہ میں بعض قبائل ایسے بھی ہیں جو ایک خاص دیوتا کی پرستش کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں اس دیوتا کا بُت سات فٹ بلند اور بالکل عُریاں بنایا جاتا تھا جس کی پوجا نہایت فخر کے ساتھ کی جاتی تھی۔ جب ولندیزیوں نے مداخلت کی تو یہ بُت چھپا دیا گیا اور لوگ برسوں تک اس کی پوجا پوشیدہ طور پر کرتے رہے۔

جزیرہ جاوا میں اس قسم کی پوجا بکثرت ہوتی ہے۔ وہاں کے بعض حصوں میں یہ عام رواج ہے کہ جب دھان کے پودوں میں بالیاں نکلنے کو ہوتی ہیں۔

تو کھیت کا مالک اور اس کی بیوی دونوں ننگے ہو کر کھیت کا طواف کرتے ہیں اور اسی کھیت میں ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے ہیں۔ قدیم یورپ میں بھی عمدہ فصل پیدا کرنے کے لئے اس طریق عمل پر کاربند ہونا پڑتا تھا۔ ایک سیاح نے اہل جاوا کی اس پرستش کا عجیب و غریب حال تحریر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ:۔

''ایک مرتبہ ولندیزیوں کی ایک توپ جنگل میں رہ گئی۔ عوام میں یہ خیال پھیل گیا کہ یہ توپ یورپ کے کسی بُت کا ''عضو مخصوص'' ہے۔ اس خیال کے پھیلتے ہی مقامی پجاریوں نے عوام کو اس توپ کی پوجا کرنے کی ترغیب دی اور لوگ دور دور سے آکر اس پر چاول اور پھول چڑھانے لگے خصوصاً بانجھ عورتوں کا تو ہر وقت تانتا لگا رہتا تھا۔ یہ عورتیں زرق برق لباس پہن کر آتیں اور توپ پر گھوڑے کی طرح بیٹھ جاتیں بعض اوقات دو دو عورتیں ایک ہی وقت میں ایسا کرتیں۔ بالآخر عیسائیوں نے حکومت کو مجبور کیا کہ اس ''توپ دیوتا'' کو وہاں سے اُٹھا لیا جاوے۔''

برہما کے بالائی حصہ میں بھی رواج ہے کہ ہر سال فصل بہار کے وقت لوگ ایک بُت کا جلوس نکالتے ہیں جس کا ''عضو جنسی'' بہت نمایاں ہوتا ہے اور جلوس والے بہت فحش قسم کا مذاق کرتے ہوئے اور گالیاں گاتے ہوئے ساتھ چلتے ہیں۔

مسٹر جوزف میک کیب جو ایک مشہور امریکن مصنف سیاح ہیں لکھتے ہیں کہ:۔

''ڈکامان کے شمالی حصہ میں یوکیل کے مشہور کھنڈر واقع ہیں۔ چند ماہ

گزرے میں ان خرابوں کی سیر کرنے گیا جس وقت جنگل سے نکل کر صاف جگہ میں پہنچا تو وہاں ایک چھوٹا سا بلند ٹیلہ دیکھا جہاں کسی زمانہ میں مندر بنا ہوا تھا اُس کے دامن میں جہاں خوبصورت اور عالیشان عمارتوں کا خرابہ ہے میں نے دو پتھر دیکھے جو چار پانچ فٹ لمبے تھے۔ یہ بلحاظ شکل و شباہت نہایت مکمل مردانہ عضو تھے۔ کسی زمانہ میں یہ دونوں مندر کے دروازہ پر دونوں جانب نصب تھے اور یہ مندر ایک نہایت عظیم الشان اور متمدن شہر کے وسط میں واقع تھا گویا اس وقت یہاں بھی اس قسم کی پوجا ہوتی تھی۔"

امریکہ بھر میں جہاں جہاں اقوام مایا و پیرو کا تمدن پایا جاتا تھا وہاں کے مندروں کی خصوصیت انھیں اعضاء کی پرستش تھی جن کے نشانات کثرت سے پُرانے مندروں میں اب بھی ملتے ہیں۔

امریکہ کی "منڈان" قوم میں ایک سالانہ تہوار ہوتا تھا جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک شہوت انگیز بُت کا جلوس نکالتے تھے جو بالکل عریاں ہوتا تھا اور ایک چوبی عضو رکھتا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بُت کی جگہ ایک مرد لے لیتا تھا اور عورتوں کے پیچھے دوڑتا تھا جب وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی تھیں تو خوبصورت لڑکوں کی طرف راغب ہوتا تھا جب وہ یہ حرکت کرتا تھا تو عورتیں اُس کا پیچھا کرتی تھیں اور اُس کا چوبین عضو ایک عورت توڑ لیتی تھی اور اُسے ہاتھ میں لے کر ایک تقریر کرتی تھی کہ "وہ آج کے بعد سے حقیقی زندگی کی مالک ہے۔"

قدیم مصر میں بھی یہ پوجا نہایت شدومد سے جاری تھی، چنانچہ وہاں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "سیت" نے جو خداوندِ شر تھا اپنے بھائی "اوسیرز" خداوندِ خیر کو قتل کر کے اس کی لاش کے مختلف ٹکڑے مختلف مقامات میں علیحدہ علیحدہ دبا دیئے۔ "اوسیرز" کی بہن اور بیوی آئسین نے نہایت جانفشانی سے تلاش کر کے ٹکڑے نکال لیے لیکن عرصہ دراز تک باوجود تلاش بسیار عضوِ جنسی نہ ملا۔ مجبور ہو کر لکڑی کا ایک عضو بنا کر لاش کے ساتھ دفن کیا۔ اس کے بعد مصری عورتوں میں اس پوجا کا بیحد رواج ہو گیا اور رفتہ رفتہ تمام مصر اور افریقہ میں یہ رسم اس طرح پھیل گئی کہ مصر کے پجاریوں کو بھی یہ فحش رسم اپنے مذہب میں داخل کرنا پڑی۔ مشہور یونانی مورخ و سیاح ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ :-

"وہاں "اوسیرز" کا سالانہ تہوار نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا عورتیں باجے گاجے کے ساتھ اوسیرز کا بت لے کر نکلتی تھیں۔ بت کا قد دو فٹ کے قریب ہوتا تھا۔ اس کے عضوِ جنسی میں ڈورے بندھے ہوتے تھے جن کو کھینچنے سے اس میں عمودی جنبش پیدا ہوتی تھی۔ قدیم مصریوں میں اس پرستش کے عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک عالی مرتبہ مصری خاتون کی حنوط شدہ لاش کے ساتھ ایک سانڈ بیل کا حنوط شدہ عضو بھی برآمد ہوا تھا۔"

مسٹر ہاٹنے بیان کرتے ہیں کہ :-

"جنوبی اطالیہ کے شہر پاکستم میں جہاں یونانیوں کا اثر تھا۔ آئسین کے

مندر سے چار ہزار پتھر کے ٹکڑے مردانہ عضو کی شکل کے برآمد ہوئے تھے"۔

ہندوؤں میں پرستاران شیو اب بھی "لنگ پوجا" کے لئے خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔

مذہبی فحاشی کی عجیب غریب صورتیں اس سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ اعضاء جنسی کی پرستش کہاں کہاں اور کس کس طرح پائی جاتی تھی لیکن اسی کے ساتھ ایک پہلو بحث کا یہ رہ جاتا ہے کہ اس طریق پرستش کا اثر عام اخلاق انسانی پر کیا ہوا اور اس سلسلہ میں عبادت گاہوں کے اندر کس کس طرح دادِ عیش و کامرانی دی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اول اول اکثر قبائل میں یہی دستور تھا کہ شادی بیاہ اپنے ہی عائلہ وقبیلہ کے افراد میں کرتے تھے۔ نہ کسی غیر قوم کی بیٹی لیتے تھے نہ اپنی بیٹی دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اولاد کمزور پیدا ہونے لگی، اسی اثنا میں لوگوں نے دیکھا کہ اگر لڑکی کی شادی کسی غیر خاندان والے سے ہوجاتی ہے تو اولاد جسمانی و دماغی لحاظ سے ترقی یافتہ پیدا ہوتی ہے۔ پس بقاءِ قوم اور تقویتِ نسل کے خیال سے لوگوں کو غیر اقوام کے ساتھ وابستگی کا خیال پیدا ہوا لیکن چونکہ اس میں ایک قسم کی سُبکی اور اخلاقی بُرائی تھی، اس لئے قوم کے بزرگوں اور مقتدایانِ دین نے بین الاقوامی طریقۂ ازدواج جاری کرکے جھگڑے پیدا کرنا تو مناسب نہ سمجھا لیکن ہر عورت کے لئے مذہباً فرض قرار دے دیا کہ وہ عمر بھر میں کم از کم ایک مرتبہ کسی اجنبی کو ملتفت ہونے کا موقع دے، پھر چونکہ اس کا تعلق مذہب سے قرار دیا گیا تھا اس لئے عبادت گاہوں کو ہی اس کام کا مرکز قرار

دیا گیا اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ کسی دیوی کا مندر، تاکہ عورتیں جلد اس طرف مائل ہو سکیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سنجر نے لکھا ہے کہ:۔

”کلدانیہ میں کسی وقت ہر بابلی عورت کا قانونی فرض تھا کہ وہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور مابلتا دیوی کے مندر میں جا کر آزاد ہو جائے۔ ہیروڈوٹس نے دورانِ سیاحت میں وہ معبد، میدان اور باغ دیکھا تھا جہاں اس قسم کی آزادی سے کام لیا جاتا تھا، یہ مقامات تمام ایسی عورتوں سے بھرے رہتے تھے جن کے سر کے بالوں میں ڈوری بندھی ہوتی تھی، یہ گویا علامت تھی اس امر کی کہ ایسی عورت آزاد ہے، جب کوئی عورت اس مقررہ مقام میں داخل ہو جاتی تھی تو جب تک وہ اپنا فرض ادا نہ کر لیتی تھی اُسے باہر جانے کی اجازت نہ ملتی تھی اور جو رقم وصول کرتی اُسے دیوی پر چڑھا دیا جاتا تھا، بعض عورتیں جو بدصورت ہوتی تھیں انھیں کوئی خریدار نہ ملنے کے باعث تین تین سال تک مندر کے احاطہ میں پڑا رہنا پڑتا تھا، لیکن جو عورت نوجوان خاندانی اور خوبصورت ہوتی تھی اُس کو چند منٹ سے زیادہ انتظار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس عجیب و غریب رسم کا حال یاروخ نبی نے بھی بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس وقت اس کا رواج اس قدر بڑھ گیا تھا کہ روز کی گفتگو میں جب کوئی عورت اپنی ہمسائی کو طعن دیتی تو کہتی تھی کہ ”تو اس قابل نہ تھی کہ تیرے کمربند پر ہاتھ ڈالا جاتا۔“ اسی قسم کا حال یونانی مؤرخ و سیاح استرابو (Strabo) نے بھی لکھا ہے اور دیگر مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ [illegible]

کے زمانہ میں اس قسم کی فحاشی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔"

کلدانیہ میں جس دیوی کا نام مالکتا تھا وہی دیوی فینقیہ۔ شام و قرطاجنہ میں استار کہلاتی تھی۔ یعنی صرف نام کا فرق تھا ورنہ ہر جگہ یہی تمام باتیں پائی جاتی تھیں اور یہی فواحش ہر جگہ نظر آتے تھے۔

اسی قسم کی باتیں لیجیون اور اُن کے جانشین قدیم ایرانیوں میں بھی جاری تھیں، اُن کے ہاں عشق و محبت کی دیوی کا نام مترا تھا۔ اس دیوی کے تہواروں میں بے حد فحش ہوتا تھا۔

بابل میں جو معبد اس کے لئے مخصوص تھا اُسے بیت شجاچو (Bit Shagacho) یعنی "مقام وصل" کہتے تھے۔ بابل کے متعلق دیوڈورس سیقولس نے لکھا ہے کہ:-

"ملک کی ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ تمام عمر میں کم از کم ایک مرتبہ دیوی کے معبد میں جائے اور کسی اجنبی سے "واصلت" چاہے۔ بہت سی عورتیں جو دولتمند اور عالی خاندان ہوتی ہیں، وہ پردہ کی گاڑیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر عورتیں یہ کرتی ہیں کہ سر کے بالوں پر چاروں طرف قلادہ سا باندھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور اس طرح کی عورتیں کثرت سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ میدان میں ہر طرف معبد سے راستے بنا دیئے جاتے ہیں، جہاں عورتیں موجود رہتی ہیں۔ اجنبی مرد انہیں راستوں سے گزرتے ہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ جو عورت ایک مرتبہ معبد میں جا بیٹھتی ہے وہ اُس وقت تک وہاں سے نہیں جا سکتی جب تک وہ اپنے مقصد کو نہ حاصل

کرلے یعنی جب تک مرد، ان کی گود میں سکہ ڈال کر ان سے ملتفت نہ ہولے جو مرد کسی عورت کی گود میں سکہ ڈالتا ہے اُسے یہ الفاظ کہنے پڑتے ہیں: میری دعا ہے کہ "مالتا دیوی تجھ پر اپنا فضل و کرم کرے" (یہ دیوی وہی ہے جسے یونانیوں میں وینس کہتے ہیں) سکہ جو عورت کی گود میں ڈالا جاتا ہے وہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو لیکن عورت اس کے لینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ سکہ لینے اور دیوی پر چڑھانے کے بعد وہ عورت اپنے خریدار کے ساتھ مندر سے باہر چلی جاتی ہے جو عورت جمیل اور متناسب الاعضاء ہوتی ہے اُس کا خریدار بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے لیکن جو بدصورت ہوتی ہے اُسے بعض اوقات برسوں تک مندر ہی میں پڑا رہنا پڑتا ہے۔"

اوّل اوّل مصر میں اس قسم کی فحاشی کا رواج نہ تھا، لیکن کلدانیوں اور دوسری مشرقی قوموں نے یہ مشغلہ وہاں بھی رائج کر دیا اور نہایت شدت کے ساتھ! اسٹرابو نے لکھا ہے کہ مصر کے بڑے بُت کے لئے پجاری جمیل ترین لڑکیاں پسند کیا کرتے تھے جو مندر میں کچھ دنوں خدمت کرنے کے بعد شادی بیاہ کر سکتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اڈمنڈ وپوا سے تحریر کرتے ہیں کہ:-

"مصر میں نوجوان عورتوں اور مردوں کو عیش و نشاط کے جملہ اسرار سے آگاہ کر دیا جاتا تھا اور مرد و عورت باہم مل کر مندر کے اُن راستوں سے گزرتے تھے جو بالکل سنسان اور زمین دوز تھے۔ ہیرو ڈوٹس نے لکھا ہے کہ بو بسٹیز میں ہر سال آئسس دیوی کا جو میلہ ہوتا تھا اس میں سات لاکھ

جاتریوں کو عشق ومحبت کے اسرار سے آگاہ کیا جاتا تھا اور چونکہ اُس "عشق آموزی" یا "اُپدیش دینے کا اختیار صرف پجاریوں کو حاصل تھا اس لئے تمام آمدنی وہی آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔"

بعض فرقوں میں اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں دیوتا لڑکیوں سے اور دیویاں مردوں سے ملتفت ہو جاتی تھیں اسی طرح اب بھی ہو سکتا ہے، مصر قدیم کے شہر تھیبا (Thebes) کی نسبت ہیرودوتوس نے لکھا ہے کہ:۔

"وہاں ہر رات ایک عورت مندر میں پلنگ پر لٹا کر اونچی لٹکا دیجاتی تھی اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ رات کو کسی وقت دیوتا آئے گا اور اس سے ملتفت ہو گا۔ اسی طرح ملک لیسیا کے شہر تیارہ میں یہ رواج تھا کہ کسی نوجوان لڑکی کو دیوتا کے مندر میں بند کر کے قفل لگا دیا جاتا تھا۔ قطب شمالی کی رہنے والی ایسکیمو قوم میں اگرچہ لنگ پوجا تو نہیں پائی جاتی لیکن بعض تہواروں کے موقع پر ان کے ہاں فحاشی ضرور رہتی ہے۔ شمالی امریکہ کے دیگر قبائل میں سورج دیوتا کا جو سالانہ تہوار ہوتا تھا، اُس کی رسمیں عجیب دلچسپ طریقہ پر ادا کی جاتی تھیں، یعنی ایک شوہر دار عورت ننگی ہو کر زمین پر لیٹ جاتی تھی اور اپنا نفس دیوتا کے سامنے پیش کر دیتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دیوتا کا ایک انسانی نمائندہ عورت کی اس پیش کش کو قبول کر لیتا تھا۔ اسی طرح ملک نکاراگوا کے قدیم باشندے اور امریکہ کی نانچز قوم فصل بہار کے زمانے میں ایک دن کے لئے

اپنی عورتوں کو ہر قسم کی آزادی دے دیتی تھی۔"

بعض امریکہ کی پیپائل قوم کو ان کے مقتدایان دین یہ ہدایت کیا کرتے تھے کہ اگر عمدہ فصلوں کے پیدا ہونے کی تمنا ہو تو کھیت کے مالک کو لازم ہے کہ وہ اور اُس کی بیوی تخم ریزی کے زمانہ میں چند روز تک ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں اور جب تخم ریزی سے فرصت ہو جائے تو ایام مقررہ گزرنے کے بعد پورے جوش کے ساتھ عیش و نشاط میں مصروف ہو جائیں۔ بعض مقامات میں اس کے لئے خاص آدمی مقرر کئے جاتے تھے۔ جزیرۂ قبرص میں بمقام پافاس اور ملک شام میں بمقام بالبلوس فحاشی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ مشہور یونانی جغرافیہ داں استرابو نے ایشیائے کوچک کے شہر انطاکیہ کی نسبت بیان کیا ہے کہ یہاں کے معبدوں میں ہزارہا عورتیں رہتی تھیں، اور حد درجہ آزادی کے ساتھ دادِ عیش دی جاتی تھی۔

بحیرۂ روم کے مشرقی سواحل پر جتنے ملک تھے ان میں وسعت کے ساتھ "دیوی ماتا" کا مذہب جاری تھا۔ جزیرۂ کریٹ میں "دیوی ماتا" کے سوا کسی دوسرے دیوتا کا بت تھا ہی نہیں اور ملک فریجیہ میں بھی ایک بڑی دیوی "دیوتاؤں کی ماتا" کے نام سے پوجی جاتی تھی اور لوگ نہایت عقیدتمندی سے اس کے عضو جنسی کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح قدیم یونانیوں میں ڈمیٹر نام کی ایک دیوی تھی جو دراصل "دیو ماتری" یعنی "دیوتاؤں کی ماتا" تھی۔ الغرض تمام مہذب و متمدن ممالک میں ایک ہی دیوی مختلف ناموں سے پوجی جاتی تھی جس کے نام ایستار، استارتھ، سائبلا، ڈیمٹر، آئسیس، افرودیتہ تھے اور ان کے

معبدوں میں انتہا درجہ کی فحاشی ہوتی تھی۔ شہر الفی سوس میں ڈیانا دیوی کا مشہور بت بالکل برہنہ ہی بنایا جاتا تھا اور پافوس میں سیکڑوں عورتیں افرودیتہ کے نام سے دنیا بھر کے مردوں کی خواہشات پوری کرتی تھیں۔ اسی طرح اسکندریہ، ہیلوپولیس، بیبی نوس وغیرہ میں ہر جگہ یہ تمام حرکات ناشائستہ پائے جاتے تھے اور انسانی زندگی خواہش نفسانی کے لئے وقف تھی۔

تھسموفوریا کے نام سے دیمیتر دیوی کا ایک تہوار ہوتا تھا جس میں عورتیں آٹے کا عضو جنسی بناتی تھیں اور اس کے ساتھ فحش مذاق کرتی ہوئی نکلتی تھیں لیکن اُن کے جلوس میں کسی مرد کو شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہی حال علاوہ تہوار میں ہوتا تھا اور سائراکیوز میں یہ رواج تھا کہ جب تھسموفوریا کا تہوار آتا تھا تو زنانہ شکل کی میٹھی روٹیاں پکا کر دیوی کے استھان پر چڑھائی جاتی تھیں۔ قدیم رومیوں میں باکوس، لائبر، پریاپس اور وینس کی پرستش ہوا کرتی تھی جن کا تعلق عشق و محبت سے تھا، اول الذکر دیوتا کا تعلق شراب خواریوں اور بدمستیوں سے تھا۔ دوسرا دیوتا وہی ہے جس کے نام سے انگریزی لفظ (Libertine) یعنی عیاش یا شہوت پرست نکلا ہے۔ وینس عشق و محبت اور عیش و عشرت کی دیوی تھی۔

پریاپس کا بت برہنہ بنایا جاتا تھا اور جن لڑکیوں کی شادی ہونے والی ہوتی تھی۔ یا جو عورتیں بانجھ ہوتی تھیں وہ اس بت کے عضو پر گھوڑے کی طرح اِدھر اُدھر ٹانگیں کر کے بیٹھ جاتی تھیں اور پھول چڑھاتی تھیں۔ سالانہ تہوار کے دن اس بت کو رتھ میں بٹھا کر عورتیں گاتی ہوئی بصورت جلوس نکلتی تھیں۔

جب وینس کا تہوار ہوتا تھا تو پریاپس کے بُت کو مندر میں پہنچایا جاتا اور وینس کے ساتھ اس کو ملا دیا جاتا۔ سالانہ تہواروں کے موقع پر میٹھی ٹکیاں پکائی جاتی تھیں۔ جن پر اعضاء جنسی کی صورت کے ٹھپّے لگا کر نئی دلہنوں اور شادی شدہ عورتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

یہ حالت تو قدیم زمانہ کی تھی لیکن تماشا یہ ہے کہ بلادِ یورپ میں دینِ مسیح کی اشاعت کے بعد بھی یہی فحاشیاں بدستور جاری رہیں۔ جس شہر کا نام کسی زمانہ میں پافوس تھا وہ اب کوکلیا کہلاتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں ایک انگریزی سیاح مسٹر ڈی۔ جی۔ ہوگرتھ نے لکھا ہے کہ :۔

"اس علاقہ کے کسان ہر سال ایک روز افرودیتہ دیوی کے تباہ شدہ مندر میں محراب کے وسطی پتھر پر تیل لگاتے ہیں اور پتھروں میں جو سوراخ ہوتے ہیں وہاں لغو حرکات کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عمل سے ان کی بیویوں کا بانجھ پن جاتا رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کی پوجا میں عیسائی بھی شریک ہوتے ہیں"

امریکہ کا سیاح جوزف میک کیب لکھتا ہے کہ :۔

"میں نے ۱۹۰۶ء میں ویزہ (قدیم پایۂ تخت ملک تھریس) کے گرد و نواح میں یونانی عیسائیوں کو دیکھا کہ وہ ہر سال ایک مذہبی ڈرامہ کھیلتے ہیں، جس میں خاص ایکٹر کے پاس ایک بہت بڑا چوبیں عضو ہوتا ہے یہ شخص لڑکیوں کو پکڑنے دوڑتا ہے اور جس کو پکڑ لیتا ہے گویا اُس سے شادی ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں وہ مرد اور لڑکی نہایت فحش طریقے سے ناچتے ہیں اور یہ

حرکت کرتے ہوئے بازاروں میں نکلتے ہیں اور چندہ جمع کرتے ہیں۔ الغرض یہ تہوار انتہائی سیاہ مستیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ناروے اور سویڈن کے عام کھیل تماشوں میں اس قسم کی حرکات کی جاتی ہیں۔"

آئرلینڈ میں ایک عورت کا بُت جو اپنے خاص حصۂ جسم کی طرف اشارہ کرتی ہوئی دکھائی جاتی تھی۔ گرجا کے صدر دروازہ میں محراب کے وسطی پتھر کے بجائے نصب کرتے تھے کہ شیاطین داخل نہ ہوں۔ اس کو قلطی زبان میں شیلا نہ جگ کہتے تھے۔ ایسا ہی ایک پتھر چند سال گزرے ملک کارک کے گرجا کے صدر دروازہ میں نصب تھا، دوسرا پتھر شہر ڈبلن میں رائل آئرش اکاڈیمی کے اندر پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کی اور تصویریں برطانیہ اور اسپین کے گرجاؤں میں بھی تھیں۔ لیکن اصلاح مذہب کے زمانہ میں اس طرح کے بُت توڑ دیے گئے۔

ڈاکٹر ہالفورڈ نے لکھا ہے کہ:-

"اس قسم کی ایک تصویر ہیرفورڈشائر اور دوسری کارنوال میں ابتک موجود ہے۔ انگلستان کے بعض حصوں میں اس شکل کے پتھر ابھی تک کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دورسٹ شائر میں ایک پتھر چار فٹ لمبا موجود ہے جو بالکل اصل کے مطابق ہے۔ اسی ملک میں ٹرینڈیل کی پہاڑی پر زمین کھود کر ۱۸۰ فٹ لمبی ایک دیوزاد تصویر بنائی گئی ہے جسے سرنی دیو کہتے ہیں۔ یہ بُت بالکل عُریاں ہے اور ہر سات برس کے بعد اس کو صاف کیا جاتا ہے۔"

اطالیہ کے ملک ابروزائی میں بمقام آئسرنیا ہر سال سینٹ کاسماس اور

سینٹ دانیال کے میلے ہوا کرتے تھے۔ ان میں شریک ہونے کے لئے بانجھ عورتیں اور اعضاءِ جنسی کی بیماریوں کے مریض دور دور سے آتے تھے، دکانیں موم کے بنے ہوئے اعضاء سے بھری ہوتی تھیں اور بانجھ عورتیں انھیں خرید کر گرجا میں چڑھاتی تھیں۔ امراضِ خبیثہ کے مریض ننگے ہوکر پادریوں کے سامنے کھڑے ہوجاتے تھے اور وہ متبرک تیل لگاتے تھے۔ جب پیرون والیٹر نے ان کا بُری طرح مضحکہ اُڑایا تو مجبور ہوکر ۱۷۸۰ء میں پاپائے اعظم کے ایک فرمان کے ذریعہ سے یہ مراسم بند کرادیے گئے۔

الاتیری میں جو روم سے اور بھی زیادہ قریب ہے، مکانات کی دیواروں پر اعضاءِ جنسی کی تصویریں کھنچی ہوئی موجود ہیں جو غالباً پہلے زمانہ میں تمام اطالیہ کے اندر عام طور سے پائی جاتی تھیں۔ مگر اب یہ رسم ہوگئی ہے کہ ایسٹر سنڈے کو لوگ جاکر ان تصویروں پر کنکریاں مارتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جو عورتیں اس سنگ باری میں شریک ہوتی ہیں ان کے گلوں میں سونے کے بنے ہوئے اعضاءِ جنسی پڑے ہوتے ہیں جن کی صورت عام طور پر ایسی ہوتی ہے گویا کسی شخص کی مٹھی بند ہے اور انگوٹھا انگلیوں کے درمیان دبا کر کسی قدر باہر نکلا ہوا ہے، اس زیور کو عام طور پر دیہاتی پہنتے ہیں اور اس کا نام فیکو ہے۔ روم کے پورٹسائی عجائب خانہ میں قربان گاہ کا ایک ظرف ہے جس میں ایک عورت کی تصویر اس طرح کھدی ہوئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں مردانہ عضو لئے ہوئے ہے۔ مقام ترانی میں چند سال پیشتر تک کارنیوال کے موقع پر ایک عریاں بت نکالا جاتا تھا، جس کا نام "مقدس عضو" تھا۔

۱۵۸۵ء میں جب پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگوں نے امبروم فتح کیا تو انھوں نے تبرکات میں ایک دلچسپ چیز پائی جس کو بانجھ عورتوں نے شراب ملتے ملتے سُرخ کردیا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جسے لا معلوم زمانہ سے پادری لوگ فوتین راہب کا عضو بتایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ راہب شہر لائیس کا اولین پادری تھا اور تمام علاقہ اس کا بے حد معتقد تھا اور ہر جگہ اس کے مخصوص حصۂ جسم کے مومی نمونے پائے جاتے تھے۔

جنوبی فرانس میں گرجاؤں کے اندر موم کے بنے ہوئے اعضاء چھتوں میں لٹکایا کرتے تھے۔ میٹھی ٹکیاں جن پر اعضاءِ جنسی کا نشان بنا ہوتا تھا بکثرت فروخت ہوتی تھیں، پُرانے زمانے کے جو پتھر کہیں کہیں نصب تھے وہاں بانجھ عورتیں جاکر اپنا جسم اُس سے مس کرتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ بھی سننے کے قابل ہے کہ راہب فوتین کون بزرگ تھے۔ درحقیقت یہ ایک عُریاں بُت تھا جس کے معتقدین کی بہت کثرت تھی۔ جب مسیحیت کا دور شروع ہوا تو پادریوں اور راہبوں نے دیکھا کہ اگر یہ بُت توڑ دیا گیا تو عوام کو ناگوار گزرے گا اور آمدنی کا ایک معقول ذریعہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اس لئے انھوں نے یہ چالاکی کی کہ اس بُت کو اصطباغ دے کر عیسائی بنالیا اور اس کے متعلق یہ روایت گڑھی کہ یہ کسی وقت بڑا زبردست ولی گزرا ہے۔

سینٹ ٹرز، ٹینی میں، سینٹ گائلز، انجو میں اور سینٹ رینی سب اسی قسم کی فرضی ہستیاں تھیں۔ ایک بزرگ اور بھی تھے جن کا اسم مبارک سینٹ ارنود

تھا۔ لیکن اس کے بُت پر کپڑا پڑا رہتا تھا۔ جو صرف بانجھ عورتوں کے لئے اُٹھایا جاتا تھا۔ امبریخ میں سینٹ پوٹرڈیس کے گرجا کے اندر ایک چوبی عضو تھا جس پر تیز اسنڈھار ہتا تھا۔ لوگ اس کی پوجا بہ کثرت کرتے تھے۔ بائبل میں جو روایات اس قسم کی فحاشی کی درج ہیں ان کو ہم یہاں درج نہیں کرتے۔ ہر شخص انھیں دیکھ سکتا ہے۔ قدیم زمانہ کے عبرانیوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ حلف اٹھاتے تھے تو زور دینے کے لیے اپنے عضو پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے تھے کیونکہ عضو مخصوص تمام جسم میں نازک ہونے کے علاوہ ایسی چیز بھی ہے جس پر انسان کی نسل کا انحصار ہے اور اپنی اولاد بہت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کے نزدیک یہ عضو افزائش نسل کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ مثلاً کتاب پیدائش کے باب ۲۴ آیتہ ۲ میں ابرہام اپنے سب سے معمر نوکر کو طلب کر کے کہتا ہے :۔

"میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اپنا ہاتھ ران کے تلے رکھ اور میں تجھ سے خداوند کی جو آسمان کا خدا ہے اور زمین کا خدا ہے قسم لوں گا۔"

اسی طرح اسرائیل نے کتاب پیدائش کے باب ۴۷ میں یوسف کو حلف دیتے ہوئے کہا ہے :۔

"اور جب اسرائیل کے مرنے کا وقت پہنچا تب اس نے اپنے بیٹے یوسف کو بلا کر اس سے کہا کہ اب جو میں نے تیری نظر میں مہربانی پائی تو اپنا ہاتھ میری ران تلے رکھ اور مہربانی اور صداقت کا سلوک میرے ساتھ کر۔ مجھ کو مصر میں نہ گاڑنا۔ میں اپنے باپ دادا کے پاس سوؤں گا، تو مجھے مصر

سے باہر لے جا اور اُن کے گورستان میں گاڑ۔"

بائبل کی ان آیات میں "ران تلے" کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے مُراد انثیین ہیں۔ کیونکہ عبرانیوں میں سب سے زیادہ پختہ حلف وہ ہوتا تھا جو خصیتین پر ہاتھ رکھ کر لیا جاتا تھا۔ واضح ہو کہ بائبل کے دو حصہ ہیں۔ ایک (Oold Testament) یعنی عہد نامہ عتیق اور دوسرا (New Testament) یعنی عہد نامہ جدید اور (Testament) اور (Testimony) شہادت اور (معاہدہ) کا مادہ بھی وہی ہے جو (Testicle) (خصیتین) کا ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد و پیمان یا حلف کے باب میں خصیتین کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔

قدیم مصریوں میں بھی یہی رواج تھا کہ جب وہ قسم کھاتے تھے تو اپنے عضو کو اوپر اُٹھا دیتے تھے۔

مذہبی فحاشیوں کی مرموز علامتیں

گزشتہ بیان سے واضح ہو گیا ہے کہ اعضاء جنسی کا تقدس یعنی قدرت کے قوائے تخلیقیہ کی پرستش انسان قدیم کے ادارۂ مذہبی میں داخل تھی اور اب بھی بعض قوموں میں کسی نہ کسی صورت سے اس کا رواج چلا آ رہا ہے۔ جو قومیں ترقی کر کے اپنے قدیم مراسم کو ترک کر چکی ہیں گو اُن کے ہاں براہ راست اس قسم کی پرستش نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی بہت سی علامات اُن کی معاشرت و تہذیب اور موجودہ طریق عبادت میں ایسی نظر آتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی وقت ان کے ہاں یہ مخصوص پرستش ضرور پائی جاتی تھی۔

قدیم ترین اقوام و ملل میں تولید و تناسل ایک طرح کا مقدس فعل سمجھا جاتا تھا

اسی لئے اعضاء جنسی کی علامتیں اور صورتیں بالکل نمایاں طور پر بنائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اب بھی بیشمار باقیات قدیم زمانہ کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کی پرستش کا عقیدہ پہلے بہت عام تھا، بعد کو امتداد زمانہ کے ساتھ جب اُن علامتوں سے حجاب آنے لگا تو ان میں تغیر و تبدل کیا گیا اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ انسان رفتہ رفتہ ان کی کھلی ہوئی پرستش سے منحرف ہو کر مرموز علامتوں سے کام لینے لگا۔ اس زمانہ میں بھی اگر اُن قوموں کی معاشرتی رسموں اور قدیم روایات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی روز کی زندگی میں پوشیدہ یا علانیہ متعدد علامتیں اس طریق عبادت کی پائی جاتی ہیں۔

قدیم مصریوں، فینقیوں، پومپائی والوں، یونانیوں اور بہت سی ایشیائی اقوام و ملل میں چونکہ مقدس مباشرت کا رواج بہت تھا اس لیے اعضاء جنسی کی پرستش بھی بکثرت پائی جاتی تھی، چنانچہ اُن کے کھنڈروں سے ان کی حجری شکلیں کثرت سے برآمد ہوئی ہیں اور اب بھی اُن کے عبادت خانوں میں اس قسم کی علامتیں یا صورتیں اکثر و بیشتر نظر آتی ہیں۔ کیمم[1] مصر قدیم کا نہایت مشہور دیوتا تھا اور اس سے جذباتِ محبت یا جذباتِ نفسانی منسوب کیے جاتے تھے۔ اس کے متعلق رالنس نے اپنی تاریخ مصر قدیم میں لکھا ہے کہ:۔

"اس کو حد درجہ فحش و حیا سوز صورتوں میں دکھایا جاتا تھا۔"

زمانہ حال کے بعض ماہرین مصریات اس کی عریانی پر تاویلات کا پردہ

---

[1] غالباً کیمم یا کا متعف وہی دیوتا ہے جسے ہندوؤں کے یہاں "کام دیو" کہتے ہیں اور جو عشق و محبت یا تعلق جنسی کا دیوتا مانا جاتا ہے۔

ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی شرم انگیز عریانی کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی اور نہ عقلِ انسانی باور کر سکتی ہے کہ ایسے دیوتا کی پرستش کا اخلاقِ انسانی پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے۔ قدیم اہلِ مصر کا خیال تھا کہ تعمیم قدرت کے قوائے تخفیفہ کا مظہر اتم ہے اور اس کا بت دیکھنے سے دل میں اس قانون قدرت پر عمل کرنے کی تحریک ہوتی ہے جس کے ماتحت موالید ثلاثہ اپنا ہمجنس پیدا کرتے ہیں جس طرح قدیم یونان میں پان بت کے سلسلۂ پرستش میں صدہا قسم کی ناپاک رسمیں داخلِ مذہب ہو گئی تھیں، اسی طرح مصر میں بھی کھیم کی پرستش کے سلسلہ میں سیکڑوں حرکات ناشائستہ سرزد ہوتی تھیں اور اس مقدس دیوتا کا بت مع تمام اعضاء کے عریاں بنایا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اس میں بکرے کی تمام خصوصیات شہوانی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے مندر میں ایک بکرا بھی رکھا جاتا تھا جس کا نام کامتف تھا۔

ہر چند قدیم زمانہ کے لوگوں میں یہ رواج عام تھا وہ اعضاء جنسی کی تصویر چاندی یا تانبہ کی تختی پر کھد واکر بطور تعویز یا طلسم گلے میں ڈالے رہتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ اس تعویذ یا طلسم کے اثر سے اولاد زیادہ ہو گی، لیکن اس زمانہ کی عورتیں بھی بعض ایسے زیور استعمال کرتی ہیں جو حقیقتاً اعضاء جنسی ہی کی مرموز صورتیں ہیں، لیکن انھیں اس کا علم نہیں۔ ذیل میں ہم اُن بعض رموز اشکال کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق حقیقتاً انھیں اعضاء سے ہے اور لوگ اس کی اصلیت سے ناواقف ہیں۔

صلیب | صلیب کا تعلق عموماً عیسائی مذہب سے سمجھا جاتا ہے اور عیسائی

اس کو اپنے مذہب کی خاص علامت سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عیسائیوں کی بہت سی مذہبی رسمیں، بجنسہٖ یا کسی قدر تغیر و تبدل کے ساتھ قدیم مذاہب سے لی گئی ہیں، اسی طرح صلیب بھی ان میں آئی، غالباً یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صلیب مسیح سے صدیوں قبل مصر قدیم میں مردانہ آلۂ جنسی کی مرموز شکل تھی جیسا کہ وہاں کے آثارِ قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے اور ہندوستان میں بھی صلیب کا نشان اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اب تک ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کا "لنگم"، یونانیوں کا "فلس"، رومیوں کا "پریاپس" اور عیسائیوں کی "صلیب" جسے وہ "حیات ابدی" کی نشانی سمجھتے ہیں در حقیقت ایک ہی چیز ہیں اور ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں۔

قدیم مصر میں "T" وضع کی صلیب مسیحیت سے صدیوں پیشتر قوائے تخلیق کی علامت سمجھی جاتی تھی اور چونکہ اسی قوت کے ذریعہ سے دنیا کا سلسلۂ تخلیق جاری رہتا ہے۔ اسی لئے غالباً عیسائیوں نے صلیب کو "حیاتِ ابدی" کا نشان قرار دیا۔ تمام بڑے بڑے عجائب خانوں میں (مثلاً میٹروپولٹن میوزیم نیویارک برٹش میوزیم (لندن) یا لوورے (پیرس)، شعبۂ مصریات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں اعضاء جنسی کو ظاہر کرنے کے لئے کنایتہً بہت سی چیزوں سے کام لیا جاتا تھا اور انھیں میں سے ایک شکل "T" تھی، لیکن اگر اس کو دستہ دار صلیب یعنی اس شکل + میں ظاہر کرتے تھے تو اس سے دونوں جنس کے اعضاء کا اتصال مقصود ہوتا تھا۔ چنانچہ وادی النیل (ملک مصر) کے آثارِ قدیمہ کی سیر کرنے سے آپ کو وہاں کے در و دیوار پر "ستاؤ" (T)

کی ہزارہا صورتیں کھنچی ہوئی یا کھدی ہوئی نظر آئیں گی۔حتیٰ کہ بعض بعض دیوتاؤں کے ہاتھ میں بھی ''تاؤ'' (T) ہوگا۔

دستہ دار صلیب کو قدیم کلدانیوں اور فنیقیوں میں بھی بہ نگاہ تقدس و احترام دیکھا جاتا تھا۔تاؤ وضع کی صلیب کا استعمال مسیحیت سے پیشتر آئرلینڈ میں بھی پایا جاتا تھا اور قدیم میکسیکانیوں میں بھی اس وضع کی صلیب کے مختلف نام تھے مثلاً:۔''شجرۃ الحیات''، ''شجرۃ القوۃ'' اور ''شجرۃ اللحم''۔ قدیم حبش میں جو شکل تاؤ کی بنائی جاتی تھی وہ عام مسیحی صلیب کی طرح تھی جیسی الیزبتھ ای گولڈ اسمتھ نے قدامت صلیب کے متعلق تحریر کیا ہے کہ:۔

''صلیب بہت قدیم زمانہ سے استعمال ہوتی چلی آئی ہے اور مختلف اقوام و ملل میں ایک مذہبی نشان تصور کی جاتی ہے۔تمدن انسان کے ہر درجہ میں یہ چیز موجود رہی ہے۔امریکہ کی ایک قوم جس کا نام ''انکا'' ہے صلیب کا بہت زیادہ احترام کرتی ہے۔چنانچہ گوئیا کے قدیم باشندے صلیب کا نشان اپنی پیشانیوں پر گودتے ہیں۔قدیم انگلستان کے ڈروئڈ لوگ اس کی پوجا کیا کرتے تھے اور عیسائیوں کے نزدیک تو یہ حیات ابدی کا نشان ہے۔الغرض زندگی کا خیال صلیب کی علامت سے کبھی خالی نہیں رہا۔''

مسٹر ہسلاپ تحریر کرتے ہیں کہ:۔

''عیسائی دنیا میں گڈ فرائیڈے کو جو صلیب نما میٹھی روٹی کھائی جاتی ہے اور ایسٹر سنڈے کو جو رنگے ہوئے انڈے کھائے جاتے ہیں یہ سب رسمیں قدیم کلدانیوں سے لی گئی ہیں جن کے نزدیک یہ چیزیں ایک خاص

مذہبی حیثیت رکھتی تھیں۔ بیٹھی۔ دیویاں کلدانیوں میں "ملکۂ فلک کی پوجا کے
روز کمائی جاتی تھیں جس کا نام "ہیسٹر دیوی" یا ایشتار یا استارتہ تھا
اور تمام باتیں اُس وقت بھی پائی جاتی تھیں جب سیکراپس نے یونان کے
دارالحکومت شہر ایتھنز کی بنیاد قائم کی تھی۔"

مثلث | یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ عیسائیوں میں تثلیث کا خیال کیونکر آیا۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مثلث قدیم زمانہ میں ایک متبرک نشان سمجھا جاتا تھا اور اعضاء جنسی کی مرموز شکل متصور ہوتا تھا اگر اس کی چوٹی نیچے ہوتی جیسے ▽ تو وہ نسائی عضو کی علامت سمجھا جاتا تھا اور اگر اس کی چوٹی اوپر ہوتی جیسے △ تو اُسے مردانہ عضو کی نشانی سمجھتے۔ اور دو مثلثوں کے میل سے جو چھ کونوں کا ستارہ بنتا ہے جیسے ✡ تو اس کو دونوں جسم کے اعضا کا اتصال سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں کے تمام معابد میں اس قسم کے ستارے ✡ بکثرت دیکھنے میں آتے تھے اور ان کی اصطلاح میں مہر سلیمانی[1] کہتے تھے۔ قدیم عبرانیوں میں مثلث کی شکل زمین کے قوائے تخلیقیہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔"

چینیوں میں قدرت کی تخلیقی قوتیں دو سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام "یانگ" ہے جو مذکر قوت ہے۔ دوسری کا نام "ین" ہے یعنی قوت مؤنث۔ چینیوں کے عقیدے میں انہیں دونوں قوتوں کے اتصالِ باہمی سے ایک تیسری

[1] معلوم ہوتا ہے کہ بعض تعویذوں کو نقش سلیمانی کہنا اسی بنا پر ہے۔ کیونکہ وہ تعویذ بھی تقریباً اسی طرح کے بنائے جاتے ہیں۔

جُداگانہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے "جان" کہتے ہیں۔ چینی مذہب میں تثلیث
کے اجزاء آسمان، یانگ اور زمین ہیں۔ ان کے عقیدے میں انھی چیزوں
کے ملنے سے "قوتِ خلاق" پیدا ہوتی ہے۔ اس قوت کو ان کی اصطلاح
میں "اتحادِ قوائے ثلاثہ" بھی کہتے ہیں۔ بہت سی قدیم قوموں میں بجائے
مثلث ترسول کا نشان ہوتا ہے جو ان کے نزدیک مختلف قوموں کے
اتحاد کا مظہر تصور ہوتا تھا۔ مثلاً کسی کے نزدیک آسمان، زمین اور پانی۔
کسی کے نزدیک آتش، آب و ہوا۔ کسی کے نزدیک شمس، قمر اور زہرہ۔ پیروانِ
زردشت کے نزدیک مثلث یا ترسول، آتش۔ نور اور ایثر (ایتھر) کا مظہر
تھا اور عبرانیوں کے نزدیک آتش، نور اور ہوا (یا روح) کی علامت
سمجھا جاتا تھا۔"

قدیم مصریوں میں ہر مندر تین مورتوں سے منسوب کیا جاتا تھا (۱) دیوتا
(۲) دیوی (۳) ان دونوں کا ثمرۂ اتصال یعنی بچہ، لیکن یہ تینوں تثلیث
فی التوحید کی صورت میں ہوتے تھے اور اس تثلیث کے اظہار کی صورت
یہ ہوتی تھی کہ ایک حلقہ میں مثلث کھینچ دیا جاتا تھا جیسے  اس کے
معنی سیت ہورس اور شیو تھے اور تینوں معبودوں کی تشریح یہ کی جاتی تھی
کہ ہورس برسات ہے اور سیت خشک سالی اور شیو ہواؤں اور طوفانوں
کا دیوتا ہے۔ شیو کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلا دیوتا تھا
جس نے زمینوں سے آسمانوں کو بصورتِ مثلث پیدا کر کے بلند کیا اور اس کی
تصویر بھی اس طرح دکھائی جاتی تھی کہ وہ ایک مثلث پر کھڑا ہوا ہے جس کے اندر

سات زینے (یعنی سات آسمان) بنے ہوتے ہیں یہ دیوتا دوسرے جنگجو دیوتاؤں کے درمیان ثالث یا حَکم کا کام کرتا تھا۔

ایک تشریح مصری تثلیث کی یہ بھی تھی کہ نوت آسمان کا دیوتا ہے۔ سیب زمین کی دیوی ہے اور شیو فضا کا دیوتا ہے۔ لیکن قدیم مصریوں کی سب سے زیادہ مشہور تثلیث اوسیریز، آئسس اور ان کے بیٹے ہورس پر مشتمل تھی اور اسی تثلیث سے غالباً مسیحی تثلیث لی گئی ہے جس کا مفہوم ان کے یہاں باپ بیٹا اور روح القدس ہے۔ لیکن ان تمام "تثلیثات" کی اصل وہی اعضاء جنسی یا قوائے شہوانی کی تعبیر ہے جو وجود حیات کا باعث ہیں۔

مچھلی

ڈاکٹر فرائیڈ اور دیگر ماہرین نفسیات نے لکھا ہے کہ مچھلی بھی قدیم اقوام و ملل میں عضو جنسی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور ایک مقدس چیز سمجھ کر اس کی پرستش کی جاتی تھی، چنانچہ بودھوں، مصریوں، بابلیوں، آشوریوں اور فنیقیوں کی مقدس سنگ تراشی میں مچھلی کی شکلیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

دو مچھلیاں اگر اس طرح بنائی جائیں کہ ایک کی دُم دوسرے کے سر سے ملی ہو جیسے  اور اس پر بھدا سا انجیر کا پتہ ہو تو اسے عورت کا عضو جنسی سمجھا جاتا تھا۔ مصریوں میں، جب آئسس دیوی کی تصویر بنائی جاتی تھی تو اس کی گود میں اس کا بچہ ہورس بھی بناتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ دیوی کے سر پر ایک مچھلی بھی بنا دی جاتی تھی۔

ہندوؤں کے بت اردناری ایشوری کے سر پر بھی ایک بنت البحر یعنی جل کنیا کی صورت بنائی جاتی ہے یہ بت گویا برہما کا ہے اور اس علامت میں دکھایا

جاتا ہے جب کہ وہ تکوین عالم کے کام میں مصروف تھا، اس کا داہنا حصہ مردانہ اور بایاں حصہ زنانہ ہے اور اعضاء جنسی کو دستہ دار صلیب کی صورت میں دکھایا جاتا ہے جو زنانہ و مردانہ اعضاء کے اتصال باہمی کی نشانی ہے۔ چونکہ مچھلی بیشمار انڈے بچے دیتی ہے اس لئے قدیم زمانہ کے لوگ اسے افزائش نسل کی دیوی سمجھتے تھے۔

بیضاوی یا اہلیلجی شکل بیضاوی شکل ⬯ بھی ایک عام علامت ہے جس کے ذریعہ سے نسائی عضو جنسی کو ظاہر کیا جاتا ہے بعض اوقات ایک لمبوتری چوگوشیہ شکل ◆ سے بھی یہی مفہوم ظاہر کیا جاتا ہے۔

ناظرین یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ گرجاؤں کی کھڑکیاں اور دروازے عموماً زنانہ عضو جنسی کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ بعض مذہبوں کے ماننے والے ایسے سوراخوں میں سے گزرتے ہیں جو پتھر میں بیضوی شکل کے بنائے جاتے ہیں اس سے مُراد یہ ہے کہ گویا وہ ازسرِنو پیدا ہوئے ہیں اور ایک نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم ہیں۔

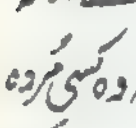
ڈاکٹر لی الگزینڈر راسٹون نے گرجاؤں کی طرز تعمیر پر بحث کرتے ہوئے اس کی جنسی یا شہوانی نوعیت پر کافی روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"جب کوئی شخص کسی گرجا میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک دوہرے دروازے کے ذریعہ سے داخل ہوتا ہے جو بمنزلہ شفرۂ کبیر Labia Minora کے ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس شخص کو ایک اور دوہرے دروازہ میں جانا پڑتا ہے جو بمنزلہ شفرۂ صغیرہ (Labia Minora) کے ہے جب وہ اندر یعنی اندام اندرونی (Vagina) میں پہنچتا ہے تو اسے اپنے سامنے قربان گاہ یعنی رحم (Womb) نظر آتا ہے اور

قربان گاہ کے دونوں طرف اُسے دروازے نظر آتے ہیں جو گویا نلے
(Fallipuar Tubes.) ہیں، قربان گاہ میں اسے بپتسمہ دیا
جاتا ہے یعنی رطوبتِ رحمی (Amniate Fluid) لگتی ہے
اس کے بعد وہ گرجا سے باہر آتا ہے یعنی دوبارہ پیدا ہو کر باہر نکلا ہے۔
قرونِ وسطیٰ کے بہت سے گرجاؤں کے صدر دروازوں پر نسائی عضو جنسی
کی تصویر نقش کر دی جاتی تھی اور اب بھی کلیسائے ڈبلین کی کمر کی پر جس کی
نسبت رسکن نے لکھا ہے کہ وہ انگلستان بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے
نسائی عضو کی تمام تفصیلات منقوش ہیں"

زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں بھی یہ دستور تھا کہ جب ان کی کوئی اونٹنی مر جاتی تھی تو وہ اس کے اندام کو کاٹ کر مکان یا خیمہ کے دروازہ پر لٹکا دیتے تھے تاکہ خیر و برکت حاصل ہو، اسی طرح قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں بھی یہ رواج تھا کہ وہ کسی مردہ گائے یا گھوڑی کا اندام نہانی کاٹ کر دروازہ پر آویزاں کر دیتے تھے مگر اب اس کے بجائے گھوڑے کے نعل کا استعمال ہونے لگا ہے جو عورت کے عضو جنسی کی نشانی ہے۔

سانپ سانپ کو اکثر ممالک میں خواہشاتِ نفسانی کا مکمل مظہر سمجھا گیا ہے۔ اور کوئی مذہب دنیا کا ایسا نہیں ہے جس میں کسی صورت سے سانپ موجود نہ ہو جذباتِ شہوانی کے علاوہ سانپ کو عقل و دانش کی علامت بھی سمجھا جاتا تھا۔ اگر سانپ کی شکل اس طرح سے بنائی جائے کہ اس کی دُم اُس کے منہ میں ہو جیسے



تو یہ اس کے غیر فانی ہونے کی علامت تھی۔ اسرائیلیات میں سانپ کو جذباتِ شہوانی کی علامت قرار دیا گیا تھا اور سانپ کی شکل قدیم اقوام و ملل

میں اس معنی میں بکثرت استعمال ہوتی تھی۔ مثلاً قدیم یونانیوں میں جب طب یونانی کے ابو الآبا، اسقلیبوس اور اس کی بیٹی ہائجیہ کے بُت بنائے جاتے تھے تو ان کے سروں پر ایک سانپ کی تصویر ضرور بنائی جاتی تھی۔

ڈاکٹر وال نے لکھا ہے کہ:۔

"ہائجیہ نے ایک سانپ پال رکھا تھا جسے وہ دودھ پلایا کرتی تھی یہ سانپ مندر میں رہا کرتا تھا جس کی وہ پوجا کیا کرتی تھی، جب کوئی مریض مندر میں آکر علاج کا خواہاں ہوتا تو یہ اُسے حکم دیتی کہ مندر میں جاکر شگون لے کہ مندر کا سانپ تمہاری دی ہوئی غذا کس طرح قبول کرتا ہے۔ وہ شخص مندر میں داخل ہو جاتا تھا۔ مندر کے اندر کی یہ حالت تھی کہ خوبصورت لڑکیوں کی بڑی تعداد وہاں رہتی تھی جو اُس شخص کو ہر طرح سے لبھاتی تھیں، اور آخر کار وہ شخص کسی نہ کسی کے قبضہ میں آہی جاتا تھا پھر اگر وہ اس دعوتِ شباب سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا، تو یہ حکم لگایا جاتا کہ شفا جلد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ ہر سال مقررہ دن میں ایک دوشیزہ برہنہ حالت میں مندر کے اس مقام پر غذا لے جاتی تھی جہاں سانپ پلے ہوئے تھے، اگر سانپوں نے وہ خوراک جلد اور شوق سے کھالی تو سمجھا جاتا تھا کہ یہ سال اچھا ہے ورنہ نہیں"

سانپ کی پرستش امریکہ کی قدیم آبادی میں بھی پائی جاتی تھی، چنانچہ اوہیو میں اب تک سانپوں کا ٹیلہ موجود ہے اور قوم ازتیک میں ناگ پوجا کی یادگاریں وہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں ناگ پوجا اور ناگ پنچمی سے ہر شخص واقف ہے۔ آدم و حوا اور جنت عدن کے قصہ میں جو سانپ

کیونکر آتا ہے اس کے متعلق قدیم مسیحیین مثلاً جسٹن۔ اگسٹائین۔ نوبنوی وغیرہ کا عقیدہ یہ تھا کہ سانپ سے مقصود صرف جذبۂ شہوانی کا اظہار ہے۔ آئرلینڈ میں جب سینٹ پیٹرک نے مذہبی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے کوشش کی کہ ملک کے اندر سے سانپ نکلوا دیے جائیں، کیونکہ وہاں قوائے تخلیقیہ کا اظہار سانپوں کی مورتوں سے کیا جاتا تھا۔

قدیم چین و جاپان کی روایات میں بھی سانپ کا عنصر بڑی حد تک موجود ہے اور چین کا تو قومی نشان ہی ابھی تک اژدہا ہے۔ چونکہ سانپ کی صورت ایک طویل عضو جنسی کی طرح ہوتی ہے اس لئے اس کو ازدیاد نسل کی قوت کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور اس کی انگوٹھیاں، تعویذ اور کڑے اب تک بعض ملکوں میں شوق سے پہنے جاتے ہیں۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ بعض دیوتا سانپ کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جیوپٹر آمون اسکندر اعظم کی ماں اولمپیاس سے سانپ ہی کے بھیس میں ملا تھا اور اس مواصلت سے اسکندر پیدا ہوا۔ عہدِ قدیم میں بدکار اور مغلوب النفس عورت کو ناگن سے تشبیہہ دینے کا رواج تھا چنانچہ مصر کی ملکہ قلوپطرہ کو نیل کی ناگن کہنا اسی بنا پر تھا۔

بعض پھل اور پودے قدیم اقوام و ملل میں پھولوں اور پودوں سے بھی اعضائے جنسی اور جذباتِ شہوانی کو تعبیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یورپ میں ابھی تک سنترہ کے پھول کو شادیوں میں صرف اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اثر سے دلھن بہت زیادہ صاحبِ اولاد ہو۔ اسی طرح انگور

جذباتِ شہوانی کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے اور شراب مقوی و مہیج چیز ہے۔

آشور کے دیوتا بعل سے شمشاد و صنوبر کا پھل منسوب تھا اور انجیر کو بھی عضوِ جنسی سے تشبیہ دیتے تھے کیونکہ اس کا پتّا سہ شاخہ ہوتا ہے جو تر سول سے مشابہت رکھتا ہے جو ممالک سواحل بحیرۂ روم پر واقع ہیں وہاں لوگوں میں انجیر کے درخت کی پوجا کی جاتی ہے۔

مصر قدیم اور دیگر ممالک مشرقی میں کنول اور بعض دوسرے پھولوں کو ہمیشہ بہ نظرِ احترام دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ پین نائٹ لکھتے ہیں کہ:۔

"کنول یا نیلوفر کو شمالی نصف کرۂ ارض کے جملہ ممالک میں مذہبی احترام کے ساتھ دیکھا جاتا تھا اور ہندوستان اور چین میں بھی یہی حال ہے۔ تاتاریوں، جاپانیوں اور ہندوؤں کی تمام مورتیاں کنول کے پھول پر قائم کی جاتی ہیں اور اس پھول کو ہندوستان، تبت اور چین میں اب بھی متبرک سمجھا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کا کنول کے پھول سے پیدا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پھول عورت کے مخصوص حصۂ جسم کا مظہر ہے لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ کنول کا پھول وشنو کی ناف سے پیدا ہوا تو خیال گزرتا ہے کہ یہ مردانہ عضوِ جنسی کی علامت ہے"

درخت: بلحاظ جمالیات دُنیا میں بعض درخت نہایت خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں ان کے سیدھے سڈول تنے، گنجان شاخیں اور پتے، خوبصورت رنگین اور خوشبودار پھول، لذیذ اور خوبصورت پھل، انسان کا دل لبھائے بغیر

نہیں ٹوٹتے اور بہت سے درخت سدا بہار ہوتے ہیں، جنھیں دیکھ کر بقائے ابدی کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ بعض درختوں پر ہر سال خزاں آتی ہے ہر سال نئے پھول، پتے اور پھل نکلتے ہیں اور ہمیشہ یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، اس لیے قدما کے نزدیک درخت ابدیت کی نشانی تھی۔

آریائی و سامی عقائد میں تین طلسمی درخت پائے جاتے ہیں۔ شجرۃ الحیات شجرۃ العلم۔ شجرۃ الجنۃ۔ ڈاکٹر ڈی الویلا لکھتے ہیں کہ ان عقائد کے مطابق ان درختوں کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:۔

> "شجرۃ الحیات سے ایک قسم کا رس پیدا ہوتا تھا جس کے پینے سے دوامی شباب حاصل ہوتا تھا۔ شجرۃ العلم میں یہ کمال تھا کہ وہ غیب کی باتیں بتا دیتا تھا۔ شجرۃ الجنۃ کا تعلق ہوش سن و متو اجرام سماوی سے تھا۔"

قدیم ایرانیوں میں ہوما یا ہوم نامی ایک درخت ہوتا تھا۔ جس کا رس ابدی زندگی بخش دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک درخت قدیم ہندوؤں میں تھا جسے سوما یا سوم کہتے تھے، اس کا رس بھی آب حیات تھا۔ یہ درخت گویا شجرۃ الحیات تھا۔

چین والوں کے نزدیک سات طلسمی درخت تھے جن میں ایک شجرۃ الحیاۃ بھی تھا، یہ ساتواں درخت کوہستان کون لون کے اطراف میں پیدا ہوتے تھے۔ اہل چین کے نزدیک یہ کوہستان بہشت ارضی تھا۔ جہاں ساتی: انگ مو دیوی کی حکومت تھی، ۔ شجرۃ الحیوۃ شش ہزار ... بلند

تھا اور ایک ہزار ہاتھ اس کے تنہ کا دور تھا، یہ جڑ سے چوٹی تک نیلم اور زمرد کا بنا ہوا تھا۔ اس پر تین ہزار سال میں ایک مرتبہ پھل آتا تھا۔ تاؤ مذہب والوں کے نزدیک یہ درخت شفتالو کا ہے اور اس مذہب والوں کے نزدیک شادی بیاہ کا درخت ہے۔

ملک آشوریہ میں بھی ایک شجرۃ الحیٰوۃ مانا جاتا تھا۔ پروفیسر لیارڈ کا خیال ہے کہ یہ درخت ایستار دیوی کی پرستش سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ درخت اور اس کی پوجا کا رواج ممالکِ عرب، وسط ایشیا، ایشیاءِ کوچک اور ایران میں پہونچا۔

ممالکِ یورپ میں شاہ بلوط کے درخت کو متبرک سمجھا جاتا تھا۔ جس کا باعث غالباً اُس کی مضبوطی اور پائیداری ہوگا، علاوہ ازیں اس کے پھل کی صورت بھی ایسی ہوتی ہے گویا مردانہ و زنانہ اعضاء جنسی کا اتصال ہے۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک شاہ بلوط کا درخت شجرۃ الحیٰوۃ سمجھا جاتا تھا۔ انگلستان کی ڈرونڈ اقوام اس درخت کو بہت مقدس خیال کرتی تھیں۔ شاہ بلوط کے جنگلوں ہی میں یہ لوگ اپنی پوجا پاٹ کی جگہ بناتے تھے۔ یہی تقدس صنوبر کے درخت کو بھی حاصل تھا جو فصل بہار کے دیوتاؤں آتیس اور دیونسوس وغیرہ سے منسوب تھا۔ اس کا پھل بھی شاہ بلوط کے پھل سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں برگد اور پیپل کے درخت متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی مندر ایسا نہ ہوگا جہاں برگد یا پیپل کا درخت نہ ہو۔ ان کی شاخوں میں چونکہ دودھ نکلتا ہے اس لیئے عورتیں ان درختوں کو خاص طور پر پوجتی ہیں۔

بَیل جو قومیں سورج کو پوجتی تھیں یا پوجتی ہیں ان کے معتقدات میں بَیل کو خاص تقدس حاصل ہے۔ بَیل کو یہ لوگ افزائش نسل کا مظہر سمجھتی تھیں اور اب بھی اس کی عزت کا سبب یہی خیال ہے۔ منطقۃ البروج میں بھی ایک بُرج بَیل کی شکل کا فرض کیا گیا ہے جسے انگریزی میں (Taurus) کہتے ہیں۔ اس کا موسم فصل بہار میں اپریل سے ۲۰ر مئی تک ہوتا ہے اور یہی زمانہ جوش شہوانی کا ہے۔

بَیل سے قدیم مذاہب کو خاص تعلق رہا ہے۔ مثلاً قدیم مصریوں کے ہاں ایپس بَیل تھا جسے خداوند اوسیریز کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں میں بھی گوسالہ سامری کی روایت بَیل کا تقدس ظاہر کرتی ہے موجود ہے۔ آشوریوں کے مندروں میں بھی پَردار بَیل بنائے جاتے تھے، اور ہندوؤں میں مہادیو کا بَیل نندی اب تک موجود ہے۔

آشوریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی نسل بَیل ہی سے چلی ہے۔ جاپان میں سانڈ بیلوں کو بہ نظر احترام دیکھا جاتا ہے، اور ہندوستان میں تو سانڈ بیل کو "راجہ" کہتے ہیں۔

قدیم مصریوں میں قوائے مردانہ کو اوسیریز کہتے تھے اور اوسیریز کا اوتار ایپس بیل کو سمجھا جاتا تھا۔ اوسیریز کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ ایک بچھیا کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے جسے چاند کی شعاع یا بجلی کی چمک نے حاملہ کر دیا تھا۔

جب ایپس بیل مر جاتا تھا تو پجاری لوگ ملک بھر میں تلاش کر کے دوسرے بیل کا انتخاب کر لیتے تھے۔ شناخت کی چند خاص علامتیں ہوتی تھیں یعنی

بیل کا رنگ سیاہ ہونا چاہیئے، پیشانی پر سفید رنگ کا ایک مثلثی ٹیکا (علامت مرد) ہونا چاہیے۔ پہلو میں ایک سفید رنگ کا ہلال (علامت زن) ہونا چاہیے اور زبان کے نیچے کن سلائی کی وضع کی ایک رسولی ہونی چاہیے۔

جب ایپس بیل مرجاتا تھا تو یہ یقین کیا جاتا تھا کہ اس نے اپنا آسمانی چولا اختیار کر لیا ہے یعنی اوسیریز بن گیا ہے تو اس کے بعد ایپس کی لاش کو حنوط کر کے بہت کچھ اظہار رنج و غم کے بعد ایک مقبرہ میں رکھ دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں دوسرا ایپس نہایت شان و شوکت کے ساتھ لایا جاتا تھا۔ عرصہ تک خاص خاص رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اوّل چالیس روز تک صرف عورتیں ہی اُسے دیکھ سکتی تھیں اور وہی اس کی خدمت اور پرورش کرتی تھیں۔ یہ حرکتیں ممفیس میں بہت ہوتی تھیں۔

بکرا مصر کی عورتیں صرف ایپس سانڈ ہی سے مالوف نہ تھیں بلکہ مندیس کے مقدس بکرے کی بھی عزت کرتی تھیں۔ توریت کتاب احبار میں اس رواج کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے:۔

"نہ تو کسی کے جانور کے ساتھ سوئے گا تاکہ خود کو اس کے ساتھ ناپاک کرے اور نہ کوئی عورت کسی جانور کے نیچے لیٹے گی یہ بات خراب ہے۔"

قدیم آشوریوں میں بھی بکرے کو بنظر احترام دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ اس جانور کو قوت نفسانی کا مجسمہ سمجھتے تھے اور عورتیں معبدوں میں نہایت حیا سوز حرکات کی مرتکب ہوتی تھیں۔

گائے گائے کو قدیم اقوام میں دھرتی ماتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا جس طرح

بیل مرد کی علامت ہے، اسی طرح گائے عورت کی نشانی ہے۔ گائے کا احترام مشرق کے تقریباً تمام ممالک میں کیا جاتا تھا۔ مصر میں گائے کو ہاتھور، نوت، آئسیس، نفتیس اور دیگر معبودوں کی قدرت کا مظہر خیال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس کی پوجا اب تک ہوتی ہے۔

کچھوا قدیم اقوام میں کچھوا بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا، کچھوے کی مشابہت جو عضوِ جنسی سے ہے وہ دراصل اس کی گردن میں ہے۔ قدیم یونانیوں میں اسی مشابہت کی وجہ سے کچھوے کو عشق و محبت کی دیوی وینس سے منسوب کیا جاتا تھا۔ قدیم یونانی فنونِ لطیفہ میں بعض اوقات وینس دیوی کو کچھوے کی پشت پر دکھایا جاتا ہے۔ قدیم مصریوں میں بھی کچھوے کو افزائشِ نسل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم ہندوؤں، جاپانیوں اور امریکیوں میں کچھوے کا دخل تکوینِ کائنات میں بھی مانا جاتا ہے۔ مثلاً ہندو روایات میں ہاتھی کو جس کی پشت پر دنیا قائم ہے ایک کچھوے کی پیٹھ پر کھڑا دکھایا جاتا ہے اور جاپانیوں میں کچھوے کی پشت پر دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا ہے جس کا مرکز ایک پہاڑ ہے۔

امریکہ کی قدیم سینکا قوم کا یہ اعتقاد تھا کہ "مادرِ ننک" کا جب ہبوط ہوا تو وہ ایک آبشار پر گری۔ آبشار نے اس کو ایک کچھوے کی پشت پر سوار کر دیا۔ امریکن قوم دلاویر میں ایک روایت ہے کہ "دنیا کا مرکزی درخت" ایک کچھوے کی پشت سے اگا تھا۔ چینیوں کی روایاتِ قدیمہ میں بھی کچھوے کو بہت کچھ دخل ہے۔

بلی مصر قدیم میں بلی کی بھی پوجا ہوتی تھی اور اُسے سورج کا نمائندہ خیال کیا جاتا تھا کیونکہ بلی کی آنکھوں میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کا رنگ سورج کے عروج و زوال کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ جانور عادتاً شب گرد ہے اور چوری چھپے اپنا کام

کرجاتا ہے اور چونکہ عشق و محبت کے راز و نیاز رات ہی کے وقت ہوتے ہیں، اس لئے اس جانور کو جذباتِ شہوانی کا مظہر قرار دیا گیا۔

مصریوں میں باست ایک گربہ نما دیوی تھی جس کے رتھ میں بلیاں جوتی جاتی تھیں جب کبھی کوئی بلی مرتی تھی تو اس کی لاش کو حنوط کر کے ایک بکس میں محفوظ رکھ دیا جاتا تھا اور جو شخص کسی بلی کو مار ڈالتا تھا اُسے سزائے موت دی جاتی تھی۔

شیر جن اقوام میں سورج کی پرستش ہوتی تھی ان میں شیر کو بھی بنظر احترام دیکھا جاتا تھا اور اس کا سبب وہی ہے جو بلی کے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں شیر کو سورج کی حرارت سے منسوب کیا جاتا تھا۔ شیر کا قد و قامت چونکہ شاندار ہوتا ہے اس کی رفتار میں ایک خاص دلفریبی ہوتی ہے اور قوتِ جسمانی کے لحاظ سے وہ تمام حیوانات پر فوقیت رکھتا ہے، اس لیے قدماء نے اُسے طاقت مردمی کا مجسمہ قرار دیا۔ اسی لیے قدیم مندروں کے دروازوں پر شیروں کی صورت تعمیر کی جاتی تھی اور ہندوستان کے مندروں میں اب بھی شیروں کے مجسمے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ابوالہول سب سے زیادہ عجیب غریب اور دلچسپ چیز مصری ابوالہول ہے اس عجیب الخلقت جانور کا سر اور چہرہ تو ایک خوبصورت عورت کا ہے لیکن باقی تمام جسم شیر کا ہے۔ گویا اس میں زنانہ اور مردانہ دونوں قوتیں موجود ہیں۔ ابوالہول کے بُت میں ایک دلچسپ استعارہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسی چیز نہیں ہے جس کے پھندے میں پھنس کر کوئی جان بچالے جائے، کیونکہ وہ اپنی جمیل صورت سے فریفتہ کر کے انسان کو شیر کی طرح پھاڑ ڈالتی ہے۔

فحاشی پر عمومی تبصرہ

محافل نشاط جن حضرات نے ارتقاء تہذیب و تمدن پر نظر ڈالی ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ جوں جوں انسان کا روایتی اخلاق، احساس، مذہب، تہذیب اور سوسائٹی کا آئین، ترقی پاتا گیا اسی قدر انسان میں جذبہ رہبانیت بڑھتا گیا۔ لیکن جب اسی کا ردِ عمل ہوا تو پھر اسی مذہب سے رواج فحاشی کا کام لیا گیا اور محافل عیش و نشاط پر تقدس کا رنگ چڑھا کر ان کو جائز و مباح قرار دیا گیا۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی محافل شبینہ کو اورجی (Orgies) کہتے ہیں۔

لفظ "اورجی" درحقیقت یونانی زبان کے لفظ "اورجیا" (Orgeia) سے مشتق ہے جس سے مراد قدیم یونانی کا وہ جشن ہے جو شراب کے دیوتا کی یادگار میں منایا جاتا تھا۔ اس جشن میں اس دیوتا کی سوانح حیات کا کوئی واقعہ منتخب کر کے بطور تمثیل دکھایا جاتا تھا اور نوشا نوش کے ساتھ ایسا زبردست ناچ ہوتا تھا کہ لوگ آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور اپنی خواہشات نفسانی بھی پوری کر لیتے تھے۔

اسی طرح ہندوستان میں شری کرشن جی مہاراج اور برج کی گوپیوں کی رنگ رلیاں بطور تمثیل عموماً دکھائی جاتی ہیں جن کو رَس کہتے ہیں۔ اس میں

بھنگ، چرس، گانجہ کا استعمال ہوتا ہے اور ناچ گانے کی آزاد محفلیں برپا کی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان تماشوں کا اصل مقصد تعمیر سیرت تھا لیکن بعد کو خواہشاتِ نفسانی کا عنصر بھی ان میں شامل کر دیا گیا۔

اسی طرح مسیحیت میں بھی یہ رہس لیلا پائی جاتی تھی جس میں حضرت مسیح یا دیگر اکابرِ مذہب کے سوانح حیات میں سے کوئی واقعہ چن کر بطور تمثیل دکھاتے تھے۔ مسیحی دنیا میں یہ محافل عیش و نشاط عموماً خانقاہوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں بڑے راہبان مرتاض اور بڑی بڑی پاکدامن مسیح کی مُرلیاں (Nuns) شریک ہوا کرتی تھیں۔ چنگ و ارغنوں کے ساتھ دورِ بادۂ ناب چلتا تھا، اور خوب خوب خوش فعلیاں ہوتی تھیں یہ سب باتیں اُس زمانہ کی "باقیات" سے تھیں جب تمام یورپ شرک و بت پرستی کی تاریکی میں مبتلا تھا۔

عید الحمقاء

۴۴۳ء میں بمقام "ہینالٹ" کلیسائے مقدس کے علماء کا اجلاس ہوا، جسے سنا ڈ کہتے تھے، اس میں یہ بات پیش کی گئی کہ "فروری" میں جو "ادرجی" ہوتی ہے اسے بند کیا جائے کیونکہ وہ زمانہ بت پرستی کی یادگار ہے لیکن یہی "بت پرستوں کی عید" کلیسائے مسیحی کی مقدس ترین عید "کارنوال" میں شامل کر لی گئی جو مسیحی تہوار لینٹ کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس تہوار کے شروع ہونے سے قبل جو منگل واقع ہوتا تھا اُس دن اور اُس کے بعد والے اتوار کو عیسائیوں کی بڑی بڑی محافل عیش و نشاط برپا ہوتی تھیں، جن میں ہر طبقہ کے لوگ شرکت کرتے تھے اور آزادی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بعض آدمی خوش غلاف ہو کر چلتے پھرتے تھے بعض جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتے تھے اور بعض

بالکل حیوان مطلق بن جاتے تھے۔

بارھویں صدی میں یورپ میں عموماً اور فرانس میں خصوصاً بسلسلۂ عید نوروز ایک عید الحمقا، قایم ہوئی جسے انگریزی میں (Feast of Fools) کہتے تھے۔ اس تقریب میں تمام مسیحی دنیا حد درجہ پست مستیوں کا اظہار کیا کرتی تھی جس میں سب سے زیادہ حصہ مقدس پادری لیتے تھے۔

قدیم یونانیوں و رومیوں کا خیال قدیم یونانیوں اور رومیوں نے اس خیال کو اکثر جگہ ظاہر کیا ہے کہ مسلسل محنت اور زہد و اتقاء کے بعد انسان کو کبھی کبھی "غم غلط" کرنا چاہیئے۔ چنانچہ نٹشے (Nietzsche) نے قدیم یونانیوں کی نسبت بالکل صحیح کہا ہے کہ :-

"وہ لوگ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو پوری طرح تسلیم کرتے تھے خواہ ان میں بعض کتنے ہی ادنیٰ درجہ کے کیوں نہ ہوں اور اسی لیے وہ ایسا انتظام کرلیا کرتے تھے کہ کسی خاص دن، خاص رسوم کے ساتھ جذبات کو آزاد چھوڑ دیتے۔"

حکیم (Seneca) نے جو رومی معلمین اخلاق میں سب سے زیادہ صاحبِ اثر شخص تھا یہاں تک سفارش کی ہے کہ انسان کو کبھی کبھی بدمست بھی ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ حکیم صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ :-

"کبھی کبھی ہمیں اتنی شراب پی لینی چاہیئے کہ مرد پا کا ہوش نہ رہے، کیونکہ شراب ہمارے آلام و افکار کو دھو دیتی ہے اور ہم کو عمیق ترین گہرائیوں سے ابھار کر مسرت و شادمانی کی سطح پر لے آتی ہے۔ شراب کے

موجد کا نام لائبر[1] (Liber) ہے کیونکہ وہ انسان کی روح کو فکروں کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ غلامی کی زنجیریں توڑ دیتا ہے۔ نئی روح پیدا کرتا ہے اور ہم کو تمام کاموں کے لئے پوری طرح دلیر بنا دیتا ہے۔"

روم والے بھی یونانیوں کے شاگرد تھے اور ان لوگوں نے بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جذبات و خواہشات کو کبھی کبھی پورے ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے بھی اپنے یہاں بعض ایسے تہوار قائم کر لئے تھے جن میں انسان کی خواہشاتِ نفسانی کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وحشی اقوام کی رنگ رلیاں دنیا کی کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی وحشی و پست ہو ایسی نہیں جس میں وقتاً فوقتاً یا مقررہ اوقات پر رنگ رلیاں منانے کی ضرورت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ اسپنسر اور گلن نے اپنی کتاب "وسطی آسٹریلیا کی شمالی قومیں" کے باب دوازدہم میں لکھا ہے کہ:۔

"وسطی آسٹریلیا کی واڑامونگا قوم میں ایک تہوار ہوتا ہے، جسے وہ لوگ نانتھ اگورا کہتے ہیں۔ اس تہوار میں لوگ آگ سے کھیلتے ہیں اور بعض عجیب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ یہ تہوار بالکل ایسا ہی ہے جیسا رومیوں میں "سیٹرنیلیا" ہوتا تھا یا ہندوؤں میں ہولی کی دلہنڈی ہوتی ہے۔ اس میں تہذیب و اخلاق کے تمام آئین و قوانین بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی اور لوگوں کو نوشا نوش اور کوشا کوش کی پوری اجازت حاصل ہوتی ہے۔"

---

[1] اسی سے انگریزی لفظ (Libertine) بنا ہے جس کے معنی عیاش و فحاش کے ہیں۔

بل ٹاؤٹ سنے "جرنل ایتھرو پولاجیکل انسٹی ٹیوٹ" (جولائی و دسمبر ۱۹۰۲ء) کے صفحہ ۳۱۹ میں لکھا ہے کہ :-

"برطانوی کولمبیا کی امریکی قوم سالش بیان کرتی ہے کہ یورپینوں کے آنے سے قبل ان کے آباؤ اجداد ہفتہ میں ایک دن یوم السبت[1] یعنی آرام و آسائش کا دن منایا کرتے تھے۔ اس روز وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے تھے اور صبح سے لے کر دوپہر تک مذہبی ناچ رنگ میں مشغول رہتے تھے۔"

اے۔ ای کرانی سنے اپنی کتاب "پراسرار گلاب" (Mystic Rose) میں لکھا ہے کہ :-

"مختلف اقوام میں تمتع لینے کے لئے جو دن مخصوص کر دیئے جاتے تھے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ انسان پرانا بوجھ اتار کے ہلکا ہو جائے اور دنیا میں از سر نو کام کرنے لگے۔ بعض ملکوں میں لوگ یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ایسے تہواروں پر اپنی بیویاں تک بدل لیتے ہیں۔ اس کا مقصد شادی بیاہ نہیں ہوتا بلکہ قانون ازدواج کو توڑنا ہوتا ہے۔ اور یہ تبدیلی دوامی نہیں

---

[1] یوم السبت، آرام و آسائش کا دن۔ دنیا کی تقریباً تمام متمدن و مہذب اقوام میں ایک دن ہفتہ کے اندر یوم السبت مقرر رہا تھا۔ مثلاً یہودیوں میں ہفتہ، عیسائیوں میں اتوار، قدیم یونانیوں میں دوشنبہ، قدیم ایرانیوں میں سہ شنبہ، آسٹریلیا والوں میں چہارشنبہ، مصریوں میں جمعرات اور مسلمانوں میں جمعہ۔ یوم السبت کو عیش و عشرت سے خاص تعلق ہے۔ دکن کے مسلمانوں میں شادی کے بعد جب پہلا جمعہ آتا ہے تو دلہن جمعہ نہانے اپنے میکے جاتی ہے۔ گویا یوم السبت کی رات عیش راتوں کی خاص شب ہے۔ عیسائیوں میں بھی سنیچر کی رات کو "گولڈن نائٹ" یعنی سنہری رات کہتے ہیں۔

بلکہ عارضی ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر حرام وحلال کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ زندگی از سر نو شروع کی جائے۔"

مندرجہ بالا واقعات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ انسان نے تقاضائے فطرت سے مجبور ہو کر اپنی خواہشات وجذبات کی رعایت کس کس طریق سے کی اور اپنی عیش رانیوں پر مذہبی رنگ چڑھا کر کس طرح اسے جائز ومباح کر لیا۔

مگر اب "مقدس عیش رانیوں" کی جگہ "مہذب عیش رانیوں نے لے لی ہے۔ تھیٹر، سینما، ناچ گھر، خرابات، قمار خانے وغیرہ سب اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں، مجلسی ایک باقاعدہ ادارہ بن گیا ہے۔ کھیل تماشوں میں زن ومرد شریک ہو کر ہیجان انگیز تصویریں اور تماشے دیکھتے ہیں۔ محافل شبینہ (Night Clubs) جگہ جگہ قائم ہیں اور اس لیے اب "قدیم" اور "جیا" کی کسی شخص کو ضرورت نہیں رہی۔

عصمت فروشی وحشی اقوام میں

باقاعدہ اور پیشہ ور عصمت فروشی کی ابتدا معلوم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ابتدائی قسم کی عصمت فروشی جو پیشہ کی صورت نہیں رکھتی وحشی یا نیم وحشی اقوام وملل میں بھی اکثر دیکھی گئی ہے، مثلاً کوئی مرد کسی عورت کو کوئی چیز بطور تحفہ دیتا ہے تاکہ وہ اس کی معیت کا لطف حاصل کرے۔ ہر چند یہ ایک قسم کی بدکاری ہے مگر عصمت فروشی کے درجہ تک نہیں پہنچتی، کیونکہ وہ تحفہ یا نذرانہ کوئی اجرت نہیں سمجھی جاتی بلکہ عارضی تعلقات کی ابتدا شمار کی جاتی ہے اور وہ عورت اس مرد کو متمتع کرنے کے بعد بھی اپنی مجلسی وقعت ومنزلت کم وبیش برقرار رکھتی ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے لیے معاش کے تمام دروازے بند ہو جائیں اور وہ پیشہ اختیار

کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ جب کپتان کوک کا جہاز جزائر نیوزی لینڈ پہنچا تو جہاز راں جو عرصۂ دراز سے مجرد تھے، یہ معلوم کرکے خوش ہوتے کہ جزائر کی عورتیں ان کی دسترس سے باہر نہیں ہیں، اور اُن کے شرائط بالکل ویسے ہی ہیں جیسے مہذب لوگوں میں شادی کے ہوتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے عارضی معاہدۂ ازدواج میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ ضرورت صرف اس قدر تھی کہ عورت کے سرپرست سے اجازت حاصل کرلی جائے اور تکمیل معاہدہ کے بعد اس "عروس یک شبہ" (Juliet of Night) کے ساتھ ویسا ہی باعزّت برتاؤ کیا جائے جیسا مہذب متمدن اقوام میں اپنی بیویوں سے کیا جاتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ بحر الکاہل کے بعض جزائر میں کبھی کبھی عورتیں پیشہ اختیار کرلیتی ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ بدچلنی کی وجہ سے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان عورتوں سے نفرت و حقارت نہیں کی جاتی، بلکہ اگر وہ اپنے پیشہ میں دولت جمع کرلیتی ہیں تو بعض معزز آدمی اُن سے نکاح کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے سابق چال چلن یا پیشہ کی نسبت کسی قسم کا اشارہ کرنا بھی بُرا سمجھا جاتا ہے۔

اگرپست و وحشی اقوام میں اوّل اوّل ایسی عورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، تو بسا اوقات انھیں ذلت و حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس کا باعث یہ ہے کہ ان میں بھی ابھی تک پاک دامنی اور حفظ عصمت کا خیال پیدا نہیں ہوا۔

مثلاً ڈاکٹر شور تز نے بحوالہ ایک عرب جغرافیہ داں کے یورپ کی سلافی قوم کی نسبت حسب ذیل دلچسپ معلومات حاصل کی ہیں :-

"اگر اس قوم میں کوئی جوان لڑکی کسی مرد پر عاشق ہو جاتی ہے تو وہ اس کے پاس جاکر اپنی خواہش پوری کر لیتی ہے اور اس کو مطلق برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ برعکس اس کے اگر شادی کے بعد کوئی مرد اپنی بیوی کی دوشیزگی کو ملامت پاتا ہے تو وہ اسے گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ یا اگر نہیں نکالتا تو بہت ذلت کے ساتھ رکھتا ہے"

"بعض قوموں میں نوجوان لڑکیاں اُن تحائف کو جو اُن کے عشاق پیش کرتے ہیں نہایت فخر کے ساتھ لیتی ہیں اور جب اُن کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اُن تحائف کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ جس قدر ایسے تحائف زیادہ ہوں گے اتنی ہی اُس کی قدر و منزلت شوہر کے گھر میں زیادہ ہوگی"

سلافی قوم کے مندرجہ بالا رواج کی تصدیق ڈاکٹر کراوش نے بھی کی ہے:-

"وحشی اقوام میں شادی سے قبل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں تعلقات شہوانی بہت آزادی کے ساتھ ہوتے ہیں اور بعض خاص تہواروں اور تقریبوں میں کوئی روک ٹوک ہوتی ہی نہیں۔ لیکن ان وحشیوں میں پیشہ ور کسبیاں ہرگز نہیں ہوتیں۔ اگر فی زمانہ وحشی عورتیں نفس فروشی کرتی ہیں یا ان کے شوہر انہیں فروخت کر ڈالتے ہیں، تو یہ صرف جدید تہذیب و تمدن کا اثر ہے"

مقدس مباشرت ڈاکٹر شورٹز کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جس قوم میں نوجوانوں کے آزادانہ اختلاط وارتباط میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی اور اس کے ساتھ جلد شادی کرنے کا بھی کوئی انتظام نہ ہوگا اُس قوم میں عصمت فروشی پیدا ہوگی اور لذتِ نفس حاصل کرنے کے مختلف طریقے پیدا ہوجائیں گے۔

محققین نے جہاں تک تحقیق کی ہے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس فعل کی ابتدا مذہب کے آڑ میں ہوئی۔ پانچویں صدی قبل مسیح کی کیفیت یونان کے مشہور معروف مؤرخ و سیاح ہیروڈوٹس نے جو کچھ بیان کی ہے اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

اس بیان کی تصدیق ان لوگوں نے بھی کی ہے جنھوں نے بابلی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ بابلی آثار قدیمہ سے ایک لوح برآمد ہوئی ہے جس پر ایک رزمیہ نظم بنام جلجاش کندہ ہے۔ پروفیسر ماریس جسٹراؤ نے اس لوح کا مطالعہ کر کے بیان کیا ہے کہ شہر اروک یا ایرخ میں اشتار دیوی کا جو مندر تھا اس میں کثرت سے عورتیں موجود رہتی تھیں۔

اسی قسم کا رواج ایشیا کے دیگر حصص، شمالی افریقہ[1]، مغربی افریقہ، جزیرہ قبرص

---

[1] اے۔ بی۔ ایلس (A. B. Ellis) نے اپنی کتاب (The Ewe Speaking People of S. Africa) میں لکھا ہے کہ جو لڑکیاں کسی دیوتا کے نام سے منسوب کر دی جاتی تھیں وہ جوان ہو کر "پجارنی عورتیں" بن جاتی تھیں۔ اسی طرح ڈبلیو۔ جی۔ سمر (W. G. Summer) نے اپنی کتاب (Folk Ways) باب ۱۶ میں بہت سے واقعات مذہبی عصمت فروشی کے لکھے ہیں۔

بحر روم کے دیگر جزائر اور مصر[۵] و یونان وغیرہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ یونان کے شہر گورنتھ کے قلعہ میں آفرودتیہ دیوی کا ایک مندر تھا جس میں ایک ہزار سے زیادہ "مرلیاں" یا "مقدس اچھوتیاں" مندر کی خدمت کے لیے رہا کرتی تھیں اور بقول مؤرخ استرابوجن لوگوں کو دیوی کے مندر میں کوئی منت ماننا ہوتی تھی وہ ان عورتوں کے تمام نخرے برداشت کرتے تھے اور لطف یہ ہے کہ لوگ ان کو عام طور پر بہت نیک اور پارسا بھی سمجھتے تھے اور ہر قومی مصیبت کے وقت ان سے دُعائیں کراتے تھے۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قبل تاریخ سے جو آزادی چلی آتی تھی اسے مذہب کی آڑ میں قائم رکھا گیا اور پھر عوام کے دلوں میں رفتہ رفتہ یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ مرد عورت کا مندروں کے اندر تعلقات شہوانی قائم رکھنا خود دیوتا یا دیوی کی خدمت اور ان کی خوشنودیٔ مزاج کا باعث ہے۔ عورتیں چونکہ سریع الاعتقاد ہوتی ہیں، اس لئے ان میں عام طور پر یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ دیوتا یا دیوی کے استھان میں پجاریوں یا اور مردوں سے اختلاط رکھنا ثواب کا کام ہے۔ یہی باعث تھا کہ دنیا کے تمام وحشی ممالک میں عموماً اور مغربی ایشیا میں خصوصاً مذہبی عمارتوں کے اندر "مقدس

---

[۵] فلنڈرس پطری (*Flinder Petrie*) نے اپنی کتاب "قصص المصر" میں لکھا ہے کہ قدیم مصریوں میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی عورت کسی مرد پر عاشق ہو جاتی تھی تو وہ اُسے اپنے کپڑے بھیج کر "دعوت" دیتی تھی۔ خواہ وہ زن شوہر دار ہو یا کنواری۔ رفتہ رفتہ یہ رواج موقوف کر دیا گیا، لیکن بایں ہمہ آمن (*Amen*) دیوتا کی داسیوں نے دیوتا کے زیر سایہ اپنا یہ طریقہ قائم رکھا۔

عصمت فروشی" کا سلسلہ جاری تھا۔

ڈاکٹر ایف۔ ایس۔ کراؤشس[1] نے لکھا ہے کہ "بروچ کے زمانہ میں جو ہیروڈوٹس کے بعد گزرا ہے مذہبی فحاشی درختوں کے نیچے ہوا کرتی تھی"۔ اور ڈاکٹر جے۔ جی۔ فریزر نے اپنی مشہور کتاب (Adonis Attis Osiris) میں اس کا عقیدہ اور اس کے اسباب حسب ذیل بیان کئے ہیں:۔

"جملہ حالات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک "مہا دیوی ماتا" تھی۔ جو قدرت کے تمام قوائے تخلیقیہ کی حامل تھی، اس کی پرستش مختلف اقوام میں مختلف ناموں سے کی جاتی تھی اور تمام مغربی ایشیاء کی مختلف اقوام میں اس دیوی کے متعلق قریب قریب یکساں روایات اور یکساں رسوم پرستش جاری تھے۔ ان قدیم روایات میں اس دیوی کا تعلق کسی خاص عاشق یا متعدد عشاق سے بتایا جاتا تھا۔ یہ عاشق یا عشاق عموماً دیوتا، مگر فانی ہوتے تھے۔ وہ دیوی ہر سال ان عشاق سے مواصلت کرتی تھی اور ان کی یہ مواصلت انسانی و حیوانی نسل اور نباتاتی فصل کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ بعد میں ان آسمانی عاشق و معشوق کی مواصلت کا کھیل کرۂ دنیا میں کھیلا جانے لگا۔ یعنی لوگ دیوی کے استھان میں جا کر خود حرام کاریاں کرنے لگے اور عقیدہ وہی تھا کہ ان کی ان سیہ کاریوں سے اولاد پیدا ہوگی، مویشیوں کی نسل بڑھے گی اور فصل خوب پیدا ہوگی اور مدت دراز کے بعد جب

(1) Sir F. S. Krauss "(Beuchl Afansir Bungals Kulthan Dlungs) Anthro Phytria Vol. III P. 20

لوگوں کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور انفرادی شادی و نکاح کا رواج بڑھنے لگا اور اشتراک فی النسواں کا طریقہ برا سمجھا جانے لگا تو عورت کا عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی کسی غیر مرد سے اختلاط مذموم شمار ہونے لگا، بالآخر لوگوں نے اس فحاشی سے اپنی عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بہت سے انسدادی طریقے اختیار کئے جن سے وہ عملی کیفیت تو جاتی رہی لیکن عقیدہ بدستور قائم رہا اور عورتیں مندروں میں جا کر فرضی رسمیں مواصلت کی ادا کرتی رہیں، مگر چونکہ پرانی عادتیں بہت مشکل سے چھوٹتی ہیں اور مردوں کو رنگ رلیوں کا چسکا پڑا ہوا تھا، اس لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ عورتوں کی ایک تعداد پرانے طریقے پر مقدس عصمت فروشی کرتی رہے۔ چنانچہ لڑکیاں وقتاً فوقتاً دیوتا دیوی کے نام سے منسوب کر کے مندروں پر چڑھائی جاتی رہیں جو زندگی بھر بالجبر عمر کے لئے فحاشی میں مصروف رہتی تھیں۔ اور چونکہ یہ عورتیں دیوتا دیوی کے نام سے منسوب ہوتی تھیں، اس لیے ان میں ایک قسم کا مذہبی رنگ پیدا ہو گیا۔

مختلف ممالک میں ان عورتوں کے مختلف نام ہوتے تھے۔ یونان میں "ہائروڈیول" (Haerodules) کہلاتی تھیں۔ روما میں ان کا نام "وسٹا کی کنواریاں" (Vastal Virgins) تھا۔ بابل میں یہ "کادشتو" (Kadishtu) کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ جنوبی ہند میں یہ دوشیزگانِ مقدس "دیوداسیاں اور مرلیاں" کہلائیں اور مسیحی دنیا میں "نن" (Nun) ہو گئیں۔"

جب امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مذہبی رہنماؤں کا اثر زیادہ قوی ہو گیا

تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ لوگ عام طور پر اس سے متنفر ہوتے جاتے ہیں یہ تبلیغ شروع کی کہ جو شخص دیوتا دیوی کے استھان پر کوئی چیز چڑھاتا ہے خواہ وہ عصمت و عفت ہی کیوں نہ ہو تو اس کو بہت نفع ہوتا ہے اور عورت کی قوت "بچہ کشی" بہت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر ویسٹر مارک (Wester Marck) نے بھی یہی توجیہ کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"جو مرد مندر میں کسی عورت کی گود میں سکہ پھینکتا تھا وہ یہ الفاظ کہتا تھا

"دیوی تمھیں برکت دے اور تم پر مہربان ہو"

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ وہ بانجھ نہ رہے اور دیوی اُسے خوب اولاد دے۔

اہل بابل کی اسی رسم کے متعلق فارنیل کا یہ نظریہ ہے کہ بعض قدیم اقوام میں یہ عقیدہ تھا کہ جو شخص دوشیزہ سے ملتفت ہوتا ہے تو وہ ارواح خبیثہ جو اس عورت پر عاشق ہوتی ہیں، اس مرد کو ستاتی ہیں۔ چنانچہ اہل بابل کی عورتیں اپنے شوہروں کو ارواح خبیثہ کے خراب اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے اجنبی مردوں سے مل لیا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس نامعقول حرکت سے ان لوگوں میں عورتوں کی قدر و منزلت بھی بڑھ جاتی تھی۔ کیونکہ جو عورتیں مندر میں جا کر اسی مقصد خاص سے بیٹھتی تھیں! ورانھیں کوئی مرد نہیں پوچھتا تھا تو سوسائٹی میں ایسی عورتوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

واضح ہو کہ جس طرح بقول ہیروڈوٹس ملیطہ دیوی کے مندر میں یہ رواج قائم تھا، تقریباً اسی عقیدہ کے ساتھ ملک مصر میں عورتیں ایک خاص رسم ادا کیا

کرتی تھیں۔ مصری عورتوں میں یہ عقیدہ تھا کہ دیوتا یا اس کے نائب دیوتا کی مورتی سے چھوا جانا باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کام کے لئے مندر کے اندر ایک مقدس بکرا پالا جاتا تھا۔ جو پان[1] دیوتا (Pan) کا مظہر تھا۔ عقیدت مند عورتیں مندر میں جا کر اُس بکرے کی خوب خدمت کرتیں، پجاریوں کو تحائف دیتیں اور برہنہ ہو کر اُس بکرے کے سامنے چوپایہ کی طرح اپنے آپ کو پیش کر دیتیں۔

ایسی ہی رسم قدیم رومیوں میں بھی تھی، رومی عورتوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ دیوتا کے التفات سے آسمانی خیر و برکت نازل ہوتی ہے، اسی خیال سے رومی عورتیں پریاپس (Priapus) (ممکن ہے یہی دیوتا ہندوؤں میں پرجاپتی کے نام سے مشہور ہو گیا ہو) کے بُت کی پوجا کیا کرتی تھیں جس کا عضو مخصوص بحالتِ آمادگی بنایا جاتا تھا۔ رومیوں کی بڑی بوڑھیاں نوعروس[2] کو مندر میں لے جا کر پریاپس کے اس عضو پر بٹھا دیتی تھیں۔

شادی کا خرچ اور جہیز مدت مدید گزر جانے پر بھی یونان کے مندروں میں مقدس کسبیاں موجود رہیں۔ کورنتھ کے مندر میں وینس کی داسیاں عرصہ تک پائی جاتی تھیں اور جب تک ان مقدس سیہ کاریوں کا تعلق مندر سے رہا

(۱) ملاحظہ ہو ہیرو ڈوطوس جلد دوم باب ۴۶۔ پان دیوتا در حقیقت گڈریوں، شکاریوں، زراعت پیشہ دیہاتیوں کا دیوتا تھا۔ یہ مرکری کے نطفہ اور پینی لوپ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے بت کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ، چپٹی سی ناک اور جسم زیریں بکرے کا سا بنایا جاتا تھا۔

(۲) ملاحظہ ہو سینٹ آگسٹائین کی کتاب "De Civilate Bk. III Ch. IX"

لوگ ان کی عزت وقعت کرتے رہے۔ مگر بعد کو انھوں نے حرام کاری کا پیشہ اختیار کر لیا جن مندروں میں یہ داسیاں رہتی تھیں وہ عموماً بندرگاہوں، جزیروں اور بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے جو عام طور سے اجنبی سوداگروں اور ملاحوں کے آماجگاہ بنے رہتے تھے۔ جزیرۂ قبرص میں یہ داسیاں ایک طرف تو دیوی کے استھان کی دیکھ بھال کرتی تھیں ، مورتی کے سامنے بخور جلاتی تھیں اور بھجن بھی گاتی تھیں، لیکن اس کے علاوہ بقول پنڈار (Pindar) یہ "نوجوان عورتیں اجنبیوں کی آؤبھگت اور ان کی میزبانی بھی کرتی تھیں" گویا مندر کی خدمت کے ساتھ ساتھ یہ عورتیں ان مردوں کی ضرورتیں بھی رفع کر دیتی تھیں جو اپنے گھروں سے دور ہوتے تھے۔

ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ و سیاحت نامہ جلد دوم باب ۹۲ میں ملک لیڈیا (Lydia) کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"وہاں کی نوجوان اور نوخیز لڑکیاں اپنے آپ کو مردوں کے حوالہ کر دیتی ہیں تاکہ شادی کے مصارف نکال سکیں۔"

اس رواج کی نسبت ڈاکٹر فریزر تحریر کرتے ہیں کہ:-

"غالباً یہ طریقہ "مذہبی فحاشی" سے پیدا ہوا تھا، اور اس خیال کی تائید اس واقعہ سے بھی کچھ کچھ ہوتی ہے کہ جب رومی شہنشاہ جسٹینین، جزیرۂ قبرص میں گیا تو اس وقت یہ معلوم ہوا کہ مندر کی داسیوں کو جو رقم اجنبیوں کی طرف سے وصول ہوتی ہے وہ دیوی کی قربان گاہ پر نہیں چڑھائی جاتی، بلکہ ایک بڑے صندوق میں رکھی جاتی ہے تاکہ اگر کوئی داسی مندر کی خدمت سے اکتا کر شادی کرنا چاہے تو

اُس کی شادی اور جہیز وغیرہ کے اخراجات بآسانی مہیا ہو جائیں"

پاٹر نے اپنی کتاب "سہراب و رستم" صفحہ ۱۶۰ میں لکھا ہے کہ:-

"دنیا کے قدیم و جدید دونوں میں ایسی قومیں اکثر پائی جاتی ہیں جن میں نوخیز لڑکیاں شادی اور جہیز کا خرچ حاصل کرنے کے لیے فحاشی کرتی ہیں"

الجزائر میں ایک قبیلہ بنی نائل کے نام سے مشہور ہے اُس کی لڑکیاں خصوصیت کے ساتھ نہایت حسین و جمیل ہوتی ہیں، یہ لڑکیاں جوان ہو کر باہر چلی جاتی ہیں اور دو چار سال میں خوب دولت کما کر واپس آتی ہیں اور شادی کر لیتی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہی عورتیں شادی کے بعد نہایت اچھی بیویاں اور مائیں ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح فیاجی نے ملک حبش کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"وہاں کی کسبیوں کو ہمیشہ ہمدردی اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اگرچہ اس زمانہ میں از روئے قانون انہیں ہفتہ میں دو بار ڈاکٹری معائنہ کرانا پڑتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے پیشہ میں کوئی ذلت نہیں دیکھتیں۔ ان کے پاس جب کافی دولت جمع ہو جاتی ہے تو وہ اکثر شادیاں کر لیتی ہیں"

فحش کی ابتدا

انسان کے معتقدات مذہبی میں جوں جوں عنصر روحانیت زیادہ ہوتا گیا مذہبی فحاشی کا تقدس بھی زائل ہوتا گیا۔ اگرچہ ایشیائے کوچک کے سواحلی بلاد میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں قسم کی حرام کاری پائی جاتی تھی، لیکن جب مذہبی فحش میں انحطاط شروع ہو گیا تو لوگوں کی عام توجہ غیر مذہبی فحاشی کی طرف ہو گئی جس کا بہانہ یہ تھا کہ جوان لڑکیاں اپنی شادی کے مصارف کے لئے روپیہ جمع کرتی ہیں۔ شاہ قسطنطین اعظم نے اس قسم کی فحاشی کا بھی خاتمہ کر دینا چاہا تھا،

لیکن چونکہ دنیا سے توہم پرستی ہمیشہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی ہے اس لئے لوگوں کے دل میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ جو عورت بیوی کے استھان پر اپنے نفس کی بھینٹ نہیں چڑھاتی، وہ خواہش نفسانی کی آگ سے جلتی رہتی ہے۔ الغرض معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی عورتوں سے بازاری فحش کی ابتدا ہوئی اور جب مذہبی فحاشی کا فقدان ہوگیا تو غیر شادی شدہ مردوں نے تقاضائے فطرت سے مجبور ہوکر لوگوں کی بہو بیٹیوں کو گھورنا اور چھیڑنا شروع کر دیا جس سے نظام معاشرت میں خلل پڑنے لگا اور انھیں تمام باتوں سے متاثر ہوکر یونان کے مشہور و معروف مقنن حکیم سولن نے سب سے پہلے ایک عام قحبہ خانہ قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اوباش نوجوانوں کی تسکین خواہشات کے لئے سرکاری طور پر کوئی آسان ذریعہ مہیا کیا جائے تاکہ اس طرح شریف عورتوں کی عزت آبرو محفوظ رہے، علاوہ اس کے ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان سے سرکاری خزانہ کو فائدہ پہنچے گا۔ الغرض اس تحریک نے فحاشی کو ایک قانونی صورت دے دی اور وہی چیز جو پہلے یونان میں ڈکٹیرین (Dicterion) کے نام سے موسوم تھی موجودہ زمانہ کا قحبہ خانہ (Brothel) ہوگئی اور جو عورتیں قدیم یونان میں "ڈکٹیریڈ" کہلاتی تھیں وہی اس زمانہ کے سرکاری قانون کے ماتحت کسبی کہلائی جانے لگیں۔ قدیم یونان میں جن عورتوں سے قحبگی کا کام لیا جاتا تھا وہ کنیزیں ہوتی تھیں یعنی یا تو وہ عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں اسیر ہو کر آئی ہوں، یا وہ عورتیں جنھیں خرید لیا گیا ہو۔

اس کے بعد قدیم یونان میں ایسی کسبیوں کی جماعت پیدا ہوئی جو آزاد ہوتی تھیں ان کا نام ہتائرہ (Hetairae) تھا یہ عموماً تعلیم یافتہ، مہذب

علم مجلسی میں کامل، موسیقی میں ماہر اور متمول ہوتی تھیں لیکن ان کو منڈی کی خدمت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

فحاشی ممالکِ مشرق میں دنیا کی مختلف قوموں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں فحاشی نہ پائی جاتی ہو، لیکن باقاعدہ عصمت فروشی صرف متمدن اقوام کا حصہ ہے، اور جہاں بھی تہذیب کا قدم پہونچا ہے وہیں یہ بھی ساتھ گئی ہے۔ مثلاً بحر جنوبی کے جزیرۂ روتومہ (Rotuma) میں عصمت فروشی قطعی مفقود تھی، لیکن اب وہاں عصمت فروش عورتیں کثرت سے موجود ہیں اور قریب قریب یہی حال افریقہ کی بمبولا بنتو قوم کا ہوا۔ اسی طرح ملک ویلز کی قدیم قوم میں بہت کچھ متمدن فحاشی موجود تھی لیکن باقاعدہ عصمت فروشی جرم قرار دی گئی تھی۔

برہما برہما میں آوارگی یا عصمت فروشی اس سے قبل بالکل مفقود تھی اور لوگ اس کو ایک شرمناک فعل خیال کرتے تھے۔ لیکن اس زمانۂ آزادی میں وہاں بھی اس کا رواج ہوگیا ہے اور ہندوستانیوں کی تقلید میں وہاں بھی اس کا چرچا بکثرت پایا جاتا ہے۔ ہرچند وہاں کے مقتدایانِ دین نے زن و مرد کے اس آزادانہ تعلق کی روک تھام کرنے میں بہت سختی کی یہاں تک کہ ایسے لوگوں کو جلتی آگ پر تیل ڈالنے کی خدمت سپرد کی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

ہندوستان ہندوستان میں مذہبی اور غیر مذہبی پیشہ ور عورتیں ہمیشہ سے

موجود ہیں۔ کتاب کام شاستر میں جو اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل کی تصنیف ہے بعض نہایت دلچسپ معلومات درج ہیں اس میں لکھا ہے کہ :-

"اگر عرصہ دراز تک بیوی لاولد رہے تو ہندو شوہر آخری تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو لباس فاخرہ اور زیور سے آراستہ کر کے مع دان دکھشنا کے کسی مندر میں چلہ کشی کے لئے بھیج دیتا ہے۔ یہ امر محقق ہے کہ بعض لوگ وقت اور پریشانی سے بچنے کے لیے اوّل ہی شب مندر میں بھیج دیتے ہیں۔ مندر کے اندر یہ ہوتا ہے کہ عورت دن بھر دیوتا کی پوجا پاٹ کر کے اُس سے اولاد کی التجا کرتی ہے اور شب کو دیوتا کے حجرہ میں سو رہتی ہے۔ جب پرہنت کہتا ہے کہ" او صاحب عصمت وعفت عورت خوش ہو کہ وہ ہستی (جو رات کو تیرے ساتھ ہمبستر ہوئی) خود دیوتا کی تھی"

"اس کے بعد وہ عورت اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ اس سرگزشت کے بعد اگر وہ عورت حسن اتفاق سے حاملہ ہو جائے اور وضع حمل کے بعد زندہ بچہ پیدا ہو تو سال بھر کے بعد وہ عورت چند تحائف اور بچہ کے سر کے بال لے کر پھر مندر میں جاتی ہے۔ (۱) ایسے مندروں کا وقار قایم رکھنے کے لئے عموماً نوجوان اور تندرست پجاری مندر میں رکھے جاتے ہیں"

ہندوستان کے بعض حصے خصوصاً جنوبی ہند اور اڑیسہ میں متعدد جگہ یہ رواج ہے کہ عورت و مرد منّت مانتے ہیں کہ اگر ان کے اولاد پیدا ہوئی تو وہ اپنی پہلی لڑکی یا اپنی تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی مندر کی نذر

(۱) ملاحظہ ہو کتاب "ہندوؤں کے عادات رسوم و اخلاق" مصنفہ دوبے صفحات ۵۹۳-۵۹۴

کردیں گے۔ اس لڑکی کو مندر کی ایک عورت (جو خود بھی اسی طریقہ سے آئی تھی) ہاتھ کر پرورش کرتی ہے۔ یہاں اس لڑکی کو رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ خوبصورت لڑکی دس برس کی عمر تک بھی نہیں پہونچنے پاتی کہ مندر کا مہنت اسے اپنی معشوقہ بنا لیتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہتی ہے تو مندر میں ناچنے گانے کی خدمت انجام دیتی رہتی ہے اور جب میلے کے وقت وہاں مختلف شہروں کے جاتری جمع ہوتے ہیں تو یہ عورتیں ان مردوں کے ساتھ مختلط ہوتی ہیں۔ اس لڑکی کی جب تک جوانی باقی رہتی ہے اس وقت تک وہ ہمیشہ عمدہ بیش قیمت لباس اور زیور سے آراستہ رہ کر حسن فروشی کرتی رہتی ہے اور جب وہ کسی قابل نہیں رہتی بلکہ مندر پر بار ہو جاتی ہے تو اس کی پیشانی پر دیوتا کی تصویر داغ دی جاتی ہے اور مندر سے نکال دی جاتی ہے تاکہ بقیہ عمر بھیک مانگ کر گزارے۔

اس لڑکی کے والدین کو خواہ وہ کسی رتبہ و حیثیت کے ہوں اپنی لڑکی کی حیاسوز زندگی پر کوئی غیرت نہیں آتی کیونکہ عام ہندو پبلک اپنی اولاد کو دیوتا کی نذر کر دینا قابل تعریف ایثار سمجھتی ہے۔ اس قسم کی عورتوں کو اصطلاح میں "دیوداسی" کہتے ہیں اور بقول مسٹر رنگا چاریہ مندروں کی ان "دیوداسیوں" سے کسی فرقہ یا ذات کا ہندو بھی شادی نہیں کر سکتا، اس لئے گاؤں کے زمینداروں یا تعلقداروں کو ترغیب دے کر اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس لڑکی کو اپنی آشنا یا داشتہ کے طور پر رکھ لیں۔

ہندوستان میں عوام کے خواہشات نفسانی کو جوش میں لانے کے لئے

مندروں کے در و دیوار پر بھی فحش تصویریں بنائی گئیں۔ جب بین الاقوامی مجلس نے فحش تصاویر کے انسداد کا ریزولیوشن پاس کیا جس پر ۱۹۲۳ء میں بمقام جنیوا سب کے دستخط ہوئے تو اس کی تعمیل میں ہندوستان کی اسمبلی نے بھی یہ قانون بنایا کہ جو شخص فحش تصاویر بیچتا ہو، یا کرایہ پر دیتا ہو، یا تقسیم کرتا ہو، یا منظر عام پر رکھتا ہو، یا کسی فحش کتاب یا تصویر یا مجسمہ کے ذریعہ سے نفع کماتا ہو وہ سزا پانے کا مستحق ہوگا لیکن ہندو سوسائٹی کے مذہبی جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قانون کو مندرجہ ذیل استثناء کے ساتھ منظور کیا گیا کہ:-

"کوئی کتاب، رسالہ، تحریر، تصویر یا نقش جو رسوم مذہبی کے لئے رکھے جاتے ہوں یا استعمال ہوں، یا وہ مجسمے اور تصویریں جو مندروں پر یا مندروں میں کندہ کی ہوئی ہوں، یا وہ بُت جو رتھوں پر رکھے ہوں، یا جو کسی مذہبی رسم کی ادائی کے لئے رکھے گئے ہوں، یا استعمال ہوتے ہوں اس دفعہ میں نہیں آتے"(۱)

فلسطین مغربی ایشیا کے اکثر حصوں میں جہاں انسان کی تمدنی حالت وحشت و بربریت کی انتہا تک پہونچ گئی تھی عصمت فروشی معمولی بات تھی۔ عبرانیوں میں حرام کاری بکثرت رائج تھی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ بائبل میں فاحشہ عورتوں کا بار بار ذکر آتا ہے۔ صحیفۂ امثال کے ابواب تو فاحشہ عورتوں کی مذمت سے بھرے پڑے ہیں۔ بایں ہمہ عبرانی قوم غیر عورتوں کے تمتع کو گوارا کرلیتی تھی اور خود اپنی عورتوں کی عصمت کی بھی سخت قانونی قدر کرتی تھی۔

---

(۱) ملاحظہ ہو قانون تعزیرات ہند ایکٹ ۸ مجریہ سنہ ۱۹۲۵ء دفعہ ۲۹۲

اسلام نے فحش اور قحبگی کا قلع قمع کر دیا تھا۔ چنانچہ علامہ حلبی کا قول ہے کہ رسول مقبول صلعم کی وفات کے بعد پہلی صدی میں دُنیائے اسلام کے اندر عصمت فروشی بالکل مفقود تھی۔ لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ ہندوستان کے اندر ۸۰ فیصدی سے زیادہ کسبیاں مسلمان ہی ہیں۔

قدیم ایران ہر چند مذہب زرتشت میں زہد و اتقا اور نکوکاری پر بہت زور دیا گیا ہے اور ان کے ہاں کسبیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن قدیم ایران میں کثرت سے ایسی عورتیں موجود تھیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے جو پارسیوں کی کتب مقدسہ سے لیا گیا ہے قدیم ایران میں فاحشہ عورتوں کی موجودگی اور ان کی حالت پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے کیونکہ اگر اُس زمانہ میں فاحشہ عورتیں موجود نہ ہوتیں تو ان کی مذمت اس طرح نہ کی جاتی:۔

"اے سپیتما زرتشترا! یہ گاہی (یعنی کسبی) ہے جو اپنے اندر مومنین و منکرین پرستاران مزدا اور پیروان دیو، یعنی بُرے اور بھلے دونوں قسم کے آدمیوں کا بیج ملاتی ہے۔ اے زرتشترا! اس کی نگاہ اس عظیم الشان سیلاب کے پانی کو جو پہاڑوں سے نازل ہوتا ہے بقدر ایک ثلث کے خشک کر دیتی ہے۔ اے زرتشترا! اس کی نگاہ ایک ثلث خوبصورت طلائی رنگ پودوں کو افسردہ کر دیتی ہے اس کی نگاہ سپنتا ارمائتی (دھرتی ماتا) کی ایک ثلث طاقت زائل کر دیتی ہے اور اس کے چھونے سے مومنین کے ایک ثلث نیک خیالات، ایک ثلث اقوال پسندیدہ، ایک ثلث اعمال حسنہ، ایک ثلث طاقت جسمانی، ایک ثلث قوائے فتح مندی اور ایک ثلث تقدیس

خاک میں مل جاتا ہے۔ اے سپیتا ذرتشترا! میں تجھ سے کہتا ہوں کہ رینگنے
والے سانپوں سے، غرّانے والے بھیڑیوں سے، اس مادہ گرگ سے
جو گلہ پر چھاپہ مارتی ہے، نیز اُس مینڈکی سے جو اپنے ہزار ہا بچوں کو لئے ہوئے
پانی میں کودتی ہے، ان سب سے زیادہ اس مخلوق کو تباہ ہونا چاہیے۔"

تاتار و ترکستان تاتار و ترکستان میں بھی کسبیاں بکثرت پائی جاتی ہیں، ایک مستند مسیحی سیاح کا بیان ہے کہ یہاں کسبیوں کے مکانات میں جانا ممنوع نہیں، نہ خلاف اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں پہونچ کر ایک شخص اپنے گھر کو بھی بھول جاتا ہے۔ رقص و سرود سے اس کی طبیعت خوش کی جاتی ہے، دل پسند نظمیں اور غزلیں سنائی جاتی ہیں، لطیفہ اور بذلہ سنجی سے اس کا دل مسخر کر لیا جاتا ہے۔ کسی کی نفیس مکان کے دروازہ ہی پر وصول کر لی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد آنے والے کو اس قدر راحت پہونچائی جاتی ہے گویا وہ اپنے ہی گھر میں محو استراحت ہے وہ کسبی سے وہی کام لیتا ہے جو اپنی بیوی سے لے سکتا ہے۔ کسی قسم کی بدمزگی یا ناگوار بات نہیں ہونے پاتی۔ اس سیاح کا ایک معنی خیز قول یہ بھی ہے کہ:۔

"مشرقی قحبہ خانہ میں کوئی بے حیائی نہیں ہوتی اور نہ وہاں یورپین کسبیوں
کی طرح نادان بچوں کی سی باتیں بنائی جاتی ہیں۔"

چین مشرقی چین میں خصوصاً مغل نسل کی اقوام میں فحاشی تجارتی بنیاد پر قائم ہے، ان لوگوں میں ایک بات نہایت عجیب ہے کہ وہ حرام کاری کو تو بُرا نہیں سمجھتے مگر کسبیوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ

پیشہ ور عورتیں جو لاولد ہوتی ہیں۔ دوسرے خاندانوں سے خوبصورت لڑکیاں چھوٹی عمر کی خرید لیتی ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت اپنے ذوق کے مطابق کرتی ہیں اور لوگوں کی نظروں سے الگ چار دیواری میں محفوظ رکھتی ہیں چونکہ ان لوگوں میں بیوہ عورتوں کی شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، اس لئے اکثر نوجوان بیوائیں بھی تقاضائے فطرت یا ضرورت معاش سے مجبور ہو کر یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ قدیم چین میں کسبیوں کو عمدہ طبقہ کی عورتیں خیال کیا جاتا تھا اور ان کی وقعت تقریباً وہی تھی جو قدیم یونان میں ہتائرہ (مہ جبیں معشوقاؤں) کی تھی۔

ساحلی شہروں اور بڑے بڑے بندرگاہوں میں خاص قسم کی چینی کسبیاں ہیں جو دریا پر خوبصورت بجروں اور موسیقیوں میں رہتی ہیں۔ ان کی کشتیاں نہایت خوبصورت اور آراستہ ہوتی ہیں۔ کشتیوں کے اندر جو مکان بنے ہوتے ہیں وہ بھی نہایت پُر تکلف ساز و سامان سے سجے ہوتے ہیں چنانچہ کائی ٹونگ چین کے اتاچی متعینہ پیرس نے پلاش دباریل سے بیان کیا تھا کہ "پھول والیوں" کے بجرے یورپین قحبہ خانوں کی طرح نہیں ہوتے، بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ ایک قسم کے تفریح خانے ہیں جہاں نوجوان چینی مرد گانا سننے، چائے پینے اور "پھول والیوں" سے لطف صحبت حاصل کرنے آتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ پھول والیاں ان نوجوانوں کے خواہشاتِ نفسانی کے پورا کرنے کا بھی انتظام کریں (حالانکہ در اصل ہوتا یہی ہے)۔

جاپان جاپان میں کسبیوں کی حالت ایسی ذلیل نہیں جیسی چین میں پائی جاتی ہے۔ جاپان بمقابلہ چین کے زیادہ مہذب و متمدن ہے۔ یہی باعث ہے کہ وہاں کی کسبیاں زیادہ خوددار ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جاپان والے ان کو رحم، افسوس اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جاپان کی کسبیاں آزادی کے ساتھ مردوں سے تعلقات رکھ سکتی ہیں، وہ اگر چاہیں تو شادی بھی کر سکتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ بڑے بڑے لوگوں سے شادی کرکے معزز بیبیاں بن جاتی ہیں۔ کو تھین نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ:-

"جب میں ٹوکیو سے شہر یاکوہامہ کی طرف جا رہا تھا تو میں نے چار نوجوان مردوں اور تین خوبصورت نوجوان کسبیوں کو دیکھا جو ایک ہی موٹر میں بیٹھے ہوئے لطف صحبت اٹھا رہے تھے۔ ان کے پاس مختلف شرابوں کی دو تین بوتلیں، سنترے اور خوبصورت کیک رکھے ہوئے تھے۔ آپ ملک چین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کر کے دیکھ لیں آپ کو اس قسم کا دلچسپ منظر کہیں نظر نہ آئے گا۔"

لیکن جاپانی کسبیوں کی جو تاریخ ایک انگریز سیاح نے اپنی کتاب "وہ شہر جہاں رات نہیں ہوتی" (The Nightless City) میں تحریر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ جاپان میں کسبگی پر حکومت نے سخت قواعد و ضوابط عائد نہیں کئے ہیں لیکن اس کو ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور بعض اوقات کسبیوں کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کسبی بالکل غلام سمجھی جاتی تھی اور اس کے ساتھ برا برتاؤ

کیا جاتا تھا۔ مگر اب وہ بالکل آزاد ہے اور حکومت کسی ایسی بات کو گوارا نہیں کرتی جو اس کی آزادی میں خلل انداز ہو۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک جاپانی کسبیوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس وقت ان کو فن موسیقی اور علم مجلسی کی خاص طور سے تعلیم دی جاتی تھی لیکن اس کے بعد انھوں نے تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کم کر دی جس نے سوسائٹی میں انھیں ذلیل کر دیا لیکن نہ اس قدر جتنی ذلت اور جگہ پائی جاتی ہے۔

ماتزنان (Matignan) کا بیان ہے کہ اس وقت بھی جاپان میں کسبیوں کو زیادہ ذلیل نہیں سمجھا جاتا اور نہ ان میں اس قدر بے حیائی پائی جاتی ہے جتنی یورپ کی کسبیوں میں ہوتی ہے۔ اگرچہ جاپان میں ان کا نظام اسی طرح قائم کر دیا گیا ہے جیسے سرکاری ڈاک خانوں یا تار گھر کا، لیکن پھر بھی بے قاعدہ فحش بکثرت ہوتا ہے۔ پیشہ ور عورتوں کو ایک خاص محلہ میں رہنا پڑتا ہے جسے جاپان کی اصطلاح میں یوشی واڑہ (Yoshi Wara) کہتے ہیں، ان کے مکان نہایت صاف ستھرے، خوبصورت و آراستہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ جاپان کی کسبیاں زیادہ تر مغربی وضع قطع اختیار کرنے لگی ہیں، اس لئے ان کا قدیم ذوق معاشرت مفقود ہوتا جاتا ہے۔

تقریباً دو صدی پہلے جاپان میں کسبیوں کا زوال شروع ہو گیا تھا اور اس زمانہ میں وہاں گیشا (Geishes) عورتوں کا طبقہ پیدا ہوا۔ حکومت نے ان پر بھی بعض ایسی قیود عائد کر دی ہیں جن کے باعث وہ فحاشی میں باقاعدہ کسبیوں سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں لیکن ان عورتوں کے لئے اتنی آزادی

ضرور ہے کہ وہ لائسنس دار، باقاعدہ کسبیوں کی طرح "یوشی واڑہ" میں رہنے پر مجبور نہیں ہیں۔

کوریا کوریا میں بھی یہ طبقہ زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے اور جاپان کے تحت بعض ہونے سے قبل وہاں رقاصہ اور فاحشہ عورت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ اینگس ہیملٹن (Angus Hamiltian) نے اپنی کتاب "کوریا" میں لکھا ہے کہ :-

"یہاں جو اعلیٰ طبقہ کی ڈیرہ دار اور خاندانی کسبیاں ہیں، ان کو عموماً بہت اچھی تعلیم دی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ عورتیں حاضر جوابی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور علم مجلسی میں کمال حاصل کر لیتی ہیں، ان کی صحبت اس قدر دلچسپ ہوتی ہے کہ اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا، ان ڈیرہ دار اور اعلیٰ طبقہ کی تعلیم یافتہ کسبیوں کو یہاں کی اصطلاح میں گیسانگ Gisaing یعنی "ورق النور" کہتے ہیں اور ان کی حالت تقریباً ویسی ہی ہے جیسے جاپان میں "گیشا" عورتوں کی۔ سرکاری حیثیت سے ان عورتوں کا تعلق بھی ایک سرکاری محکمہ سے ہے، ان کے ساتھ درباری مغنی اور گویے بھی ہوتے ہیں، ان عورتوں کو قومی خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے اور قصر شاہی کے تمام جلسوں، درباروں اور ضیافتوں میں ان کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ یہ عورتیں تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ ناچ گانے اور فنونِ لطیفہ میں انھیں دسترس حاصل ہوتی ہے، وہ نہایت سلیقہ سے لباس پہنتی ہیں اور عموماً نازک بدن ہوتی ہیں، بلحاظ حسن و جمال یہ عورتیں "کوریا" بھر میں "چوٹی کا پھول" سمجھی جاتی

ہیں لیکن بایں ہمہ انھیں اس بات کی اجازت نہیں کہ کسی عالی نسب مرد سے شادی کریں۔"

قحبگی قدیم روم میں

یورپ کے بہت سے معاشرتی مسائل کی طرح رسم قحبگی بھی غالباً قدیم روم سے یہاں آئی، لیکن ادارہ فحاشی کی نسبت یہاں کے لوگوں کی بھی رائیں متضاد تھیں اور اب تک وہی حالت چلی جاتی ہے یونان قدیم میں یہ حالت نہیں تھی کیونکہ عوام کے دلوں سے "مذہبی فحاشی" کی یاد فراموش نہ ہوئی تھی اور پیشہ ور عورتوں کا بڑا اثر پایا جاتا تھا۔ یونان کے علاوہ یورپ میں کبھی کسی کسبی کو اس قسم کا موقع نہیں دیا گیا۔ ہاں فرانس میں البتہ کوئی کسبی خفیف سا اثر پیدا کر لیتی تھی۔ علاوہ ازیں رومیوں کے خیالات بھی یونانیوں سے مختلف تھے۔ یونانی شائستہ تھے اور رومی وحشی۔ یونانیوں کے مزاج میں نفاست تھی اور رومیوں کے مزاج میں عسکریت۔ اس لئے رومی سے یہ تو ممکن تھا کہ وہ کسبیوں کے وجود کو گوارا کر لے، لیکن وہ یہ کبھی پسند نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے وجود سے جو قدرتی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اُن کے سامنے کبھی سر تسلیم خم کر دے۔

حکیم سسرو (Cicero) جو روم کا بہت بڑا معلم اخلاق تھا، اگرچہ بظاہر یہ نہیں کہتا تھا کہ یہ پیشہ اچھی چیز ہے مگر اس کا قول یہ ضرور تھا کہ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ نوجوانوں کو کسبیوں سے حظ اٹھانے میں کون شخص مانع ہو سکتا ہے۔" روم والے کسبیوں سے ضرور ملتفت ہوتے تھے۔ دراں کے ہاں اعلیٰ طبقہ کی کسبیاں بھی ضرور ہوتی تھیں جنھیں "([illegible] Meretrices)" ...

کیا کرتے تھے لیکن ان کی وہ عزت و وقعت نہیں تھی جو قدیم یونان کی "ہتائرہ" کو حاصل تھی۔ رومیوں کے مزاج کی سختی نہیں اس طبقہ کی زیادہ عزت نہ ہونے دیتی تھی۔ یہ لوگ قحبہ خانوں کی حوصلہ افزائی ضرور کرتے تھے لیکن جب وہاں جاتے تھے تو منہ چھپا کر تاکہ کوئی پہچان نہ سکے، بلکہ کسبیوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ ایک خاص وردی پہنا کریں جس کا معزز طبقہ کی خواتین سے تعلق ہوتا اور جسے "وٹا" (Vitta) یا "اسٹولا" (Stola) کہتے تھے، نہ پہنیں۔

مسیحیت کا اثر فحاشی پر

جب دین مسیحی کا دور آیا تو خیال تھا کہ ادارۂ فحش کی قیادت متزلزل ہو جائے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسیحیت کے دور میں بھی کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں سے قدیم بت پرستی کی یاد فراموش نہ ہوئی تھی اور مسیحی فرمانرواؤں کو ایک مخلوط اور سرکش رعایا پر حکومت کرنی پڑتی تھی۔ علاوہ ازیں کلیسائے مسیحی کے ممتاز پادری اس مسئلہ میں رواداری برتنا چاہتے تھے تاکہ فتنے برپا نہ ہوں اور فحاشی کے جراثیم معزز گھرانوں سے دور رہیں۔ اس کے علاوہ مسیحی شہنشاہوں کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اپنے پیش رو حکمرانوں کی طرح ادارۂ فحش سے آمدنی حاصل کریں مگر جو آزادی کسبیوں کو عہد بت پرستی میں حاصل تھی وہ اب غائب ہو گئی تھی بلکہ بعض جوشیلے مسیحی فرمانروا اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ سخت قوانین نافذ کر کے اس پیشے کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ شہنشاہ تھیوڈوسیس اور ویلنٹی نین نے فرمان جاری کیا کہ شہر روم میں تمام قحبہ خانے بند کر دیے جائیں اور اگر کوئی شخص

کسی کسبی کو پناہ دے تو اُسے سخت سزا دی جائے۔ اس حکم کی توثیق بعد میں جسٹی نین نے بھی کی اور حکم دیا کہ تمام کٹنیوں کو خارج البلد کیا جائے، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

اس کے بعد ہزار برس تک وقتاً فوقتاً یورپ میں اسی قسم کے فرامین جاری ہوتے رہے۔ لیکن سب بے کار ثابت ہوئے۔

قوم وزگوت (Visigathes) کے ایک بادشاہ تھیوڈورک (Theodaric) نے ہر اُس شخص کے لیے جو پیشہ قحبگی کو ترقی دینے کی کوشش کرے سزائے موت مقرر کی اور چھٹی صدی میں اسی قوم کے ایک بادشاہ نے جو کیتھولک مذہب کا پیرو تھا اور جن کا نام (Recahd) تھا ادارۂ قحبگی کا قطعی انسداد کر دیا اور فرمان نافذ کر دیا کہ اگر ملک میں کوئی ایسی عورت پائی جائے تو اُسے کوڑے لگا کر شہر سے نکال دیا جائے۔ علاوہ ازیں شہنشاہ شارلمین نیز شاہ قرطاجنہ جنسریخ نے اور کچھ عرصہ بعد جرمنی میں فریڈرک بار بروسہ نے کسبیوں کے خلاف نہایت سخت قوانین بنائے مگر سب بے نتیجہ ثابت ہوئے۔

قحبگی کے خلاف جہاد قحبگی کے خلاف سب سے زیادہ سخت جہاد فرانس میں ہوا، لوئی نہم نے ۱۲۵۴ء میں حکم جاری کیا کہ ملک کی تمام کسبیوں کا اسباب چھین کر انھیں ملک سے نکال دیا جائے۔ اسی بادشاہ نے ۱۲۵۶ء میں اسی فرمان کا پھر اعادہ کیا اور ۱۲۶۹ء میں جب وہ صلیبی جہاد کے لیے فلسطین جانے لگا تو اُس نے حکم دیا کہ تمام کسبیوں کے گھر اور قحبہ خانے مسمار کر دیئے جائیں۔ لیکن ان احکام کا اثر ملک پر اُلٹا پڑا یعنی پہلے کسبیاں الگ تھلگ رہا

کرتی تھیں اور اب وہ مجبور ہو کر عام لوگوں میں شامل ہو گئیں اور اس طرح ان کا اثر بہت زیادہ پھیل گیا۔ حتیٰ کہ جب شاہ لوئی ممالک مشرق میں مسلمانوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا اور اتقاء و نکو کاری کا زبردست علم بردار بنا ہوا تھا اُس وقت بھی اس کے لشکر میں عصمت فروشی ہوتی تھی اور لشکر تو کیا خود شاہی خیموں کے باہر قرب و جوار کے خیمے کسبیوں کے اڈے بنے ہوئے تھے۔

سترھویں صدی کے وسط تک شاہ ... ئی کے قوانین کا اس طرح بے سود اعادہ ہوتا رہا اور جب سنہ ۱۵۶۰ء میں چارلس نہم نے ایک فرمان جاری کر کے ملک کے تمام قحبہ خانے توڑ دیئے تو کسبیوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا یعنی اگر پہلے کھلے قحبہ خانے موجود تھے تو اب ملک بھر میں خفیہ اڈے قائم ہو گئے جن پر کوئی شخص شبہ نہیں کر سکتا تھا اور جو سرکاری قحبہ خانوں سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔

الغرض باوجود سخت جہاد کے بھی یورپ میں فحاشی کا انسداد نہ ہو سکا اور اٹھارویں صدی کے پیرس میں تو اس کو اس قدر ترقی ہوئی کہ قحبہ خانے نہایت شاندار اور پُر تکلف عمارتوں میں نظر آتے تھے۔

مانتوا (Mantua) میں کسبیوں کے خلاف نفرت و حقارت کے اس قدر جذبات پھیلے کہ ان کو بازار میں سڑے ہوئے پھل اور خراب روٹی کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہی حالت سنہ ۱۲۴۳ء میں اوگنان (Avignan) کی تھی اور کتلونیہ (Catalonia) میں بھی کسبیوں کو اس قدر ذلیل کیا جاتا تھا کہ ان میں کسی معزز خاتون کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھنے نہ دیا جاتا تھا نہ وہ

کسی معزز آدمی کے ساتھ کھانا کھا سکتی تھی۔

وینس میں انسداد فحاشی کے لیے بے شمار سخت قوانین نافذ کیے گئے لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، چنانچہ سترھویں صدی کی ابتدا میں ریاٹ (Coriyat) نے شہر وینس کی سیر کی تو اس نے اپنی کتاب (Coruotitias) میں وہاں کی کسبیوں کا بھی دلچسپ در مفصل حال لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"ان دنوں وینس میں کسبیوں کی تعداد بیس ہزار تھی، جن سے حکومت کو اس قدر ٹیکس وصول ہوتا تھا کہ ایک درجن جنگی جہازوں کے عملہ کے مصارف اس سے پورے ہوتے تھے"

یورپ میں انسداد فواحش کے لیے سب سے آخری کوشش اٹھارویں صدی کے وسط میں وائنا کی ملکہ ماریا تھریسا (Maria Theresa) نے کی تھی۔ اس نے لوگوں کو قید کیا، ان سے جرمانہ وصول کیا، سزائے تازیانہ دی اور مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا کیا۔ عورتوں کو اونچا لباس پہننا منع کیا گیا، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کا سختی کے ساتھ معائنہ کیا جانے لگا۔ میخانوں کی سخت دیکھ بھال ہونے لگی۔ ایسے مقامات میں خادماؤں کا رکھنا ممنوع قرار پایا اور ۱۷۵۱ء میں ایک کمیشن جس کا نام (Chastisty Commission) تھا قائم کیا گیا لیکن شہنشاہ جوزف ثانی نے تخت نشیں ہوتے ہی اس کمیشن کا خاتمہ کر دیا۔

جے شرینک (J. Shrank) نے اپنی کتاب (Duprostitution in Wife) میں لکھا ہے کہ ان سخت قوانین سے فحاشی کا خاتمہ تو کیا ہوتا، اس میں اور زیادتی ہو گئی اور یہ واقعہ ہے کہ جس قدر

فحاشی وائنا میں ہوتی تھی یورپ کے کسی شہر میں نہ ہوتی تھی۔

قرونِ وسطیٰ کے ادارات فحش پیشہ ور عورتوں کی حالت ہر ملک میں مختلف رہی ہے۔ بلکہ ایک ہی وقت اور ایک مقام میں ان کی حالتوں میں تفاوت رہا ہے۔ ڈو فور (Du Four) نے لکھا ہے کہ:

"ان پر ہر طرح کا ظلم و ستم ہوتا تھا لیکن ملک کے تمام طبقوں میں فحاشی کا شوق پایا جاتا تھا اور نوجوانوں کو تو بغیر ایسی عورتوں کے جینا محال تھا"

چودھویں صدی میں بعض ممالک نے جن میں انگلستان بھی داخل ہے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنا کریں جس سے ان کا پیشہ ور ہونا ظاہر ہو۔ لیکن اکثر حالتوں میں ان کی کوئی تذلیل نہیں کی جاتی تھی بعض اوقات جب کوئی بادشاہ یا شاہی خاندان کا آدمی کسی بڑے شہر میں جاتا تھا تو ان کی جو ضیافتیں سرکاری طور پر کی جاتی تھیں ان میں رقص و سرود اور تفریحِ طبع کے لیے یہ بھی طلب کی جاتی تھیں۔

فرانس میں قحبہ خانوں کو (Albayes) کہتے تھے اور وہاں کے مشہور و معروف قحبہ خانے (Toulouse) اور (Ment Pellie) میں تھے۔ جن کا حال (Rasataua) نے بھی بیان کیا ہے۔ ڈرخیم (Durkiem) کا خیال ہے کہ قرونِ وسطیٰ سے پہلے آزادانہ عشقبازی اور نکاح کے درمیان بہت کم فرق تھا۔ لیکن جب قرونِ وسطیٰ میں طبقۂ متوسط کو عروج ہونے لگا تو اس کو اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی حفاظت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس لیے ان لوگوں نے گزشتہ کی فحاشی کے لیے

علیحدہ ادارہ قایم کر دیا۔ جس کی سرکاری طور پر نگرانی ہونے لگی۔ یہ تھی ابتدا گویا "سرکاری قحبہ خانہ کی"۔ ان قحبہ خانوں کو "ادارت خدمتِ عامّہ قرار دیا گیا اور جو لوگ ان کا انتظام کرتے تھے وہ "ملازمانِ سرکار" سمجھے جاتے ان لوگوں کا فرض تھا کہ وہ اپنے متعلقہ قحبہ خانہ میں کسبیوں کی ایک مقررہ تعداد رکھیں، مقررہ فیس لوگوں سے وصول کریں اور پاس پڑوس کی عورتوں کو داخل نہ کریں، یورپ میں اس قسم کے قحبہ خانے تین سو برس تک قائم رہے لیکن جب پیروانِ فرقۂ پروٹسٹنٹ کا زور ہوا، اور ادھر امریکہ کی طرف سے آتشک کی بیماری آگئی، تو قرونِ وسطیٰ کے قحبہ خانوں پر زوال آگیا۔

اعلیٰ معیار کی پیشہ ور عورتیں

اعلیٰ طبقہ کی پیشہ ور عورت جسے انگریزی میں کورٹ زن (Courtesan) کہتے ہیں اور جو پبلک قحبہ خانوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی یہ یورپ کے دَورِ ارتقاء کی پیداوار ہے اور یہ سب سے پہلے پندرھویں صدی میں اطالیہ کے اندر نمودار ہوئی لفظ "کورٹ زن" یا "کورٹی جیانا" کے معنی دراصل وہی ہیں جو اس املاء سے ظاہر ہو رہے ہیں یعنی "درباری عورت" یا "دربار کی محبوبہ" اور یہ وہ عورتیں تھیں جو شاہی حشم و خدم کے ساتھ رہتی تھیں، چنانچہ اسکندر بورجیا (Alexander Borgia) کا پاپائی دربار بھی ان سے خالی نہ تھا برچارڈ (Burchard) نے جو اس زمانہ کے دربار پاپائیت کا نہایت سچا مؤرخ ہے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ:۔

"ماہ اکتوبر ۱۵۰۱ء میں پاپائے اعظم نے حکم دیا کہ دربار میں پچاس ایسی عورتیں لائی جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ عشاء کے بعد یہ عورتیں قیصر بورجیا (Caisar Borgia) اور اس کی بہن لقریزیہ (Lucrezia) کے سامنے پہلے تو پشوازیں پہن کر اہل دربار کے ساتھ خوب ناچیں بعد ازاں انھیں ننگا نچایا گیا۔ اس کے بعد شمعہائے کافوری کے جھاڑوں کی مختلف روشیں بنائی گئیں۔ شمعیں روشن کر دی گئیں اور فرش پر اخروٹ بکھیر کر ان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اِن بلوریں جھاڑوں کے درمیان جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلیں، اور اخروٹ چُنیں۔ اس سلسلہ میں انعامات بھی تجویز ہوئے اور ان کو دیے گئے جن کی بے حیائی اہلِ بزم کو زیادہ پسند آئی۔"

لفظ "کورٹ زن" کے وجود میں آنے سے قبل ان کا نام عام طور سے (Sinners) تھا اور اطالوی زبان میں ان کو پیکاٹرس (Pecgatrice) کہا کرتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ان کو نہ صرف عام طور پر پسند کرتے تھے بلکہ ان کو ایک قسم کی عزت و وقعت بھی حاصل تھی۔ بعد کو اطالیہ میں بھی اعلیٰ طبقہ کی پیشہ ور عورتوں کا نام "امپیریا" (Imperia) ہو گیا اور دربار پاپائیت میں جو سب سے پہلے طلب کی گئی وہ لاطینی زبان کی ناظمل ہونے کے علاوہ اطالوی زبان کی بھی ماہر تھی۔ یہ عورتیں فنِ موسیقی اور رقص میں بھی کمال حاصل کرتی تھیں۔

الغرض یورپ کے عہدِ ارتقار کی پیشہ ور عورتیں قریب قریب ویسی ہی تھیں

جیسی قدیم یونان کی "ہتائرہ"

ان کی فیس دو روپیہ سے لے کر پچاس روپیہ تک ہوتی تھی۔ بانڈیلو (Bandello) نے لکھا ہے کہ:-

"شہر وینس کی پیشہ ور عورتیں متعدد چاہنے والے رکھا کرتی تھیں ہر شخص کے لئے ایک شب مقرر تھی سو وہ اس رات کو وہیں کھانا کھاتا اور وہیں رہتا۔ ہفتہ کے بقیہ ایام میں اُسے اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ ہر شخص کی طرف سے ماہوار تنخواہ مقرر ہوتی تھی لیکن اس کو یہ حق ہمیشہ حاصل رہتا تھا کہ اگر کسی روز وہ اپنے نفع کے لحاظ سے دوسرے شخص کو بلالے تو وہ اُس دن کے آنے والے کا وقت بدل دے"

یورپ کی بعض تاریخی پیشہ ور عورتیں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کسی بازاری عورت نے کوئی تاریخی خصوصیت نہ حاصل کی ہو۔ لیکن چونکہ اس طبقہ سے عوام کو ہمیشہ بے اعتنائی رہی ہے اس لئے مؤرخین نے مختلف ممالک کی کسبیوں کے حالات کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن یورپ کے بعض مؤرخین نے مغرب کی بعض ایسی مشہور عورتوں کے حالات لکھے ہیں۔ مثلاً:-

(طولیہ دی آراگونہ) یہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں سب سے زیادہ ممتاز عورت تھی اور کہا جاتا ہے کہ مشہور مسیحی پادری کارڈنل۔ ڈی۔ آرگونہ کی لڑکی تھی۔ اس کی ماں بھی ایک کسبی تھی جس کا تعلق کسی پادری سے ہو گیا تھا لطف یہ ہے کہ خود کارڈنل بھی اگرچہ ہسپانیہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر تھے کسبی کے پیٹ سے۔ یہ عورت اپنی اعلیٰ فلسفیانہ شاعری کی وجہ سے

بہت مشہور ہو گئی تھی۔ اس کی ایک چہار دہ مصرعی نظم (Sonnet) بہت مشہور ہے جو اس نے ایک بست ساز خوبصورت جوان کی محبت میں لکھی تھی۔ یہ عورت نہایت روشن خیال اور مہذب تھی۔ بالآخر اس نے متنفر ہو کر پیشہ چھوڑ دیا۔ اس کی ہر شخص عزت و وقعت کرتا تھا۔ ۱۵۴۶ء میں فلورینس کے حاکم نے فرمان جاری کیا کہ تمام کسبیاں چہرہ پر زرد نقاب ڈالا کریں یا ہاتھ میں زرد رومال رکھا کریں جس سے ہر شخص پر ان کا پیشہ ظاہر ہو جائے۔ طولیہ نے اس کی شکایت نواب بیگم سے کی جو ایک اعلیٰ سیرت کی ہسپانوی خاتون تھی؛ اس خاتون نے اپنے شوہر پر زور ڈال کر طولیہ کو اس ذلت انگیز حکم سے "بوجہ اعلیٰ فلسفیانہ شاعری" کے مستثنیٰ قرار دیا۔ اس کے بعد طولیہ نے اپنی نظمیں نواب بیگم کے نام سے منسوب کیں۔ طولیہ بہت خوبصورت تھی اس کے سنہرے بال اور بڑی بڑی آنکھیں خاص طور پر لوگوں کو بہت محبوب تھیں اس کی آنکھوں میں جادو تھا وہ جس طرف دیکھ لیتی تھی لوگ مسحور ہو جاتے تھے اور ناممکن تھا کہ کوئی شخص اس کے سامنے آئے اور مرعوب نہ ہو جائے۔

(ورونیکا فرانکو) یورپ کی دور نہضت کی کسبیوں میں سب سے ممتاز ورونیکا فرانکو (Veronica Franco) تھی جو ۱۵۴۶ء میں بمقام وینس پیدا ہوئی تھی۔ یہ متوسط طبقہ کی لڑکی تھی جس کی شادی کمسنی میں ایک ڈاکٹر سے ہو گئی تھی۔ شاعری اور فنون لطیفہ کے لئے اس کا دماغ بہت موزوں تھا متعدد زبانیں جانتی تھی، گاتی بھی نہایت اچھا تھی اور مختلف ساز نہایت عمدگی سے بجا سکتی تھی۔ وہ صرف کسبی ہی نہ تھی بلکہ اپنے ناتجربہ کار چاہنے والوں کے

حق میں ناصح مشفق بھی تھی۔ مثلاً ایک نوجوان لڑکا جو ہنوز طالب علم نہ تھا اس پر عاشق ہوا۔ ورونیکا نے اس نوجوان کو نصیحت کی:-

"آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں کو مجھ سے دعوائے محبت ہے اور جو یقیناً مجھے بھی بے حد پیارے ہیں وہ نہایت سختی کے ساتھ اپنی تعلیم و تربیت میں معروف رہتے ہیں۔ اگر مجھے اس قدر استطاعت حاصل ہوتی تو میں اپنا تمام وقت خاموشی کے ساتھ قابل لوگوں کی صحبت میں صرف کرتی"

ایک مرتبہ وہ ایک مسیحی پادری پر عاشق ہوئی اور فریفتگی کی حالت اس درجہ تک پہنچی کہ جب تک وہ پادری کو دیکھ نہ لیتی اُسے چین نہ پڑتا لیکن چونکہ پادری صاحب بہت محتاط تھے اس لیے یہ تعلق دوستی کی حد سے آگے نہ بڑھا۔ ایک مرتبہ شاہ فرانس ہنری سوم کو بھی اس کی ملاقات کا شوق دامن گیر ہوا اور چلتے وقت وہ ورونیکا کی تصویر بھی لیتا گیا۔ وہ فنون لطیفہ کی بے حد حامی تھی، وہ جس سے دوستی کرتی تھی ہمیشہ خلوص کے ساتھ کرتی تھی، وہ اس قدر شائستہ تھی کہ بعض اعلیٰ طبقہ کی شریف زادیاں بھی اس کی دوست بن گئی تھیں۔ ۱۵۸۰ء میں اس نے کلیسا میں اقرار کیا کہ اس کے پیٹ سے چھ بچے پیدا ہوئے تھے اس نے ۱۵۹۱ء میں بعارضۂ بخار وفات پائی۔

(نینون دی لنکلوس) نینون دی لنکلوس (*Ninon De Lenclos*)

بھی نہایت بلند ذوق کی عورت تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی اعلیٰ فطرت اور اچھی عقل و فہم والی عورت محبگی سے خوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن نینون اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ اس

میں تمام اوصاف پسندیدہ موجود تھے مگر وہ پیشہ بھی کسبی تھی۔ یہ عورت سترھویں صدی کی ابتداء میں پیدا ہوئی۔ ماں باپ دونوں طرف سے نجیب الطرفین تھی۔ یہ سولہ یا سترہ برس کی عمر تھی جب اس کا پہلا چاہنے والا پیدا ہوا۔ اس کا نام گیسپارڈ ڈی کولگنی (Gaspard De Coligny) تھا۔ اس کے بعد نصف صدی تک اس کے چاہنے والوں کا سلسلہ لگاتار قائم رہا بعض اوقات ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ چاہنے والے اس کے موجود رہتے تھے لیکن اس کا نباہ تین برس سے زیادہ کسی سے نہ ہوا۔ اس عورت کی صورت ایسی اچھی تھی کہ خاندان سیوزنہ (Sevignes) کی تین پشتیں اس کے چاہنے والوں میں گزریں لیکن اس کا جمال اسی طرح قائم رہا۔ یہ عورت بہت بے غرض تھی اور عام کسبیوں کی طرح اسے زر و مال کی کوئی طمع نہ تھی۔ اس زمانے کے بڑے بڑے آدمی اس کی عزت و آبرو کیا کرتے تھے۔ وہ بہت باوقار اور صاحبِ عظمت عورت تھی۔ جو رونق اور دلچسپی اس کے چھوٹے سے دربار میں رہتی تھی وہ اس زمانہ کی شہزادیوں تک کو نصیب نہ تھی

انسدادِ قحبگی کے لیے سعی و کوشش

ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں کہ انسدادِ قحبگی کے لیے وقتاً فوقتاً سخت قوانین نافذ کیے گئے اور وہ جب سے تمام زمانہ قوانین جاری ہوئے جن سے انسدادِ فواحش کے [illegible] اس میں اور زیادہ ترقی ہوئی اس لیے دورِ نہضت میں ارباب حل و عقد نے عاجز ہو کر قحبگی کے خلاف جہاد کرنا بھی ترک کر دیا لیکن اس کے باوجود زمانے میں بھی اس کے انسداد کے لیے وقتاً فوقتاً سخت تدابیر اختیار کی جاتی رہیں

اور آخر کار اب زمانہ بھر نے تسلیم کر لیا کہ علاج مرض سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں پورٹسمتھ کے میئر نے یہ حکم جاری کیا کہ اگر کسی نے ان عورتوں کو پناہ دی تو اس کی سخت سزا دی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ایک دن مقرر کر کے شہر کی تین چار سو بدنصیب کسبیوں کو پکڑ لیا گیا بعض کی حالت اس قدر خستہ اور ردی تھی کہ ان کے تن پر چیتھڑا تک نہ تھا، پھر ان کی گئی دن تک بازاروں میں تشہیر کی گئی اور محتاج خانہ (Work House) پہونچا دیا گیا۔ لیکن وہاں ان کو داخل نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد یہ چند روز تک یوں ہی خانہ خراب پھرتی رہیں۔ پھر مجبور ہو کر ان کو گھر جانے کی اجازت دیدی گئی۔

اسی قسم کی بہت سی کوششیں امریکہ میں بھی کی گئیں سنہ ۱۸۹۱ء میں ریاست پنسلوینیا کے مقام پٹسبرگ میں کسبیوں کے مکانات بند کر دیے گئے ان کو بازاروں میں نکال دیا گیا اور کسی فرد بشر نے ان کو نہ رہنے کو جگہ دی نہ کھانے کو ٹکڑا، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ حالت دیکھ کر تمام ملک میں رحم و کرم کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ اور ارباب حل و عقد کو بگڑی سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ حال ہی میں نیو یارک کے اندر بھی ایسا ہی واقعہ گزرا اور اس کے نتائج بھی ایسے ہی افسوسناک نکلے۔

قحبگی کے متعلق قواعد و ضوابط جب انسداد فحاشی میں کسی طرح کامیابی نہ ہوئی تو ارباب حل و عقد کا میلان خاطر اس طرف ہوا کہ قحبگی کے متعلق قواعد و ضوابط وضع کر کے اس کو قاعدہ کے اندر لے آیا جائے اور حکومت

کی نگرانی میں لے لیا جائے تاکہ اس فعل سے جو نتائج قبیحہ پیدا ہوتے ہیں، ان کی روک تھام ڈاکٹروں اور پولیس افسروں کے ذریعہ سے ہو سکے اس غرض سے جدید قحبہ خانے قائم ہوئے جو قرون وسطیٰ کے قحبہ خانوں یا چکلوں سے بعض صورتوں میں مختلف تھے۔ ان کا طبی معائنہ کیا جاتا تھا اور بغیر لائسنس کے یہ پیشہ نہ کر سکتی تھیں۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا حامی برنارڈ مینڈیوائل (*Bernard Menderville*) تھا۔ ۱۷۲۴ء میں اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "سرکاری قحبہ خانوں کی سنجیدہ حمایت" (*Modest Defence of Public Slums*) تھا۔ اس کتاب میں اس نے یہ بحث کی کہ :-

"اگر پبلک قحبگی کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی گئی تو اس سے اس گناہ کی نہ صرف بدترین مضرتیں کم ہو جائیں گی بلکہ عام حرام کاریوں میں بھی کمی ہو جائے گی اور قحبگی کی حدود تنگ ہو جائیں گی۔"

اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر بذریعہ قانون پارلیمنٹ کسبیوں کو خاص حقوق عطا کر دیئے گئے اور ان کے ساتھ خاص رعایتیں کی گئیں تو اس سے خانگی فحاشیوں میں کمی ہو جائے گی۔ اس نے یہ طریق عمل تجویز کیا کہ شہر کے کسی خاص محلہ میں سو قحبہ خانے تعمیر کئے جائیں جن میں دو ہزار کسبیاں رہ سکیں۔ ان سب کو ایک سو تجربہ کار اور قابل عورتوں کے اہتمام اور نگرانی میں دے دیا جائے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر اور سرکاری کمشنر بھی ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہا کریں۔ لیکن لوگوں نے اس تجویز کو دیوانگی سمجھا اور کوئی توجہ نہ کی گئی

لیکن یہ کام اسّی برس کے بعد نپولین اعظم کے ہاتھوں انجام پذیر ہونا مقدر ہو چکا تھا جس نے گزشتہ صدی میں موجودہ یورپین قحبگی پر بے حد اثر ڈالا۔

مگر اب کسبیوں کو درج رجسٹر کرنا، ان کی نگرانی، ان کے متعلق قواعد و ضوابط کا انضباط اور ان کا طبی معائنہ ایک افسانۂ ماضی ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ پر بڑے بڑے جھگڑے ہوئے جن میں سب سے زیادہ وہ ہے جو انگلستان میں دربارۂ "قوانین امراض متعدی" برسوں تک ہوتا رہا، اس کی کل روداد ایک منتخب کمیٹی کی رپورٹ میں درج ہے جو ان قوانین کے متعلق بنائی گئی تھی اور جو سنہ ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی لیکن یہ قوانین سنہ ۱۸۸۶ء میں منسوخ کر دیے گئے۔ پھر اس کے بعد انگلستان میں ان قواعد و ضوابط کے نفاذ پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ اس وقت بھی اگرچہ یورپ کے مختلف ممالک میں پرانے قواعد و ضوابط باقی ہیں مگر محض برائے نام ہیں اور علمائے نفسیات اور ماہرین علم معاشرت نے بھی یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ کسبیوں کو ستانا قطعی وحشت و بربریت ہے۔

لیکن جو تکالیف و مصائب عالم انسانی پر آتشک و سوزاک کے ذریعہ سے نازل ہوتے ہیں وہ بالواسطہ قحبگی کے نتائج ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے یہ خیال ضرور گزرتا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخص کسی زمانہ میں ان کے انسداد کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچے۔ فرانس میں کسبیوں کی رجسٹری اور قحبہ خانوں کی نگرانی کا سلسلہ سنہ ۱۸۰۲ء سے شروع ہوا تھا اور سنہ ۱۸۲۵ء سے ڈاکٹری معائنہ کا کام بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ جو اب تک چلا آ رہا ہے۔ لیکن فرانس کے

بڑے بڑے اہل الرائے ان مستبدانہ طریقوں کے قطعی خلاف ہیں۔ جرمنی میں بھی قحبہ خانوں پر سختی اور ان کی سرکاری نگرانی اور نگہداشت کے خلاف ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی تھی جس کی قیادت برلن میں بلاسچکو (Blaschko) نے کی۔

جرمنی میں قحبہ خانوں کا سرکاری انتظام اور نگرانی ابھی تک جاری ہے۔ جس کے نتائج خود اہل جرمنی کے نزدیک بھی افسوسناک ہیں۔ مثلاً جرمن قانون کی رو سے اگر کوئی شخص اپنے مکان میں مرد و زن کے ناجائز تعلقات ہونے دے تو وہ مستوجب سزا ہو گا۔ اس حکم کا اصلی مقصد یہ ہے کہ بغیر لائسنس کے قحبگی کا انسداد کیا جائے، مگر درحقیقت اس کا نتیجہ اُلٹا نکلتا ہے۔ یعنی امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک میں اگرچہ جوان لڑکے اور لڑکی کا شادی سے قبل تعلقات رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن جرمنی میں اس خیال سے اس تعلق کو برا نہیں خیال کرتے کہ ممکن ہے اس کے بعد دونوں میں باقاعدہ شادی ہو جائے جرمنی کی پولیس ایسے لڑکے اور لڑکی کو سخت پریشان کرتی ہے اور ان کے ایسے پرائیوٹ تعلقات کو بغیر لائسنس قحبگی قرار دیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کی ایذا برداشت کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ باقاعدہ قحبہ بن جائیں اور خود کو پولیس کی پناہ میں دے دیں جرمن قانون دراصل ان لوگوں کے خلاف ہے جو قحبگی کی آمدنی پر بسر اوقات کرنا چاہتے یا کرتے ہیں لیکن اس کے عملی نتائج اچھے نہیں نکلتے۔

اطالیہ میں بھی کئی بار قواعد و ضوابط جاری ہوئے اور پھر منسوخ کر دیئے

گئے۔ سوئٹزرلینڈ میں مختلف اضلاع کے اندر مختلف قواعد وضوابط جاری کرکے تجربہ کیا جا رہا ہے، بعض علاقوں میں سوائے خاص حالات کے کسبیوں سے کوئی تعارض نہیں کیا جاتا۔ لیکن بعض علاقوں میں معمولی فحاشی بھی قابل سزا سمجھی جاتی ہے۔ خاص شہر جنیوا میں صرف اُن عورتوں کو پیشہ کرنے دیا جاتا ہے جو وہیں کی رہنے والی ہوں۔ لیکن زیورچ (Zurich) میں ہر قسم کی قحبگی ممنوع ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی باوجود تمام قواعد وضوابط اور رعایتوں کے لوگوں کی عام اخلاقی حالت وہی ہے جو دیگر حصص یورپ میں پائی جاتی ہے اور یہی حالت لندن کی بھی ہے۔ اسی طرح ڈنمارک میں دیکھا گیا کہ تحریک انسداد قحبگی کا کوئی عمدہ نتیجہ نہیں نکلتا تو وہاں سنہ ۱۹۰۲ء سے یہ تحریک بالکل بند کر دی گئی۔

جو لوگ اِس بات کے لیے بے حد شور وغل مچاتے تھے کہ کسبیوں کو درج رجسٹر کیا جائے، اب وہ بھی تسلیم کرتے کہ موجودہ تہذیب و تمدن اِس قسم کی قید وبند کی منافی ہے۔ کیونکہ جن ممالک میں رجسٹری کا طریقہ جاری ہے وہاں بغیر لائسنس کی کسبیاں رجسٹری شدہ کسبیوں سے زیادہ ہوتی جا رہی ہیں، اب فرانس میں بھی جہاں سب سے پہلے قحبہ خانوں کو باقاعدہ نگرانی میں لیا گیا تھا چکلوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ قحبگی کم ہوتی جاتی ہے بلکہ اس لیے کہ اب ادنیٰ درجہ کے بوزہ خانے، قہوہ خانے اور ہوٹل جو بغیر لائسنس کے قحبہ خانے ہیں، باقاعدہ چکلوں کی جگہ لیتے جاتے ہیں۔

ناکامی

الغرض اب متمدن ممالک میں اس خیال کے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں جو قحبگی اور قحبہ خانوں کو سرکاری نگرانی اور سخت قواعد وضوابط کی بندشوں میں کسنا چاہتے ہیں۔ اب صرف یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ موقع محل اور مقامی حالات کو دیکھ کر کوئی ضابطہ مقرر کیا جائے، ورنہ کسی عام قانون اور ضابطہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو لوگ قحبہ خانوں کو پولیس کی نگرانی میں رکھنے کے حامی تھے اب وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ایسا کرنا محال ہے۔ کیونکہ بہت سی لڑکیاں چھوٹی عمر سے اس مذموم فعل میں مبتلا ہو جاتی ہیں اس لیے کسبیوں کو بہت چھوٹی عمر سے درج رجسٹر ہونا چاہیے۔ لیکن یہ کام عملاً ناممکن ہے اور یہی وہ بات ہے جو لوگوں کو عام طور سے ناگوار گزرتی ہے۔

برلن میں سولہ سال سے کم عمر کی لڑکی کو بطور قحبہ درج رجسٹر نہیں کیا جاتا حالانکہ اکثر لڑکیاں اس پیشہ میں بہت کمسنی سے پڑ جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جب کوئی رجسٹری شدہ کسبی اپنے پیشہ سے گھبرا جاتی ہے یا کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو وہ پولیس کی نگرانی سے چپ چاپ نکل جاتی ہے اور کسی اور جگہ جا کر خفیہ طور پر پیشہ کرنے لگتی ہے جس سے بیماریاں اور زیادہ بڑھتی ہیں۔ علاوہ ازیں کسبیوں کے شبہ میں پولیس والے اکثر معزز عورتوں پر بھی زیادتی کر بیٹھتے ہیں جس کے باعث ان کے خلاف عام جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔

الغرض معلوم یہ ہوتا ہے کہ کسبیوں کا مسئلہ جس طرح اب سے تین ہزار برس

پہلے لاینحل تھا۔ اسی طرح اب بھی ہے۔ اس کو معقول طریقہ سے سمجھنے کے لئے نہ صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم تجبگی کی ابتدا و ارتقاء پر غور کریں، بلکہ اس کے اسباب و علل اور موجودہ سوسائٹی سے اس کے تعلقات پر بھی کافی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں ہم اسی بات پر بحث کریں گے کہ تجبگی کے اسباب و علل کیا ہیں اور پیشہ ور عورتوں کا عام سوسائٹی سے کیا تعلق ہے۔

تجبگی کے اسباب و علل

تجبگی کی ابتدا اور ارتقاء کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ ہمارے نظام ازدواج کا کوئی اتفاقی شاخسانہ نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک جزو لازم ہے، جب کنبہ کا نظام رفتہ رفتہ انسانی بطریقی بن گیا اور اس کی بنیاد زیادہ تر وحدت ازدواج پر قائم ہونے لگی تو عورتوں کا اپنے آپ کو کسی ایک کو سپرد کر دینا روز بروز مشکل ہوتا گیا۔ قبیلہ کے بطریقی نظام پر خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس میں لڑکی اپنے باپ کا مال ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ خود اپنے فائدہ کے لیے لڑکی کی حفاظت اس وقت تک نہایت احتیاط سے کرتا تھا، جب تک کوئی بر پیدا ہو اور اس لڑکی کو خرید نہ لے۔ لڑکی کی قدر و قیمت سے اس کی دوشیزگی کا خیال زیادہ وابستہ ہوتا گیا، اور اگرچہ پہلے زمانہ میں "دوشیزہ" وہ عورت سمجھی جاتی تھی جو اپنے نفس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینے میں آزاد ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا، جب اس کے معنی اس عورت کے ہو گئے جس کو کسی مرد نے نہ چھوا ہو۔ جب لڑکی اپنے باپ کی طرف سے ... طرح منتقل ... ئی تو سسرال میں بھی

اُسی طرح نگرانی ہوتی رہی۔ گویا باپ اور شوہر دونوں کے نزدیک یہی بات مفید تھی کہ وہ اس عورت کی مردوں سے حفاظت کریں۔ اس طریقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سوسائٹی میں ایسے نوجوان مرد و زن کی ایک جماعت کثیر پیدا ہوگئی جو محروم الازدواج تھے کیونکہ بعض مردوں میں آتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ بیوی کا خرچ اٹھا سکیں اور بعض عورتیں ایسی بھی تھیں جو اپنی زندگی میں شادی سے مایوس ہوگئی تھیں، الغرض جب سوسائٹی اس حالت کو پہنچی تو فحاشی کا ہونا لازم تھا۔ اس طرح گویا بعض نوجوان عورتوں نے جو بلحاظ حسن و جمال و شائستگی اپنی کچھ قدر و قیمت سمجھتی تھیں اپنے نفس کی قیمت لگادی اور وہ آزادی کے ساتھ ناکتخدا مردوں کی خواہشات نفسانی عارضی طور پر پوری کرنے لگیں۔ اس طرح گویا فحبگی کی ابتداء ہوئی۔

موجودہ نظام معاشرت میں فحبگی کی حالت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ کا پوری طرح تجزیہ کرکے فحبگی کے خاص خاص اسباب و علل بیان کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ہم کو اقتصادی، اخلاقی، تمدنی اور حیاتی پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔

ہیولاک ایلس کو ایک تجربہ کار شخص نے مندرجہ ذیل بیان لکھ کر بھیجا تھا جسے ہم اس کی کتاب "تعلقات نفسانی اور معاشرت" سے اقتباساً درج کرتے ہیں:۔

"مجھے پیشہ ور عورتوں کا مختلف طریقوں سے تجربہ ہوچکا ہے اور میں بلا پس و پیش کہہ سکتا ہوں کہ ایسی عورتوں میں ایک فی صدی بھی ایسی نہیں

ہوتیں جنھیں تعلیم یافتہ کہا جا سکے۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ
عموماً ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی روز افزوں تعداد سے ظاہر ہوتا
ہے کہ ان عورتوں میں جذبات شرم وحیا کا اوائل عمری میں فقدان ہو جاتا ہے
اور سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ لڑکیاں تعلقات زنا شوئی سے
واقف ہو جاتی ہیں۔ جب یہ لڑکیاں سن بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں تو جن لڑکوں
یا جوانوں سے ان کی آشنائی ہوتی ہے وہ ان کو بے حیائی کی آخری حد تک
پہنچا دیتے ہیں، اس کے بعد وہ لڑکیاں کارخانوں اور دوکانوں میں کام کرنے
کے لئے جانے لگتی ہیں، اور اگر وہ خوبصورت یا قبول صورت ہوتی ہیں، تو
کارخانوں کے مہتمم ان سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ان لڑکیوں کو
خوبصورت چیزوں اور سامان آرائش و زیبائش کا شوق ہو جاتا ہے اور وہ
کسی صاحب مقدور مرد کے ساتھ بحیثیت "مدخولہ" رہنے لگتی ہیں، ان
عورتوں کے متعلق ایک بات اور قابل ذکر ہے یعنی انھیں اپنے چاہنے والے
مرد کے ساتھ اختلاط کرنے میں چنداں لطف حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے
ہی جیسے مزاج اور طبیعت والے شخص کے اختلاط سے زیادہ خوش
ہوتی ہیں۔ میں ایسی بہت عورتوں کو جانتا ہوں جنھیں کسی بدمعاش نے
سبز باغ دکھا کر دام میں پھانسا، آبرو ریزی کی اور چھوڑ کر بھاگ گیا۔ مخالف
کی ساتھیوں سے تعلق میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وجہ
سے کہ وہ شراب خوار ہوتی ہیں اور شراب خواری عورت کے لئے سم قاتل
ہے۔ اس شوق میں مبتلا ہو کر عورت شرم وحیا بالکل بالائے طاق رکھ دیتی

ہے۔ دوسرا سبب لڑکیوں کے خراب ہونے کا یہ ہے کہ وہ دیدہ زیب اور نظر فریب چیزوں کو پسند کرنے لگتی ہیں اور یہ شوق ان میں ایسی عورتوں کی دیکھا دیکھی پیدا ہو جاتا ہے جو اس پیشہ میں داخل ہو چکی ہیں۔ مثلاً ایک جوان لڑکی صبح سے شام تک مزدوری کرتی ہے اور وہ دیکھتی ہے کہ اس کے ہمسایہ میں کوئی عورت عمدہ لباس پہنتی ہے تو اس کو دیکھ کر یہ غریب لڑکی بھی گمراہ ہو جاتی ہے یعنی جب وہ اس سے دریافت کرتی ہے کہ ایسی عمدہ چیزیں اور ایسا نفیس لباس کہاں سے آیا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جا کر مردوں سے مانوس کرا دیتی ہے اور اس جماعت میں ایک فرد کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔"

سب سے زیادہ دلچسپ اسباب و علل وہ ہیں جو خود انھیں عورتوں کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ بعض ممالک میں قحبگی کے اسباب و علل کا ان لوگوں نے بھی اندازہ لگایا ہے جنھیں سرکاری یا دیگر حیثیت میں ان سے واسطہ پڑتا ہے اور بعض ممالک میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب کوئی عورت پیشہ اختیار کرتی ہے تو اُسے نام درج رجسٹر کراتے وقت یہ پیشہ اختیار کرنے کا سبب بھی بتانا پڑتا ہے۔

پیرنٹ دوشاتلے (Parent Duchatelet) نے جن کی کتاب قحبگی کے متعلق پیرس میں اب بھی مستند مانی جاتی ہے۔ ہر قسم کی کسبیوں کا حسب ذیل تخمینہ لگایا ہے۔

کل تعداد جس پر تخمینہ قائم کیا گیا۔	تعداد	اسباب
[illegible]	۱۴۴۱	مفلسی و ناداری
	۱۴۲۵	چاہنے والے کا آبروریزی کر کے بھاگ جانا
	۱۲۲۵	والدین کا سایہ اُٹھ جانا

مندرجہ بالا نقشہ سے صرف اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ قحبگی کے اسباب صرف اقتصادی ہیں۔ بلجیم کے دارالحکومت بروسیلز (Brussels) میں قحبگی کے اسباب علل کا اندازہ بیس برس (یعنی ۱۸۶۵ء لغایتہ ۱۸۸۴ء تک) اعداد و شمار سے لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ قحبگی کے اسباب نقشہ مندرجہ بالا سے بالکل مختلف ہیں۔ ۵۰۵۳ واقعات فحاشی کی چھان بین کی گئی تو نتیجہ حسب ذیل نکلا۔

تعداد	سبب
۱۵۲۳	انتہائی مفلسی و ناداری۔
۲۸	خاوندوں کا خرچی کمانے پر مجبور کرنا۔
۱۱۲۸	خواہشات نفسانی کی شدت۔
۴۲۰	صحبتِ بد کا اثر
۳۱۶	ایماندارانہ کام سے نفرت۔
۱	والدین کا قحبگی اختیار کرنے پر مجبور کرنا۔
۱۰۱	عاشقوں کی بے وفائی۔
۱۰	والدین سے جھگڑا۔
۴	سرپرستوں سے ناموافقت۔
۳	گھر کے جھگڑے
۷	شوہروں کا چھوڑ دینا۔

جس وقت لندن میں مسٹر میرک (Mr. Merrick) بحیثیت پادری مل بینک جیل میں کام کرتے تھے تو انھوں نے ہزار ہا کسبیوں سے قحبگی کے اسباب دریافت کیے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نقشہ سے ان کی تحقیقات ظاہر ہوتی ہیں:-

کل تعداد	تعداد	سبب
۱۴۰۲۲	۵۰۶۱	خواہش نفسانی کے پیچھے خود بخود گھر چھوڑنا۔
	۳۳۶۳	افلاس و ناداری۔
	۳۱۵۴	عاشقوں کا خراب کر کے چھوڑ دینا۔
	۱۶۳۱	عشاق اور رشتہ داروں کا شادی کا وعدہ کر کے دغا کرنا۔

مسٹر میرک تحریر کرتے ہیں کہ ان میں ۴۷۹۰ عورتیں یعنی ایک ثلث کے قریب ایسی ہیں جن کا چال چلن مردوں نے خراب کیا اور ۱۱۲۳۲ ایسی ہیں جو دیگر اسباب کی بناء پر کسبیاں بنیں۔ مصنف موصوف نے یہ بھی ظاہر کیا ہے جو کسبیاں اپنے پیشہ کا سبب مفلسی و ناداری بتاتی ہیں وہ درحقیقت سست اور کاہل تھیں اور محنت مزدوری سے جی چراتی تھیں۔

مسٹر لوگان (Logan) ایک انگریز پادری نے جو شہر میں کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے حسب ذیل تقسیم کی ہے:-

(۱) ایک چوتھائی ایسی ہیں جو میخانوں اور بوزہ خانوں میں کام کیا کرتی تھیں اور اس طرح خراب ہو کر کسبی بن گئیں۔

(۲) ایک چوتھائی وہ عورتیں ہیں جو دکانوں اور کارخانوں وغیرہ میں کام کیا کرتی تھیں اور وہاں خراب ہو کر کسبی ہوئیں۔

(۳) ایک چوتھائی کے قریب ایسی لڑکیاں ہیں جنھیں کٹنیاں دیہات اور قصبات وغیرہ سے بھگا کر لائیں۔

(۴) بقیہ تعداد ایسی عورتوں کی ہے جن سے بوجہ سستی و کاہلی ایمان دارانہ کام نہ کیا گیا۔ یا بد مزاجی کے باعث کہیں نوکر نہ رہ سکیں یا جن سے مردوں نے شادی کے جھوٹے وعدے کرکے خراب و گمراہ کیا۔

امریکہ کے شہر نیویارک میں مسٹر سینگر (*Sanger*) نے ان اسباب کی تحقیقات کی تو نتیجہ یہ نکلا:-

کل تعداد	تعداد وار	سبب
۲۰۰۰ عورتیں	۵۲۵	مفلسی و ناداری
	۵۱۳	شوق
	۲۵۸	عشاق کا خراب کرکے چھوڑ دینا۔
	۱۸۱	علت شراب خواری۔
	۱۶۴	والدین، عزیزوں یا شوہروں کا بُرا برتاؤ۔
	۱۲۴	تن آسانی و عیش پسندی۔
	۸۴	صحبتِ بد۔
	۷۱	اغوا۔
	۲۹	سستی و کاہلی۔
	۲۷	زنا بالجبر۔
	۱۶	جہاز پر مردوں کا خراب کرنا۔
	۸	بورڈنگ میں مردوں کا بہکا کر خراب کرنا۔

حال ہی میں امریکہ کے پروفیسر ووڈس ہچنسن (Woods Hutchinson) نے دنیا کے تیس بڑے بڑے عالمگیر شہروں کے نمایندوں سے قحبگی کے اسباب کے متعلق چند سوالات کیے اور ان کے جوابات پر حسب ذیل نقشہ مرتب کیا گیا۔

اسباب و علل	تعداد فی صدی
شوق نمائش، تعیش و کاہلی	۱ و ۴۲
گھر کا خراب ماحول	۸ و ۲۳
عشاق کا خراب کرنا	۳ و ۱۱
بے کاری	۴ و ۹
خاندانی پیشہ	۸ و ۷
جذبۂ شہوانی	۶ و ۵

۱۸۸۰ء میں اطالیہ کی رجسٹر شدہ کسبیوں سے جن کی عمریں سترہ سال سے زیادہ تھیں دریافت کر کے فیربانی نے حسب ذیل نقشہ مرتب کیا:۔

کل تعداد	تعداد	اسباب و علل
۱۰۴۲۲	۲۷۵۲	شوقِ گناہ۔
	۲۱۳۹	والدین یا شوہر وغیرہ کی وفات۔
	۱۶۵۳	چاہنے والوں کا بہکا کر خراب کر دینا۔
	۹۲۷	نوکری کے سلسلہ میں خراب ہونا۔
	۷۹۴	والدین یا شوہر وغیرہ کا چھوڑ دینا۔
	۶۹۸	عیش پسندی
	۶۶۶	عاشق یا گھر سے باہر کسی مرد کا بہکانا۔
	۴۰۰	والدین یا شوہر کا بہکا کر اس پیشہ کے لیے مجبور کرنا۔
	۳۹۳	والدین یا بچوں کی پرورش۔

فیڈیرو (Federow) نے سنہ ۱۹۰۱ء میں روس کی کسبیوں کے متعلق حسب ذیل نقشہ مرتب کیا تھا:۔

اسباب	تعداد فی صدی
ناکافی مزدوری	۳۸ ، ۵
شوق تفریح	۲۱ ، ۰
نوکری چھوٹ جانا	۱۴ ، ۰
دیگر عورتوں کا بہکانا	۹ ، ۵
جوش انتقام	۵ ، ۵
شراب خوری	، ۵

فحبگی کے اقتصادی اسباب

فحبگی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوتے اکثر مصنفین و محققین نے لکھا ہے کہ اس مذموم پیشہ کی بنیاد اقتصادیات پر قائم ہے۔ یعنی عورتیں عموماً مفلسی و ناداری کی وجہ سے یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ حالانکہ جب خود ان سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تر یہ بتاتی ہیں کہ دیگر ذرائع سے وجہ معاش حاصل کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ اس لیے وہ یہ پیشہ کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرا کہ پیرنٹ دوشاٹلے نے لکھا تھا کہ:۔

"پیرس میں خصوصاً اور دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں عموماً فحبگی کے اسباب میں اس سے زیادہ مؤثر سبب اور کوئی نہیں کہ عورت کے پاس حصول معاش کا کوئی ذریعہ نہ ہو یا اگر ہو تو کافی نہ ہو۔"

انگلستان کے متعلق شیرویل (Sher Well) نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا یعنی "اخلاقِ عامہ کے حسن وقبح کا انحصار وجہ معاش کی وسعت وتنگی پر ہے"۔ یہی خیال امریکہ کے بارے میں بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہی سبب برلن میں پیش کیا جاتا ہے کہ جب روزگار یا کاروبار خراب ہوتا ہے تو کسبیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے جاپان میں بھی ان کی کثرت کا باعث "مفلسی ناداری" بتایا جاتا ہے۔

الغرض تقریباً ہر جگہ کے محققین نے یہی بتایا کہ قحبگی میں کمی زیادتی کے اسباب اقتصادی ہیں یعنی مفلسی و ناداری یعنی روزگار یا کاروبار کی خرابی سے جب آمدنی یا مزدوری کم ہو جاتی ہے تو عورتیں کسبی بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

افلاس اور قحبگی

لیکن جب اس بیان کی جانچ اُن نتائج کی روشنی میں کی جاتی ہے جو مختلف محققین نے فرداً فرداً اخذ کیے ہیں تو اُس کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً استراہمبرگ (Stro Humberg) نے جب ۴۶۲ کسبیوں کے حالات کی نہایت غور کے ساتھ تفتیش کی تو ان میں صرف ایک عورت ایسی نکلی جس نے اپنی قحبگی کا سبب مفلسی و ناداری بیان کیا اور جب مزید تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس ایک عورت نے بھی جھوٹ بولا تھا۔

اسی طرح ہیمر (Hammer) نے جرمنی کی ۹۹ رجسٹری شدہ کسبیوں کے حالات کی تفتیش کر کے معلوم کیا کہ ان میں ایک عورت بھی ایسی نہ تھی جس نے مفلسی و ناداری سے مجبور ہو کر یا کسی بچہ کی پرورش کے لیے قحبگی اختیار کی ہو۔ بلکہ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جو مالدار ہونے کے باوجود بدکار ہو گئی تھیں، اور بعض تو

ایسی تھیں جو کوئی معاوضہ طلب نہ کرتی تھیں۔

پادری بشمان جن کا تعلق برلن کے میگڈیلینی ہوم (کسبیوں کے نجات خانے) سے ہے فرماتے ہیں کہ:۔

"عورتیں حاجت مندی کی وجہ سے قحبگی پیشہ اختیار نہیں کرتیں بلکہ عام اصول اخلاق کی طرف سے بے پرواہ ہو کر وہ ایسا کرتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برلن میں جب کوئی عورت بحیثیت کسبی اپنا نام درج رجسٹر کراتی ہے تو اسے موقع دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی "نجات خانہ" میں جاکر ایماندارانہ کام کرے لیکن دس برس کے تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگرچہ اس دوران میں ہزار ہا کسبیاں رجسٹرڈ ہوئیں لیکن ان میں صرف دو ایسی نکلیں جنہوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔"

انگلستان کی بھی یہی حالت ہے اور یورپ کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی ہے بلکہ ان بدقسمت عورتوں کو حرام کاری کا کچھ ایسا چسکا پڑ جاتا ہے کہ وہ "نجات خانوں" (Rescue Home) سے نکل کر پھر قحبگی پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً میڈ رڈ کی نسبت برنالڈو ڈی کو ٹروس اور لاناس ایگوئلا نیڈو نے بیان کیا ہے کہ:۔

"کسبیاں جب "نجات خانوں" میں داخل ہو جاتی ہیں تو باوجود اس امر کے کہ وہاں ان کی بے حد خاطر مدارات ہوتی ہے، موقع پاکر نکل جاتی ہیں۔"

ان تمام واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہر چند اسباب قحبگی میں اقتصادی مشکلات ضرور شامل ہیں لیکن اس قدر نہیں جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

یورپ میں کسبیوں کی کثرت

یورپ میں فاحشہ عورتیں تجارت و حرفت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہیں۔ ان میں زیادہ عورتیں یا لڑکیاں ہیں۔ جو کارخانوں، دوکانوں یا ہوٹلوں میں کام کرتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان مقامات میں عورتوں کو مستقل کام نہیں ملتا، چار دن کام سے لگی رہتی ہیں تو چار دن بے کار بیٹھی رہتی ہیں، اس لیے بہت سی زنانہ ٹوپیاں بنانے اور پوشاک پر ساز ٹانکنے والیاں فصل ختم ہونے کے بعد کسبیاں بنجاتی اور جب فصل پھر شروع ہوتی ہے تو اپنا کام کرنے لگتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورتیں دن بھر محنت کرتی ہیں لیکن شام کو اتنی اجرت نہیں ملتی جو ضروریاتِ زندگی کے لیے کفایت کر سکے۔ اس لئے وہ مجبوراً رات کے وقت گلی کوچوں اور بازاروں میں ادھر اُدھر پھر کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں۔

کُلبرگ (Kullberg) ملک سوئڈن کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"وہاں تیرہ ۱۳ سے سترہ ۱۷ سال عمر کی لڑکیاں جو اپنے والدین کے گھروں میں نہایت عیش و آرام کے ساتھ رہتی ہیں، اکثر بازاروں میں آکر شوقیہ طور پر مبتلائے فحش ہوتی ہیں۔"

ڈبلیو ایکٹن (W. Acton) نے اپنی کتاب "قحبگی" (Prostitution) مطبوعہ ۱۸۷۰ء میں لندن کی قحبگی اور حرام کاری کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"حرام کاری زندگی کا ایک ایسا عارضی وقفہ ہے جس سے برطانیہ کی بے شمار عورتیں گزرتی ہیں۔"

لیکن تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف انگلستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی زیادہ تعداد ایسی ہی عورتوں کی ہے۔ اس کے متعلق ہم فرانس کے زبردست اور مستند محقق پیرنٹ و دشاتلے کی سند پیش کرتے ہیں جس نے لکھا ہے کہ:-

"اکثر عورتوں کے لیے قحبگی اور حرام کاری کا ایک عارضی زمانہ ہوتا ہے بعض عورتیں عموماً پہلے ہی سال تائب ہو جاتی ہیں اور زندگی بھر تو شاذ و نادر ہی کوئی عورت حرام کار رہتی ہو"

اسی سلسلہ میں بعض دیگر اقوال و بیانات بھی قابل ذکر ہیں۔ مثلاً پوتن نے فرانس کے شہر لائنس (Lyons) کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"یہاں منجملہ ۲۰۰۴ فاحشہ عورتوں کے ۱۹۴۳ نے یہ شغل بالکل ترک کر دیا تھا۔ پیرس میں بھی کسبیوں کی بہت بڑی تعداد نے یہ پیشہ ترک کر کے دیگر باعزت پیشے اختیار کر لیے تھے"

سلوجیٹ (Sloggett) نے شہر ڈیون پورٹ کے متعلق لکھا کہ:-

"یہاں منجملہ ۷۰۰ کسبیوں کے ۲۵۰ نے نکاح کر لیا تھا اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ کسبی جب کسی سے نکاح کرتی ہے تو دیکھ بھال کر ایسے شخص کے ساتھ کرتی ہے جہاں وہ عیش و راحت اور عزت و نعمت کے ساتھ زندگی بسر کر سکے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ملازمت کر لیتی ہیں یا کوئی اور پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر کسی نے جوانی میں کچھ زر ذخیرہ جمع کر لیا ہے تو وہ حمام، یا ہوٹل وغیرہ کھول لیتی ہے لیکن رجسٹری شدہ کسبیوں میں ایسی عورتوں کی تعداد دو فی صدی سے زیادہ نہیں"

اس خیال کی تردید کہ عورتیں مفلسی و ناداری کی وجہ سے کسبیاں بن جاتی ہیں اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ان میں زیادہ تعداد ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو شریف اور امیر گھروں میں کام کاج کیا کرتی ہیں۔ پھر گھر والوں کو اقتصادی مشکلات پیش آئیں یا نہ آئیں لیکن پیشہ خدمتوں اور ماماؤں کو کبھی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ انھیں کھانے کی فکر ہوتی ہے نہ مکان کی۔ علاوہ ازیں وہ بے کار بھی کبھی نہیں رہتیں۔ کیوں ان کی ہر جگہ مانگ ہے۔ لیکن بایں ہمہ کسبیوں میں ایسی ہی عورتیں زیادہ نظر آتی ہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اقتصادی اسباب ہی کی بنا پر عورتیں کسبیاں نہیں بن جاتیں، بلکہ اس کے اسباب کچھ اور بھی ہیں۔

آرتھر شیر ویل (A. Sher Well) نے اپنی کتاب "مغربی لندن کی زندگی" (Life in W. London) میں لکھا ہے کہ:۔

"ویسٹ اینڈ لندن کے گلی کوچوں میں جس قدر بدکار عورتیں نظر آتی ہیں ان میں اکثریت (اور بقول سالویشن آرمی ۸۰ فی صدی) ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو گھروں میں کام دھندا کرتی ہیں۔"

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل غور ہے کہ خادمائیں اپنے طرز زندگی اور طریق معاشرت میں بمقابلہ دوسری عورتوں کے کسبیوں سے زیادہ ملتی جلتی ہیں اور کسبیوں کی طرح ان عورتوں کی اُمت بھی جداگانہ ہے۔ یہ عورتیں خاص خاطر مدارات یا احترام و اکرام کی مستحق نہیں سمجھی جاتیں۔ بعض ممالک میں ایسی خادمائیں بھی کسبیوں کی طرح رجسٹری شدہ ہوتی ہیں۔ اس قسم کی عورتیں منحول عورتوں کے

پاس رہ کر زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کی شائق ہو جاتی ہیں لیکن چونکہ وہ فیشن کا پورا خرچ نہیں اُٹھا سکتیں اس لیے کسبی بن جاتی ہیں۔ ان میں عموماً شوقِ نمائش اور تقلید کا شوق ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے اور یہی باتیں عام کسبیوں میں پائی جاتی ہیں۔ ڈی رائیکیری (De Rychere) نے ایسی عورتوں کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"یہ بداخلاق نہیں ہوتیں بلکہ ان میں کسی قسم کا اخلاق ہی نہیں پایا جاتا"

پیرس کی کسبیوں کی نسبت پیرنٹ دو شاٹلے کا قول ہے کہ ان میں سب سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جو پہلے گھروں میں نوکریاں کرتی تھیں اور کمنجہ (Commenga) نے لکھا ہے کہ:۔

"پیرس کی ان عورتوں میں جو بغیر لائسنس حرام کاری کرتی ہیں، پچاس فی صدی تعداد ان عورتوں کی ہے جو پہلے گھروں میں ملازم تھیں"

فرانس کے شہر بورڈو (Bordeaux) کی نسبت جینل (Jeannel) نے لکھا ہے کہ:۔

"سنہ ۱۸۶۰ء میں ان کے اندر چالیس فی صدی تعداد ان عورتوں کی تھی جو پہلے گھروں میں نوکریاں کرتی تھیں، ان کے بعد نمبر درزنوں کا تھا (سینتیس فی صدی)

انیسویں صدی کے وسط سے پہلے لیپرٹ (Lippert) نے جرمنی اور گروس ہافنجر (Gr. Hoffinger) نے آسٹریا کے متعلق لکھا تھا کہ:۔

"یہاں کسبیوں میں سب سے زیادہ تعداد ان عورتوں کی ہے جو پہلے

معزز گھرانوں میں ماما ئیں تھیں۔"

۱۸۹۸ء میں بلاشکو (Blashko) نے لکھا تھا کہ:۔

"برلن کی کسبیوں میں پیشہ خدمتوں کی تعداد اکیاون فی صدی ہے

اور وائنا میں ۵۸ فی صدی ہے۔"

انگلستان میں دارالامراء کی ایک منتخب کمیٹی نے قانون تحفظ بچگان کے متعلق جو رپورٹ مرتب کی تھی اس میں لکھا تھا کہ:۔

"کسبیوں میں ساٹھ فی صدی عورتیں ایسی ہیں جو پہلے گھروں میں ماما ئیں تھیں"

اور ایف ریمو (F. Remo) نے ان کی تعداد اسّی فی صدی لکھی ہے۔

مغربی لندن میں تو غالباً ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہو گی۔

تمام لندن کے متعلق میریک (Merrick) نے جو اعداد و شمار فراہم کیے تھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ منجملہ ۱۴۷۹۰ کسبیوں کے ۵۸۲۳ عورتیں سابق خادمہ کی حیثیت سے کام کر چکی تھیں، دھوبنوں کا نمبر دوسرا اور درزنوں کا نمبر تیسرا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس طبقہ میں ماماؤں کی تعداد ۴۰ فی صدی سے زیادہ ہے۔

امریکہ کے متعلق ڈاکٹر سینگر (Sager) نے لکھا ہے کہ:۔

"یہاں کی کسبیوں میں پیش خدمتوں کی تعداد ۳۴ فی صدی ہے اس کے بعد درزنوں کا نمبر آتا ہے۔"

اور گڈ چائلڈ (Good Child) نے شہر فلاڈلفیا کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"یہاں کی کسبیوں میں ماما ئیں نسبتاً سب سے زیادہ ہیں۔ یہی حالت تقریب قریب ہر ملک کی ہے۔"

نام ملک	نام محقق	تعداد	کیفیت
اطالیہ	تامیو (Tammeo)	۲۸ فیصدی	مامائیں
"	"	۱۷ "	درزنیں وغیرہ
سارڈینیا	ٹے مانٹی گیزا (Mantegeza)	اکثریت	دیہاتی خادمائیں
روس	فیاڑو (Fiaux)	۴۵ فیصدی	مامائیں
میڈرڈ (ہسپانیہ)	ایسلافا (Eslava)	۲۷ "	خادمائیں
سویڈن	ویلانڈر (Welander)	۶۲ "	"

قحبگی علم الحیوٰۃ کے نقطۂ نظر سے

فصل اوّل میں قحبگی کے اقتصادی اسباب پر کافی بحث ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے جو محققین کے سامنے عرصۂ دراز سے زیر بحث ہے وہ یہ کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے کسبیاں کس حد تک اپنے مذموم پیشہ کی طرف مائل ہوتی ہیں یعنی کیا بعض عورتیں ماں کے پیٹ سے کوئی ایسی خصوصیت لے کر آتی ہیں جس سے وہ آیندہ زندگی میں کسبی بن جاتی ہیں؟ یہ امر تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اقتصادی و دیگر اسباب عورتوں کے چال چلن پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسی کتنی عورتیں ہیں جو غیر معمولی پیدائشی خصوصیات کے باعث قحبگی اختیار کر لیتی ہیں۔

قحبگی میں حیاتیاتی عنصر

بعض ماہرین فن اور محققین کا یہ خیال ہے کہ جس طرح بعض مردوں میں جرائم پیشگی کی طرف پیدائشی رغبت ہوتی ہے، اسی طرح بعض عورتوں میں بھی فحاشی کی طرف

فطری میلان پایا جاتا ہے۔ مثلاً جن خاندانوں میں مرد فطری میلان کے باعث جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں ان خاندانوں کی عورتیں بھی پیدائشی بدکار ہوتی ہیں لیکن بعض محققین نے اس خیال کی تردید کی ہے۔

اس نظریہ کی حمایت سب سے زیادہ لومبروز (Lombroso) نے کی ہے کہ:-

"عورتوں میں مجرمیت کی قائم مقام فحاشی ہوتی ہے"

اپنے اس قول کی تائید میں اس نے ڈوگڈیل (Dugdale) کے ان نتائج کو پیش کیا ہے جو خاندان جیوکس (Jukes) کے افراد کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اخذ کیے گئے تھے۔ اس خاندان کے متعلق انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ:-

"اس خاندان میں بھائی تو عادی جرائم پیشہ ہیں اور بہنیں تمام بدکار"

اس خاندان کے حالات دیکھ کر لومبروزا اور فریرو (Ferrero) نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ:-

"ایک پیدائشی مجرم اور پیدائشی فاحشہ بلحاظ نفسیات و بلحاظ تشریح الاعضاء اخلاقی پاگل ہیں، دونوں میں وہی احساس اخلاق کا فقدان، وہی سنگدلی، وہی میلان بدکاری، وہی تلون مزاجی، وہی تن آسانی اور وہی عارضی اور سطحی مسرتوں کا شوق، اور وہی خود بینی و خود نمائی ہوتی ہے۔ گویا قحبگی نسوانی پہلو ہے مجرمیت کا اور نفسیاتی لحاظ سے ایک رنڈی قحبہ، جرائم پیشہ مخلوق ہے۔ اگر وہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتی تو یہ اس کے جسمانی

ضعف ناتوانی کا باعث ہے یا اس کی عقلی کمزوری کا سبب۔"

ڈبلو فشر (W. Fisher) نے اپنی کتاب (Disprostitution) میں لکھا ہے کہ "قحبگی عین مجرمیت ہے۔" یہی بات فیرے (Fere) نے اپنی دلچسپ کتاب "(Deginoresea Anminalite)" میں لکھی ہے کہ:۔

"قحبگی اور مجرمیت دونوں ایک ہیں۔ کسی فاحشہ عورت یا کسی مجرم سے دین کا فائدہ ہے نہ دنیا کا۔ لہٰذا دونوں معاشرت کے دشمن ہیں۔"

لیکن بعض محققین کا خیال اس کے قطعی خلاف ہے۔ ان کے نزدیک کسبی چور نہیں ہوتی بلکہ وہ چوروں سے نفرت کرتی ہے۔ بانگارٹن (Bamgartin) نے آٹھ ہزار کسبیوں کی نسبت تحقیقات کی، مگر ان میں بہت ہی کم تعداد مجرموں کی پائی۔

کسبیوں میں خواہشاتِ نفسانی

محققین کے نزدیک یہ مسئلہ بھی عرصۂ دراز سے بحث طلب ہے کہ کیا کسبیوں میں خواہشِ نفسانی زیادہ ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جاتا ہے، موراشو (Morasso) اور دیگر محققین کا قول یہ ہے کہ ان میں خواہشاتِ نفسانی کی شدت ہوتی ہے، اور اسی لئے اس ذلیل پیشہ کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ لیکن بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ ان میں عموماً خواہشِ مواصلت قریب قریب مفقود ہوتی ہے۔ لومبروزو کا یہی قول ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کے لحاظ سے یہ سرد ہوتی ہیں اور اس کی تائید میریک (Merrick) کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جنہوں نے لندن کی تقریباً

سولہ ہزار کسبیوں کا مطالعہ کرکے لکھا ہے کہ انھوں نے صرف چند کسبیاں ایسی پائیں جو خواہش شہوانی کی شدت سے مائل بہ قحبگی ہوئی ہوں۔

راسی بورسکی (*Baci Borski*) نے پیرس کی کسبیوں کے بارہ میں بھی یہی بیان کیا ہے کہ :-

"ان میں ایسی تعداد بہت کم ہے جو محض شدتِ خواہش کے باعث قحبہ بنی ہوں"

اسی طرح کومنجو (*Commenjau*) نے تجنیس پیرس کی کسبیوں کا بے حد تجربہ ہے یہ بیان کیا ہے کہ قحبگی کے اسباب میں خواہش نفس کی شدت چنداں اہمیت نہیں رکھتی وہ لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے ہزاروں سے دریافت کیا لیکن ایسی بہت کم نکلیں جنھوں نے خواہش نفسانی کی تسکین کے لیے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ایسے معاملات میں عورتیں بہت کم صاف گوئی سے کام لیا کرتی ہیں مگر میرے خیال میں انھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔"

لیکن جہاں تک غور کیا گیا ہے ان لوگوں کا استدلال صحیح نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال ایسی عورتوں کے بیانات پر مبنی ہیں جن کی عمریں اسی کام میں گزر گئی ہیں اور اب بوجہ سن رسیدگی ان کی خواہش نفسانی سرد ہو گئی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ صحیح جذبات کی بناء پر ان کو بہت کم رغبت ہوتی ہے جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کے تعلقات پیشہ کے لحاظ سے بہت سطحی ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اس حرکت کو بہت کمسنی کے عالم میں شروع کر دیتی ہیں جب اعضا میں پوری طرح پختگی بھی پیدا نہیں ہوتی، اس بقیہ کی

عورتوں میں عام طور پر دماغی لحاظ سے بہت سطحیت پائی جاتی ہے اور یہی باعث ہے کہ ان میں جذباتِ نفسانی بھی ضعیف ہوتے ہیں لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، کیونکہ برعکس اس کے بعض کسبیوں میں یہ جذبہ بہت قوی ہوتا ہے۔ علی الخصوص وہ جن کی صحت اچھی ہوتی ہے اور نشو ونما مکمل!

یہ بات عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ ان میں سے اکثر جسمانی لحاظ سے بہت مضبوط و توانا ہوتی ہیں اور اس لیے وہ اپنے پیشہ کے تمام خطرات کو آسانی سے برداشت کر لیتی ہیں اور اگرچہ کثرتِ فحش کے باعث ان کی طبیعتیں سرد اور اُن کے نازک اعضاء سخت ہو جاتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ان کی خواہش شہوانی قطعی غائب ہو جاتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ بلحاظِ پیشہ ان کو ہر شخص سے لطف حاصل نہیں ہوتا اور اسی لیے وہ اپنی لطفِ صحبت کے لیے کسی ایک کو مخصوص کر لیتی اور اس سے وہ اسی طرح سچی محبت کرتی ہیں، جیسے کوئی شریف بیوی اپنے شوہر سے کرتی ہے۔

ایک جرمن کسبی سے ایک مرتبہ اسی بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے صاف صاف بیان کیا کہ:۔

> "پیشہ اور چیز ہے اور محبت دشوق اور۔ پیشہ کے لحاظ سے جو فعل کرنا پڑتا ہے اس سے دل خوش نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسری عورتوں کی طرح خود بھی کوئی "شوہر" نہ رکھیں۔ آخر ہم لوگ بھی تو دل اور دل میں جذبات رکھتے ہیں ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ کسی خاص شخص سے محبت کریں۔"

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب "تعلقاتِ شہوانی اور سوسائٹی" میں اپنے ایک نامہ نگار کا مراسلہ درج کیا ہے جس کو نہ صرف انگلستان بلکہ جرمنی، بلجیم، ہالینڈ اور فرانس کی کسبیوں کا بھی بہت کافی تجربہ حاصل ہے، مراسلہ مذکور سے ظاہر ہوتا ہے کہ بمقابلہ اور ممالک انگلستان کی پیشہ ور عورتیں خواہشاتِ نفسانی کا اظہار طبعی طور پر بہت کرتی ہیں۔ نامہ نگار مذکور لکھتا ہے کہ:۔

"کسبیوں میں کسی قسم کی خواہش نفسانی ظاہر نہیں ہوتی، میں نے کسی ملک کی کوئی کسبی ایسی نہیں پائی جو دل کھول کر ملتی ہو۔ لیکن انگلستان میں ضرور یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص محبت اور شفقت سے پیش آئے اور یہ بھی ظاہر کر دے کہ اُسے محبت کی ضرورت ہے، تو پوری بے تکلفی سے ملتی ہیں۔ دوسرے پیشوں کی طرح اس پیشہ میں بھی لاگ ڈانٹ ہوتی ہے، اور ہر کسبی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دل خوش کر کے دوسری کسبی کے آدمی کو توڑ لے یا اپنے آدمی کو کسی اور کے پاس نہ جانے دے۔"

بہر حال تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ اوائل عمر میں کسبیوں کے اندر جذباتِ نفسانی ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں یا آگے چل کر بعض میں باقی رہیں یا نہ رہیں، لیکن ان میں خواہشِ نفسانی کم و بیش ہوتی ضرور ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ ان خواہشات کی طرف سے بے پروا ہو جائیں۔

نفسیاتی خصوصیات: ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا نفسیاتی یا جسمانی ساخت کے لحاظ سے ان کی دنیا الگ ہے؟ اس مسئلہ پر بھی محققین میں باہم سخت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی دنیا ہی نرالی ہے اور بعض کا قول

ہے کہ یہ بھی عام عورتوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نفسیاتی اور جسمانی حیثیت سے حد درجہ گری ہوئی اور مبتذل ہوتی ہیں، لیکن بعض کا قول ہے کہ ان میں صرف حُسنِ معاشرت اور اخلاق کی کمی ہوتی ہے ورنہ ان میں اور دوسری عورتوں کوئی فرق نہیں۔

محققین نے بڑی چھان بین کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بُری بھلی دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً دیپائن (Doepine) نے فرانس کی کسبیوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان کے عیوب و محاسن دونوں شمار کیے ہیں وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ان میں حسب ذیل عیوب ہوتے ہیں (۱) حرص و آز۔ (۲) شوقِ مے خواری (۳) دروغ گوئی۔ (۴) غیظ و غضب۔ (۵) فقدان ترتیب و سلیقہ۔ (۶) تلون مزاجی (۷) فقدان دلولہ۔ (۸) استلذاذ باشل یا بالنفس کا رجحان۔

اس کے ساتھ ہی ان میں بعض اوصافِ حمیدہ بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (۱) ماں باپ کی محبت۔ (۲) ایک دوسرے کے ساتھ حُسنِ سلوک (۳) باہمی فیاضی اور دریا دلی۔ (۴) ایک دوسرے کی تنقیص سے پرہیز۔ (۵) دینداری۔ (۶) خودداری و سنجیدگی۔ (۷) عام دیانتداری۔

لومبروزو (Lombrozo) کا قول ہے کہ قحبگی کی بنیاد "اخلاقی حماقت" پر ہے۔ اگر اس "اخلاقی حماقت" (Moral Idiocy) کا تعلق زیادہ تر "دیوانگی" سے ہے تو ہم اس قول کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ قحبگی اور دیوانگی میں کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور تامیو (Tammeo) نے اپنی

کتاب (La Prostitution) میں دکھایا ہے کہ قحبگی اور دیوانگی میں نسبت معکوس ہے۔ یعنی جب لوگوں میں دیوانگی کی کثرت ہوتی ہے تو کسبیوں کی تعداد میں کمی ہو جاتی ہے لیکن اگر "اخلاقی حماقت" کے معنی "اخلاقی کمزوری" کے ہیں یعنی قواعد و ضوابط تہذیب و تمدن سے بے پروائی اور شرم و حیا کی طرف سے بے حسی، تو یہ قول کسی حد تک سچ ہے، کیونکہ یہ کمزوری کم و بیش اکثر کسبیوں میں پائی جاتی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو عورت اپنی عصمت حقیر فائدے کے عوض نذر کر دے وہ ضرور پاگل ہے اگر وہ ایسی حرکت محض محبت کے باعث کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بے وقوفی یا غلطی کی۔ کیونکہ ایسی حرکتیں نوجوان اور ناتجربہ کاروں سے اکثر سرزد ہو جاتی ہیں لیکن اگر کوئی عورت دیدہ و دانستہ اور قلیل منفعت سے یا بغیر کسی منفعت کے ایسا کرے تو وہ ضرور پاگل ہے۔ اس بارے میں موسیو کومنجہ (Commenja) نے فرانس کے متعلق جو تجربات لکھے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ موسیو مذکور لکھتے ہیں کہ:۔

"بہت سی لڑکیوں کے نزدیک شرم و حیا اور اخلاق کوئی چیز ہی نہیں انہیں بعض اوقات اپنا جسم ننگا دکھانے میں بھی کسی قسم کی حیا نہیں آتی، اور بعض اوقات وہ اس قدر بے حیا اور بد اخلاق ہو جاتی ہیں کہ وہ خود کو ذرا سے لالچ میں غیروں کے حوالہ کر دیتی ہیں۔ ان لڑکیوں کے نزدیک عصمت کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور بعض اوقات وہ بغیر فائدہ یا بغیر کسی جذبہ کے مرد کی آغوش میں پہنچ جاتی ہیں۔ وہ بعض اوقات اس کام

ہیں حیوانوں کو بھی مات کر دیتی ہیں۔"

ایک لڑکی پندرہ سال عمر کی آرام و راحت سے اپنے والدین کے ساتھ رہا کرتی تھی، اتفاقاً ایک اجنبی سے ملی جس نے اسے صرف "دو فرانک" کھا کر اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ وہ لڑکی بلا پس و پیش فوراً اجنبی کے ساتھ چلی گئی بعدازاں وہ ایسی خراب ہوئی کہ خود مردوں کے پیچھے پھرنے لگی۔ اسی طرح ایک چہاردہ سالہ لڑکی نے جو اپنے والدین کے ساتھ بآرام و راحت رہتی تھی اپنی موتی سی آبرو نہایت بری طرح کھوئی۔ وہ ایک میلہ میں گئی تھی جہاں اسے ایک مرد نے بیر شراب کا صرف ایک جام پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکی کسبیوں سے میل جول رکھنے لگی۔ اسی عمر کی ایک اور لڑکی مقامی میلہ دیکھنے گئی۔ وہاں اس کا ہنڈولہ میں جھولنے کو دل چاہا۔ اس نے ہنڈولہ والے کو محض جھولانے کے عوض میں اپنی عصمت پیش کر دی۔ ایسا ہی ایک دوسری پندرہ سالہ لڑکی نے کیا۔

امریکہ کے ڈاکٹر ڈبلو ٹرویس جب (W. Traves Gibb) نے ۱۹۰۶ء میں میڈیکل ریکارڈ (Medical Record) بابتہ ۲۰ اپریل ۱۹۰۷ء میں تحریر کیا ہے کہ چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ "زنا بالجبر" کے جتنے واقعات ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن میں لڑکی کی رضامندی حاصل کر لی جاتی ہے۔

جسمانی خصوصیات سب سے زیادہ ظاہر اور جاذب نظر چیز انسان کا چہرہ ہے۔ فرانس میں تقریباً ایک ہزار کسبیوں کو پانچ جماعتوں میں درجہ وار

تقسیم کر کے ان کے چہروں پر غور کیا گیا۔ ان میں صرف پچاس فی صدی کسبیاں درجہ اول میں داخل ہو سکیں لیکن ان میں بھی کوئی ایسی نہ تھی جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ وہ مستِ شباب یا صاحبِ حُسن و جمال ہے۔ اسی طرح ووڈس ہچنسن (Woods Hitchinson) نے لندن، پیرس، وائنا، نیویارک فلاڈلفیا اور شکاگو کی بے شمار کسبیوں کو بغور دیکھا، لیکن وہاں بھی وہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ واقعی کسبیوں میں خوبصورت یا کم از کم نظر فریب چہرہ شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ ان میں عام معیارِ حُسن و جمال دوسری عورتوں کے مقابلہ میں بہت پست ہے۔

علاوہ اس کے اگر ان کے دیگر اعضاءِ جسمانی کا بغور معائنہ کیا جائے تو بہت سی اور خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ چنانچہ ڈاکٹر پالائن تار نووسکی (P. Tarnousky) نے روس میں ڈاکٹر بونہوفر نے جرمنی میں۔ فورناساری (Fornasari) آردو (Ardu) جیوفریدار ڈیگری (Giufridaruggeri) و آسکریلا (Ascorilla) نے اٹالیہ میں اور ڈاکٹر پیریٹ الگزینڈر، ڈاکٹر ای۔ ایس۔ ٹلیاف، و ڈاکٹر جے۔ جی۔ کیرنان نے امریکہ میں بہت سی کسبیوں کا معائنہ کیا تو حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) برابر قد و قامت کی عورتوں سے ان میں وزن زیادہ ہوتا ہے (۲) ہاتھ بڑے بڑے ہوتے ہیں لیکن بازو چھوٹے (۳) ٹخنے چھوٹے پنڈلیاں بڑی اور رانیں نسبتاً ان سے بھی بڑی ہوتی ہیں (۴) کھوپڑی کا قطر و محیط نہ صرف معزز عورتوں بلکہ عادی چوروں کے مقابلہ میں بھی کم ہوتا ہے (۵) جبڑے کی ہڈیاں نمایاں

ہوتی ہے (۶) معزز عورتوں کے مقابلہ میں بال زیادہ سیاہ ہوتے ہیں (۷) نہ صرف سر پر، بلکہ پیڑو پر بھی بال زیادہ ہوتے ہیں (۸) آنکھیں بھی زیادہ سیاہ ہوتی ہیں۔

قحبگی کا اخلاقی پہلو

دنیا میں ہمیشہ ایسے معلّمین اخلاق رہے ہیں اور رہیں گے جن کی رائے نہایت صائب تصوّر کی جاتی ہے اور ادارہ قحبگی کے متعلق جو خیالات انھوں نے ظاہر کیے ہیں وہ اس قابل ضرور ہیں کہ ان پر غور و خوض کیا جائے۔ ان لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اگر حفظانِ صحت کے متعلق ضروری انتظامات موجود ہوں تو کسبیوں کا مسئلہ زیادہ سخت نہیں رہتا۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا وجود ایک "معصیت ناگزیر" ہے۔ ایک مفید ادارہ ہے جو معزز گھرانوں کی عصمت و عفت کا پشتیبان ہے اور وحدتِ ازدواج سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کی اصلاح کا ضامن، ایک زبردست مصنّف نے ان کی شاعرانہ تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"کسبی اخلاقِ عامّہ کی بداخلاق نگراں کار ہے"

ایک دوسرے مصنّف کا قول ہے کہ:۔

"یہ ایک مجلسی و معاشرتی مقصد کو پورا کرتی ہے اور وہ دوسری لڑکیوں کی عصمت و عفت کی محافظ ہے۔"

اسی طرح بلزاک (Balzac) نے اپنی کتاب (Physiologie Du. Marraige) میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"وہ خود کو جمہوریت پر قربان کر دیتی ہیں اور اپنے جسموں کو معزز

خاندانوں کا پشتیبان بنا دیتی ہیں"

اسی طرح شوپنہار (Schopenhaur) نے لکھا ہے کہ :-

"یہ وحدتِ ازدواج کی قربان گاہ پر انسانی قربانیاں ہیں"

اسی طرح لیکی (Lecky) نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ اخلاقِ یورپ" میں لکھا ہے کہ :-

"وہ ہر چند بد ترین قسم کا گناہ ہے لیکن پاک دامانی اور نکوکاری کا بڑا محافظ ہے اگر یہ نہ ہوتیں تو بے شمار شادکام خاندانوں کی عصمت و عفت میں داغ لگ جاتا اور جو لوگ اپنی پارسائی پاکدامنی کے غرور میں کسبیوں کو بہ نگاہ نفرت و حقارت دیکھتے ہیں انھیں تجالت کا منہ دیکھنا پڑتا"

قدیم یونانیوں میں فحاشی کے ادارے موجود تھے لیکن انھوں نے ان کو کبھی مضرت رساں صورت اختیار نہ کرنے دی۔ اسی لیئے ان کے ہاں قحبگی کے ادارے سرکاری طور پر قائم تھے، لیکن رومی جو یونانیوں کے شاگرد تھے مگر کسی قدر زاہد خشک واقع ہوئے تھے، ان اداروں کو بلا پس و پیش قبول کرنے کے لیئے پہلے تیار نہ تھے لیکن بعد کو وہ بھی اس نتیجہ پر پہونچے۔ چنانچہ ایک بار ان کے ایک مشہور مدبر دستیاداں نے ایک شخص کو قحبہ خانہ سے نکلتے دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور کہا کہ اگر قحبہ خانہ نہ ہوتا تو یہ شخص اپنے ہمسایہ کی بیوی کے ساتھ سوتا۔

جب دینِ مسیحی کا زور ہوا تو چونکہ جوشیلے عیسائیوں کو نفس کشی میں بے حد غلو تھا اس لیے لازمی طور پر قحبگی کے اثراتِ اخلاقی پر نہایت توجہ ہونے لگی لیکن عوام کا رجحانِ طبع دیکھ کر یہ ناممکن پایا گیا کہ اخلاقی لحاظ سے کسبیوں کے

خلاف فتویٰ صادر کیا جاسکے چنانچہ دو جماعتیں ہوگئیں، ایک وہ جو نفس کشی اور تجرد کے حامی تھے۔ دوسرے وہ جن کے شانوں پر دینی ذمہ داری کے علاوہ تدبر و سیاست کا بارگراں بھی پایا جاتا تھا اور یہ طبقہ فحاشی کے اخلاقی جواز کا بادل ناخواستہ قائل ہوگیا۔ اس کی بہترین مثال ہمیں مشہور و معروف مسیحی سان آگسٹین (Augustine) کی ہستی میں ملتی ہے جو پولس کے بعد تعمیر کلیسائیت کا سب سے بڑا ذمہ دار شخص تھا، اس نے اپنی ایک کتاب میں (جو ۳۸۶ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے کہ:۔

"جس طرح ایک جلاد خواہ اس کا پیشہ کتنا ہی قابل نفرت و حقارت ہو سوسائٹی کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی طرح کسبیاں جن کا پیشہ خواہ کتنا ہی ذلیل و نفرت انگیز ہو نظام معاشرت کے لئے ضروری ہیں۔ آج تم کسبیوں کو دور کردو تو کل ہی تمام دنیا شہوات نفسانی سے پُر ہو جائیگی"۔

مشہور مفکر سان اکوئیناس (Acquinas) کی بھی یہی رائے تھی جو سان آگسٹین کی تھی۔ اس شخص کا قول تھا کہ "اگرچہ بدکاری گناہ کبیرہ ہے لیکن کسبیوں کا وجود اصلاح معاشرت کے لئے ناگزیر ہے۔"

لکوری (Liquari) جو زمانۂ حال کا سب سے زیادہ باثر عالم دینیات تھا، یہی رائے رکھتا تھا۔

الغرض بعض لوگ کسبگی کے خلاف تھے اور بعض اسے "معصیت ناگزیر" خیال کرتے تھے۔ ایک تیسرا طبقہ بھی تھا جس کا قول یہ تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں اگر کسبیاں ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن صرف شہروں کے اندر۔

کسبیوں کے ساتھ تو خیر کلیسا بعض مراعات مدنظر رکھتا تھا۔ لیکن وہ متاہلہ عورتوں کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ الویرہ کی مسیحی مجلس نے فتویٰ دیا کہ اگر کوئی کسبی نکاح کر لے تو اسے بغیر کفارہ برادری میں شامل کیا جا سکتا ہے لیکن قرم ساقوں کو مرتے دم تک یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکتی۔

دنیا میں مقتدایانِ مذہب کا شعار ہمیشہ یہی رہا کہ ان کی پبلک زندگی سے ان کی پرائیویٹ زندگی مختلف رہی ہے۔ چنانچہ کیتھولک پادریوں کا بھی یہی حال تھا، وہ فحاشی کے خلاف تو فتویٰ دیتے تھے لیکن خود اس کے مرتکب ہوتے تھے۔ چنانچہ "اصلاح مذہب" (Refarmation) کے ایک صدی بعد انگلستان میں ایک شخص برٹن (Burton) نے انگلستان میں پادریوں کے خلاف قلم اٹھایا اور انھیں خوب ذلیل کیا۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان میں برنارڈ مینڈیویل (Bernard Mandevalle) نے کسبیوں کی حمایت میں پھر قلم اٹھایا۔ اور اس کے بعد سے تمام پروٹسٹنٹ ممالک میں قحبگی کے ادارے ہو گئے۔

ووڈس ہچنس (Woods Hutchinson) نے کسبیوں کی نسبت لکھا ہے کہ:-

> "ملکی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہیئتِ اجتماعی کے لیے ان کی خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں۔ یہ گویا ادارہ ازدواج کے حق میں ایک "سیفٹی والو" (Safety Value) کا کام دیتی ہیں۔"

فحاشی کا اثر تمدن پر | اخلاقی لحاظ سے تو خیر جواز قحبگی کا فتویٰ دیا ہی دیا جاتا ہے

لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے جو مفکرین نے اس کے جواز کے لیے سوچی ہے وہ کہتے ہیں کہ شب و روز زندگی کی یکسانیت سے انسان کا جی اُکتا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو پُر لطف بنانے کے لیے تنوع کی سخت ضرورت ہے۔

چونکہ شہری زندگی میں کسب معاش کا مقابلہ زندگی کو کسی قدر بدمزہ بنا دیتا ہے اور صبح سے شام تک مردوں کو یکساں کام کرنا ان کے قویٰ کو مضمحل کر دیتا ہے اس لیے قدرتاً ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ تفریح کا سامان بھی بہم پہونچے اور کسبیوں کی وجہ سے مجلسی ربط و ضبط کے مواقع بہت زیادہ حاصل ہو جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے چونکہ شادی کے اسباب آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتے اور شہری زندگی میں نکاح زیادہ عرصہ تک ملتوی رکھا جاتا ہے، اس لیے تقاضائے فطرت پورا کرنے کے ذرائع تلاش کرنا اور زیادہ ناگزیر ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ "یہ ذرائع" سوائے کسبیوں کے اور کیا ہو سکتے ہیں؟

تفریح کا شوق اس میں شک نہیں کہ تمدن کی پیچیدگی کی وجہ سے انسانی نشوونما کو بہت نامکمل مواقع حاصل ہیں اور یہی سبب ہے کہ عورتیں عارضی یا مستقل طور پر فحاشی کی زندگی اختیار کر لیتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی لامعلوم اندرونی تحریک کے باعث جس کی وہ توجیہہ یا توضیح نہیں کر سکتیں، لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد قحبگی پیشہ اختیار کر لیتی ہے۔

میریک (Merrick) نے لندن کی پانچ ہزار کسبیوں کی تحقیقات کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ تقریباً ایک ثلث عورتوں نے خود بخود اپنا گھر "عیش کی زندگی" بسر کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

امریکہ میں ڈاکٹر سینجر (Sanger) نے یہ معلوم کیا کہ جو عورتیں "طبعی رجحان" کے باعث کسبیاں بنیں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور وو ڈس ہچنسن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا بڑا سبب شوق نمائش، عیش پسندی اور تن آسانی ہے۔ بلجیم میں قحبگی اختیار کرنے کا سبب وہ یہ بتاتی ہیں کہ انھیں "کام سے نفرت" ہے یہی حال اطالیہ کا ہے۔ روس میں جب اس کی تحقیقات کی گئی تو دوسرا نمبر ان عورتوں کا تھا جنھوں نے شوقیہ یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔

لندن کے ایک بہت بڑے محقق نے ان کے حالات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اسباب قحبگی میں چہل پہل اور تفریح و دلچسپی کی خواہش کو بڑا دخل ہے کیونکہ عورت کا دل عام مشاغل و افکار سے گھبرا جاتا ہے اور اس کی طبیعت زندگی کے جھگڑوں سے بیزار ہو کر لطف و تفریح کی متمنی ہوتی ہے، چنانچہ بقول ایف شیلر (F. Schiller) یہی سبب ہے کہ ترقی تمدن کے ساتھ کسبیوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ برلن میں چند سال کے اندر اگر عام آبادی کی تعداد دوگنی ہوئی تو ان کی تعداد چوگنی ہو گئی۔

چارلس بوتھ (Charles Booth) نے لکھا ہے کہ ایک کسبی سے کہا گیا کہ "تو یہ ذلیل پیشہ کیوں نہیں چھوڑ دیتی"؟ تو اس نے نہایت صاف جواب دیا کہ:-

"سنیے جناب میرا چاہنے والا روز مجھے کہیں نہ کہیں ڈنر میں لے جاتا ہے اور ڈنر سے فارغ ہو کر ہم کسی تماشہ گاہ میں جا کر تفریح کرتے ہیں، پھر فرمائیے

میری کیا شامت آئی ہے جو میں ایسی پُر لطف زندگی سے دست بردار ہو جاؤں"

خادمائیں کیوں اکثر پیشہ ور بن جاتی ہیں ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں کہ کسبیوں میں زیادہ تر اضافہ اُن عورتوں سے ہوتا ہے جو شریف اور متمول گھرانوں میں پیش خدمت یا ماما کا کام کر چکی ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ کوئی خفیہ تحریک ضرور ایسی ہے جو عورتوں کو قحبگی اختیار کرنے پر مائل کر دیتی ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ عورتیں جو گھروں میں کام کرتی ہیں انھیں تنخواہ دار مزدور سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہ گویا گھر کا کام کاج کرنے والی مشینیں ہیں۔ ہر خادمہ بہت صبح اپنے کام پر پہنچتی ہے اور رات گئے مالک کے گھر سے چھٹکارا ہوتا ہے۔ نیچے آتے جاتے اور ادھر اُدھر پھرتے ٹانگیں ورم کر جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں مالکہ کی بد مزاجی برداشت کرنا اور ملاحیاں سُننا بھی خدمت گاروں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے ان ہی باتوں سے یہ عورتیں تنگ آجاتی ہیں۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ وہ دوزخ اور جنت کے درمیانی طبقہ اعراف میں رہتی ہے یعنی وہ اپنے چاروں طرف عیش و آرام اور ہر قسم کا سامان تعیش دیکھتی ہے لیکن اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ آخر وہ بھی انسان ہے۔ وہ بھی پہلو اور پہلو میں ایک حساس دل رکھتی ہے۔ اس کا دل بھی عیش و آرام اور تفریح کا متمنی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزانہ زندگی کی بے لطفی اور یکسانیت سے اُکتا کر وہ پیشہ اختیار کر لیتی ہے جس میں اس کی تفریح بھی ہوتی ہے اور زندگی بھی عیش و آرام سے گزرتی ہے۔

عورتوں کی تخریب میں مردوں کا ہاتھ بعض اوقات یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کسبیوں میں سابق خادماؤں اور پیش خدمتوں کی کثرت ہونے کا باعث

یہ بھی ہے کہ ایسی لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جنھیں اوّل اوّل ان کے آقاؤں یا خاندان کے دیگر نوجوانوں نے خراب کیا اور اس طرح وہ کسبی بننے پر مجبور ہوئیں اس میں شک نہیں کہ اس میں مردوں کا بہت زیادہ ہاتھ ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان عورتوں کے کسبی بننے کا خاص سبب یہی ہے بلکہ تجربہ بتاتا ہے کہ گھروں کے نوجوان ماماؤں کو خراب نہیں کرتے بلکہ وہ خود انھیں بُرائی کی طرف مائل کرتی ہیں۔

ناجائز بچوں کے متعلق جو اعداد و شمار سرکاری طور پر رکھے جاتے ہیں ان سے بھی اس معاملہ پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً برلن میں ایک سو اٹھاسی عورتوں نے ناجائز بچے جنے جن میں ایک ثلث تعداد خادماؤں اور پچیس خدمتوں کی تھی اور بقیہ میں زیادہ تر وہ لڑکیاں تھیں جو کسی کارخانہ یا دکان میں کام کیا کرتی تھیں ایک سو بیس [۱۲۰] صورتوں میں ان بچوں کے باپوں کی بھی تحقیق ہو سکی۔ ان میں سب سے بڑی تعداد (یعنی تینتیس [۳۳]) کاریگروں کی تھی، ان کے بعد کاروباری لوگوں کا نمبر تھا (بائیس) صرف بیس پچیس [۲۵] آدمی ایسے تھے جنھیں "جنٹلمین" کہا جا سکتا تھا، انیس [۱۹] ایسی تھیں جن میں بچوں کے باپ شادی شدہ تھے۔

محققین کا قول ہے کہ اکثر ممالک میں لڑکیاں عموماً پندرہ [۱۵] و بیس [۲۰] سال کی عمر کے درمیان کسبیاں بن جاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی عصمت و عفت کا خاتمہ اس عمر سے بہت قبل ہو چکتا ہے اور اس آبروریزی میں زیادہ تر ان ہی لڑکیوں کے ہم مرتبہ و ہم طبقہ مردوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عام لڑکیوں کو عموماً عام آدمی ہی خراب کرتے ہیں۔

تمدن عمرانی کی کششیں

فرانس کے شہر بورڈو میں ڈاکٹر جنیل (Gecael) نے قصبیوں کی بہت کافی تحقیقات کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ یہ امر باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ دیہات کی لڑکیاں عموماً اس وجہ سے شہر میں نوکری کرنے جاتی ہیں کہ وہاں پہلے ہی خراب۔ ہو چکی ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں دیہات میں جو طامع سُست اور کم عقل لڑکیاں ہوتی ہیں وہ عموماً شہروں میں نوکری کرنے بھیج دی جاتی ہیں۔

اڈنبرا میں ڈبلیو ٹیٹ (W. Tait) نے معلوم کیا کہ مردوں کے دیگر طبقات سے زیادہ فوجی سپاہی خصوصاً "ہائیلینڈر" (Highlander) کے جوان عورتوں کو بھگا کر خراب کرتے ہیں اور یہی حالت دیگر ممالک کے سپاہیوں کی ہے۔ مثلاً جرمنی میں مسلسل تحقیقات کر کے دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی بسلسلۂ چاند ماری یا نقلی جنگ دیہاتی علاقوں میں فوجیوں کا اجتماع ہو جاتا ہے تو حرام کاری کی بھی کثرت ہو جاتی ہے یہی حال آسٹریلیا کا ہے۔ ڈاکٹر گروس ہافنجر (Gross Haffenger) نے لکھا ہے کہ اس ملک میں جتنے ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں، ان میں کم از کم ایک ثلث کے ذمہ دار فوجی سپاہی ہوتے ہیں۔

اطالیہ میں مارّو (Morro) نے بائیس کسبیوں کے متعلق تحقیقات کر کے لکھا ہے کہ ان میں سے دس لڑکیوں نے نوراً خود کو حوالہ کر دیا تھا، اور دس ایسی تھیں جن سے شروع میں کسی مکّار اور بے وفا عاشق نے شادی کر لینے کا جھوٹا وعدہ کیا اور عصمت دری کی۔ بقیہ دو لڑکیاں ایسی تھیں جن کی آبروریزی کی گئی تھی، ان نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ از ابتدائے دورِ شنزگی کے بعد ہی لڑکی کی

طبیعت میلان جنسی اختیار کر لیتی ہے جسے پورا ہونے کی صرف تین صورتیں ہو سکتی ہیں یعنی شادی جس کا انجام پانا وقت طلب ہے۔ دوم استلذاذ بالنفس یا بالمثل۔ سوم قحبگی۔ مؤخر الذکر صورت چونکہ زیادہ دل فریب ہے۔ لہٰذا لڑکیاں زیادہ تر اسی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

جزیرۂ سارڈینیا میں اسے مانتیگزیا اور ریوفو (Mantegazza Ruffo) نے کسبیوں کی تحقیقات کر کے معلوم کیا کہ یہاں زیادہ تعداد ایسی لڑکیوں کی ہے جو دیہات کی رہنے والیاں ہیں اور جنہیں شروع میں ان کے ہم طبقہ مردوں نے خراب کر دیا تھا۔

الغرض معاشرت عمرانی کی دل فریبی و دل کشی۔ عیش و راحت کی طرف رغبت، پُرہیجان تفریح کا ذوق۔ یہ سب مل کر دیہاتی لڑکیوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں اور کچھ دنوں اِدھر اُدھر خراب پھرنے کے بعد بالآخر کسبیاں بن جاتی ہیں۔

شہر کی لڑکیاں چونکہ اسی ماحول میں پیدا ہوتی اور پرورش پاتی ہیں اس لئے شہری تمدن سے ان کا دل سیر ہوتا ہے۔ وہ شہر کی دلچسپیوں اور تفریحات سے مسحور نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں وہ اس قدر ہوشیار ہوتی ہیں کہ بمقابلہ دیہاتی لڑکیوں کے ان دل فریبیوں کی کشش سے محفوظ رہتی ہیں اور کسبیوں کی زندگی کے اصلی واقعات سے بھی اس قدر واقف ہو جاتی ہیں کہ تاوقتیکہ کوئی خارجی اثر نہ ہو ان کی طبیعت قحبگی پیشہ کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ الغرض شہر کی لڑکی قحبگی کے مضر اثر سے زیادہ محفوظ رہتی ہے۔

عموماً تمام بڑے بڑے شہروں میں دیکھا گیا ہے کہ آبادی کی بہت تعداد

شہر سے باہر پیدا ہوتی ہے اس لیے تعجب کی بات نہیں کہ شہر کی کسبیوں میں بھی زیادہ تعداد باہر والیوں کی ہو۔ اسی سلسلہ میں میریک (Merrick) نے مل بینک جیل میں چودہ ہزار کسبیوں کی تحقیقات کر کے معلوم کیا کہ سب سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی تھی جو اضلاع میں پیدا ہوئی تھیں، اسی طرح لندن میں سات ہزار عورتیں ایسی تھیں جو شہر سے باہر پیدا ہوئی تھیں اور کول چسٹر (Colchester) جیسے لشکری مقامات اور پورٹسمتھ جیسے بندرگاہوں سے بھی پہونچ گئی تھیں۔

ڈاکٹر سینجر نے تحقیقات کر کے معلوم کیا کہ نیویارک کی دو ہزار پیشہ ور عورتوں میں ۱۲۳۸ باہر کی تھیں اور ۷۶۲ وہ ہیں جو ریاست نیویارک میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تعداد شمالی ملکوں سے آتی ہے جہاں کی آب و ہوا خراب و ناخوشگوار ہوتی ہے اور جہاں کے لوگ کارخانوں میں میکانکی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رےلورس (Ross) کا بیان ہے کہ "پیرس کی تقریباً تمام پیشہ ور عورتیں باہر کی ہیں۔" لندن کی ایک ہزار عورتوں میں صرف ۲۰۶، ایسی تھیں جو شہر کی رہنے والی تھیں اور بقول ڈاکٹر پوٹن (Patton) شہر لائنس (Lyons) کی تقریباً چار ہزار ایسی عورتوں میں صرف ۳۷۶ شہر کی رہنے والیاں ہیں۔ اسی طرح ۱۸۱۳ء میں ڈاکٹر شرنیک (Shrank) نے تحقیقات کر کے بیان کیا تھا کہ شہر وائنا کی ڈیڑھ ہزار پیشہ ور عورتوں میں سے صرف ۶۱۵ شہر میں پیدا ہوئی تھیں۔

واقعاتِ بالا سے ثابت ہے کہ تمدن و شائستگی کے دل فریب مناظر ہی عورتوں کو مجبگی کی طرف زیادہ دعوت دیتے ہیں اور مرد بھی ان سے بڑی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ عام اور جاہل لوگوں کا خیال ہے کہ پیشہ ور عورتوں کا وجود صرف اس لیئے ہے کہ وہ نوجوان ناکتخدا مردوں اور اُن مردوں کے لیے جن کی بیویاں نہ ہوں سکون کا باعث ہوں، مگر عقلاء کے نزدیک یہ خیال بالکل مہمل ہے۔ کیونکہ اگر اس اندیشہ سے تمام نوجوان مردوں کی شادیاں صغر سنی میں کر دی جایا کریں تو یہ علاج اصلی بیماری سے زیادہ مضرت رساں ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ جن مردوں کی بیویاں موجود ہیں کیوں فحاشی اختیار کرتے ہیں۔ اس کا جواب اس واقعہ سے دیا جا سکتا ہے جو یورپ کی ایک پیشہ ور عورت ہڈ ویگ ہارڈ (Hed Wig Hard) نے اپنی "آپ بیتی" میں بیان کیا ہے۔

جس شہر میں وہ رہتی تھی وہیں ایک اعلیٰ طبقہ کا شخص بھی تھا جو ایک مرتبہ اس کے یہاں کسی سابق شناسا کے ساتھ آیا اور پھر اسے بار بار آنے کا شوق ہو گیا محبت کے پینگ بڑھے اور دونوں میں نہایت گہرے تعلقات ہو گئے لیکن مرد کی بیوی تھی اور دو خوبصورت بچے بھی تھے۔ دونوں میاں بیوی میں اس قدر اُلفت تھی کہ دیکھ کر لوگ متعجب ہوتے تھے۔ مرد بھی بڑا صاحب علم و فضل شخص تھا ایک دن اس عورت نے دریافت کیا کہ:۔

"مجھے سخت حیرت ہے کہ باوجودیکہ تمہارے گھر میں اس قدر حسین و جمیل بیوی موجود ہے۔ دو پیارے پیارے بچے آگے کھیلتے ہیں پھر تم کو

میرے پاس آنے کا کیونکر حوصلہ ہوتا ہے۔"

یہ بات سن کر وہ مرد ہنسا اور بولا:۔

"یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس بیوی کے حسن وجمال سے میرے دل کو تسکین نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا دل میرے لیے پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، علاوہ ازیں وہ سخت زبان دراز اور بد مزاج ہے۔ ماں باپ نے ناز و نعمت میں پال کر اس کی عادتیں خراب کر دی ہیں اور وہ دنیا میں صرف اپنے لیے جیتی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ مردوں کی بے راہ روی کی ذمہ داری بڑی حد تک بیویوں پر عائد ہوتی ہے جو مردوں کے مزاج و ذوق کا خیال نہ کر کے اپنی طرف سے انھیں بیزار کر دیتی ہیں۔ اگر شروع سے لڑکیوں کی فطرت میں اتنی لچک پیدا کر دی جائے کہ وہ ماحول کے مطابق اپنے عادات وخصائل میں پیدا کر سکیں تو مرد بڑی حد تک فحاشی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

مردوں کی عجیب سائیکالوجی

مرد جب ایک بار سیدھے راستہ سے ہٹ کر غلط راہ اختیار کر لیتا ہے تو اس کی گمراہیاں عجیب وغریب ہوتی ہیں۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ دفعتاً انسان سے حیوان کیونکر بن گیا۔

مغرب کی ایک پیشہ ور عورت نے اپنی "زندگی کا کچا چٹھا" لکھا تھا۔ اس میں سے مندرجہ ذیل اقتباس غالباً باعث دلچسپی ہوگا۔ وہ کہتی ہے کہ:۔

"میں دیہات کی رہنے والی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں کبھی کبھی ایک بوڑھا دولت مند آیا کرتا تھا جو بالکل خوش غلاف ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اس وقت

میری عمر تیرہ[۱۴] سال کی تھی۔ بالآخر یہ شخص گرفتار ہو کر قید ہوا۔ بعد کو میں نے مردوں میں عجیب غریب شوق دیکھے۔ مثلاً میرے یہاں ایک جوان کھیل کے لباس میں آتا اور اپنے ساتھ ایک ٹوکری میں چند کبوتروں کا ایک جوڑا بھی لاتا۔ اس جوان کے آنے کے بعد ہم دونوں بحالت عریانی ایک ایک کبوتر ہاتھ میں لے لیتے اور ان کی گردنیں مروڑ کر زمین پر ڈال دیتے۔ وہ جوان ان کبوتروں کو تڑپتا دیکھا کرتا اور صرف اسی سے اس کے ذوق کو تسکین ہو جایا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ مجھے بازار میں ایک مرد ملا اور بولا کہ اگر آپ پسند کریں تو میرے ساتھ اس ہوٹل میں چلیں وہاں میں آپکے بوٹ چاٹنا چاہتا ہوں۔ معاملہ طے ہو گیا۔ ہم دونوں ایک ہوٹل میں گئے اور نصف پونڈ میں ایک کمرہ لیا۔ میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ مرد میز کے نیچے گھس گیا اور اس نے میرے بوٹ جو کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اپنی زبان سے خوب چاٹے اور چلا گیا۔

ایک صاحب کا شوق صرف اس طرح پورا ہو جاتا تھا کہ وہ منہ میں پیشاب کرا لیا کرتے تھے۔

ایک صاحب کو یہ شوق تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں ایک قینچی لاتے اور میری ساتھی عورت کو خوب پیٹتے حتیٰ کہ بے چاری کے خون نکل آتا۔ عورت کی یہ حالت دیکھ کر ان حضرت کو انتہائی لطف آتا۔"

استلذاذ بالمثل

استلذاذ کی مختلف صورتیں حکماء کا قول ہے کہ جب انسان نشو و نما پاکر جوان ہوتا ہے تو اس کے قوائے جنسی میں تین اہم خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ (۱) استلذاذ بالنفس۔ (۲) استلذاذ بالمثل۔ (۳) استلذاذ بالضد۔

استلذاذ بالنفس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا رجحان جنسی خود اپنی ہی ذات کی طرف ہو اور یہ کیفیت وحشی اقوام میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

استلذاذ بالمثل سے مراد یہ ہے کہ مرد و عورت کا رجحان خود اپنی ہی جنس کی طرف ہو، جو زیادہ تر کمسنی میں پایا جاتا ہے۔ اور استلذاذ بالضد سے وہ فطری تعلق جنسی ہے جس سے ہر شخص واقف ہے۔

چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو عموماً دوسری جنس سے رغبت نہیں ہوتی بلکہ نفرت سی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ استلذاذ بالنفس کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جیسے مساحقہ اور استمناء بالید وغیرہ کہتے ہیں پھر جب نشو و نما میں کچھ پختگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو استلذاذ بالمثل کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور جب پوری طرح پختگی ہو جاتی ہے تو استلذاذ بالضد کی منزل آتی ہے۔

بعض شخص ایسے ہوتے جو ذو جنسین ہوتے ہیں یعنی ان میں دونوں جنسوں کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔

صنمیات اور استلذاذ بالمثل افسوس ہے کہ دیگر فحاشیوں کی طرح اس نوع کی فحاشی نے بھی آغوش مذہب میں نشوونما پائی، یونانی قدیم کی خرافات میں لکھا ہے کہ:۔

"سب سے پہلے آفرودیتہ دیوی (Aphrodite) بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ یورینوس دیوتا نے اختلاط کے لیے اپنی ہی جنس کا ایک فرد پسند کیا تھا۔[1] اس دیوتا کا جذبۂ عشق و محبت مردانہ تھا جس شخص کے دل میں یہ "دیوتائی جذبہ" پیدا ہوتا ہے وہ استلذاذ بالمثل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔"

مشہور و معروف یونانی مؤرخ و سیاح ہیرو ڈوٹس نے سیتھین (Scythians) قوم کا حال لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ان لوگوں میں استلذاذ بالمثل کی نمایاں خصوصیات موجود تھیں وہ لکھتا ہے کہ:۔

"اس قوم کے بعض مردوں میں نسائیت کا مادہ اس قدر پایا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کا لباس پہنتے ہیں اور عورتوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

مؤرخ مذکور نے اس کی عجیب و غریب توجیہ یہ کی ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے بمقام عسقلان، وینس دیوی (Venus (زہرہ)) کا مندر لوٹ لیا تھا۔ اس لیے ان پر دیوی کا قہر نازل ہوا اور اس نے ان کو مرد سے عورت بنا دیا۔

بقراط (Hippocrates) چونکہ مافوق الفطرۃ باتوں کا معتقد نہیں تھا اس لیے اس نے قوم سیتھین کی اس علت کا سبب ضعف

---

(۱) افلاطون کی کتاب "ضیافت" Banquet باب ۸ و ۹۔

رجولیت قرار دیا وہ لکھتا ہے کہ :-

"یہ قوم ضرورت سے زیادہ شہسواری کرنے کی وجہ سے ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا علاج کانوں کے پیچھے کی رگوں میں فصد کھلوا کر خون نکال دینا ہے، اور اس خون کے نکل جانے کا نتیجہ ضعفِ رجولیت ہوتا ہے اور وہ افراد جو اس طرح اپنی قوت کھو بیٹھتے ہیں مایوس العلاج ہو کر عورتوں کا لباس پہن لیتے ہیں۔"

بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ قدیم یونانیوں میں اس کا شوق اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھتی جاتی تھی اور اس کی روک تھام کے لیے وہ لوگ عورتوں سے بچنے لگے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں یونان کے اندر ریاست ہائے بلدیہ کا رواج تھا، اور ایک شہر کے وسائل پیداوار چونکہ صرف محدود آبادی کے لیے کفایت کر سکتے تھے، اس لیے ان لوگوں کو یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ آبادی کی تعداد بڑھنے نہ دی جائے۔ یہی باعث تھا کہ حکیم ارسطو جیسے شخص نے بھی لوگوں کو یہی مشورہ دیا تھا کہ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیں اور استلذاذ بالمثل اختیار کریں۔ لطف یہ ہے کہ ارسطو سے بیشتر حکیم سقراط بھی اس حرکت کو فعل مستحسن قرار دے چکا تھا۔

دیوتیما نے حکیم سقراط کو عشق و محبت کا ایک روحانی اصول بتایا تھا جو استلذاذ بالمثل کے ذریعہ سے ایک اعلیٰ منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور خدا سے ملا دیتا ہے۔ چنانچہ دیوتیما کہتا ہے کہ :-

"جو مرد خواہشاتِ نفسانی کے بندے ہوتے ہیں وہ عورتوں کے پیچھے

دوڑتے ہیں لیکن وہ مرد جو اپنی روح کے وسیلہ سے عشق محبت کرتا ہے اور
جس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ نکوکاری اور فرہنگ و دانش کے ذریعہ سے
ایک صاحب عظمت اور خوبصورت روح حاصل کرے اس کو چاہئے کہ پوری
طرح اس کا تابع ہو جائے۔"

بظاہر تو یہ تعلیم نہایت پاک اور معصومانہ نظر آتی ہے لیکن یہ خیال کر لینا چاہیے کہ
قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خوبصورت روح صرف مرد ہی کے اندر مل سکتی ہے
اب شاید اس تعلیم کا اصلی مفہوم واضح ہو گیا ہوگا یہی قول ڈاکٹر بیٹرائس، ایم ہنکل
کا بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:-

"صاحب عظمت اور خوبصورت "روح" صرف مردانہ صورت میں مل سکتی
ہے۔ عورتیں حیوانی مطلق طبقہ سے متعلق ہیں جو مرد کی صرف خواہشات نفسانی
پوری کرنے کے لیئے وجود میں آتی ہیں۔"

جب قدیم یونانیوں نے عورتوں کی طرف سے غفلت برتنا شروع کر دی تو
عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل کا رواج ہو گیا۔ چنانچہ جزیرہ لیسبوس، ایسی عورتوں
کے لیے خاص طور پر مشہور ہو گیا تھا اور اسی تاریخی واقعہ سے انگریزی کی اصطلاح
Lesbian Love "عشق لسبانی" نکلی ہے۔ سیفو (Sappho)
جو بلبل لیسبوس کے نام سے مشہور تھی اور جس کا زمانہ ۶۰۰ ق-م کے قریب
گزرا ہے وہ اس فن کی بہت بڑی استاد تھی۔ چنانچہ انگریزی میں لفظ
Sapphism (سیفزم) کا مفہوم ہی عورتوں کا استلذاذ بالمثل ہو گیا ہے۔
اس نے اپنے جذبات خصوصی کا اظہار اپنے اس قصیدہ میں کیا ہے جو وینس دیوی

کی شان میں لکھا تھا وہ کہتی ہے :-

"اسے وہ جو پھولوں کے اورنگ عظمت وجلال پر متمکن ہو کر حکومت کر رہی ہے اے وہ جس کی پیدائش کف دریا سے ہوئی ہو بیچارہ ! اور جنت دیوکس میری فریاد سن !! او دیوی ! تو مجھے سخت غم و الم اور دردوں سے ہلاک نہ ہونے دے"

یونانیوں کے نزدیک معیارِ حسن وجمال درحقیقت حسن مردانہ تھا اور اس حسن میں مادۂ ذوجنسیت (Bisexuality) گویا سونے میں سہاگہ تھا، یونان قدیم کے بتوں میں بھی یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اپالو اور دیونسوس کے بتوں میں زنانہ و مردانہ خصوصیات موجود ہوتی تھیں۔ زنانہ بتوں میں بھی مردانہ حسن صورت اور مردانہ تناسب اعضاء کا خیال رکھا جاتا تھا۔

دنیائے قدیم میں غیب دانی اور کہانت کا سب سے بڑا مرکز ڈیلفائی کا مندر تھا۔ اس میں سب سے بڑا بت اپالو تھا۔ اس بت کے حسن وجمال، تناسب اعضا اور خد وخال میں زنانہ اور مردانہ دونوں خصوصیات موجود تھیں۔ یہ بت فن موسیقی اور استلذاذ بالمثل کا خاص دیوتا تھا۔ کیونکہ دراصل یہ ڈورین (Dorians) قوم کا سب سے بڑا بت تھا اور یہی وہ قوم تھی جو خطۂ یونان میں استلذاذ بالمثل کی وبا لائی تھی۔ اپالو کی نسبت یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ اس نے ایک اژدھے کو قتل کیا تھا۔ جس کا خون جسم پر پڑنے سے وہ ناپاک ہو گیا تھا۔ یہ ناپاکی دور کرنے کی غرض سے وہ ایڈمیٹس (Admitus) شاہ فرائی (Phorai) کا نو برس تک معشوق بنا رہا۔

میولر (Muller) نے ڈوزین قوم کے ایک مذہبی تہوار کا حال بیان کیا ہے جس میں ایک خوبصورت لڑکا اپالو کا روپ بھرتا تھا اور جس طرح اپالو نے آسٹیس (Alcestis) کا غلام اور معشوق بن کر اس کی نہایت ذلیل خدمت انجام دی تھی اسی طرح یہ بھی کرتا تھا۔

ڈاکٹر بلاخ (Blach) کا خیال یہ ہے کہ چونکہ استلذاذ بالمثل قدیم زمانہ کی اقوام و ملل کے نزدیک ایک عجیب اور ناقابل فہم بات تھی اس لیے عجوبہ پرست لوگوں نے اس فعل مذموم کو بھی ایک قسم کا کراماتی فعل قرار دیدیا اور یہی باعث تھا کہ جو عورت یا مرد اس کا شوقین ہوتا تھا اس کو یہ لوگ بہت بڑا صاحب کرامات یا مافوق الفطرۃ طاقتوں کا مالک سمجھتے تھے اور اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے۔

ایک جرمن فاضل ایڈولف باسچین (Adolf Bastion) کا نظریہ یہ ہے کہ قدیم اقوام و ملل کے پجاری جو قدرت کے قوائے ذوجنسین کے نمائندے تھے اپنے مندروں اور عبادت گاہوں میں استلذاذ بالمثل کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مرد فطرت کی قوت فاعلہ کی پوجا کرتے تھے اور عورتیں تخلیہ یا علیحدگی میں فطرت کے قوائے نسائیہ کی تقدیس و تمجید کیا کرتی تھیں اور چونکہ پجاریوں کو مرد و زن دونوں کی تالیف قلوب کرنی پڑتی تھی اس لیے انھوں نے کمال وزوال ہر دو قسم کے تغیرات جنسی کا خیال حاصل کیا۔ چنانچہ جب وہ دیویوں کی خدمت کرتے تھے تو زنانہ لباس پہن لیتے تھے اور جب دیوتاؤں کی خدمت کا وقت آتا تھا تو مردانہ لباس میں کام کرتے تھے۔ ستم ظریفی یہ کہ انھوں نے زہرہ

کا بُت مع داڑھی کے بنالیا اور پھر قلبیس دیوتا کے ہاتھ میں چرخہ دیدیا۔ الغرض تقریباً تمام دیوتاؤں کو خصوصیات ذوجنسیت دیدی گئی تھیں۔ وینس اور آفرودیتہ کی پوجا بھی دونوں صورتوں میں کی جاتی تھی۔

فریزر نے اپنی کتاب "ایڈونیس" میں لکھا ہے کہ جزیرۂ قبرص میں وینس کا ایک بُت تھا جس کی وضع قطع تو ایک داڑھی مونچھ والے مرد کی تھی مگر اُسے لباس زنانہ پہنایا گیا تھا۔ مرد زنانہ لباس میں اور عورتیں مردانہ بھیس میں اُس بُت کی پوجا کرتی تھیں۔ اگرچہ بارلیش دیوتوں کی پوجا خاص طور پر ملک شام اور جزیرۂ قبرص میں ہوتی تھی لیکن قدیم مصریوں نے بھی آئسیز (مصری دیبی) کا ایک ایسا ہی بُت بنا رکھا تھا جس کی گود میں ایک بچہ ہورس بھی تھا۔

قدیم یونانیوں کا صنم اکبر زیوس تھا۔ اس کی شان میں جو بھجن گائے جاتے تھے ان میں بھی اس بُت کی زنانہ اور مردانہ خصوصیات کا اظہار کیا جاتا تھا: مثلاً "زیوس! ہو الاوّل! ہو الآخر! چمکتی ہوئی بجلیوں کا مالک۔ وہی سر ہے وہی کمر ہے اور اسی کے اندر سے تمام مخلوقات عالم وجود میں آئیں۔ زیوس ہی مرد ہے اور پھر زیوس ہی عورت ہے۔ یعنی دوشیزہ ازلی۔"

ایک دوسرے بھجن میں ایڈونیس کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے:۔

"او بہت سے ناموں والے دیوتا! جو سب معبودوں میں بہترین ہے میری سُن! اپنے پرستار کی سُن! اے خوبصورت بال والے ایڈونیس! تو ایک جوان رعنا اور دوشیزۂ طناز دونوں ہے۔"

علماء و فضلاء کا خیال یہ ہے کہ یونان میں امرد پرستی کا شوق دورِ قدیم

نے جاری کیا تھا کیونکہ زمانۂ قبل تاریخ (مثلاً ہومر کے زمانہ میں) اس کا ذوق وہاں نہ پایا جاتا تھا۔

یونان میں امرد پرستی کا شوق خاص خاص لوگوں تک محدود تھا یعنی صرف آزاد شہریوں اور بانکے شہسواروں کو اس کی اجازت تھی۔ غلام طبقہ اس کی جرأت نہ کر سکتا تھا! اور اگر کوئی فرد اس طبقہ کا ایسا کرتا تو اس کے لیے سزائے موت مقرر تھی۔ بڑھتے بڑھتے جب یہ شوق عام ہو گیا تو ایک معاشرتی ادارہ بن گیا اور حکومت نے بھی اس کی سرپرستی اختیار کر کے مختلف آئین و قوانین وضع کیے۔

اسپارٹا میں ایسے لڑکوں سے سخت بازپرس کی جاتی تھی اور اگر کسی لڑکے سے کوئی قابلِ شرم حرکت سرزد ہو جاتی تو اسے تو کچھ نہ کہا جاتا تھا لیکن اس کے اغوا کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

جزیرہ کریٹیا میں اس شوق نے اس قدر ترقی کی تھی کہ لڑکوں سے شادیاں کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی مرد کسی لڑکے پر مائل ہو جاتا تو اس کے والدین یا اعزہ کو آگاہ کر دیتا تھا۔ پھر اگر اس کے خاندان والے اس "رشتہ" یا تعلق کو پسند نہیں کرتے تھے تو وہ اس کی حفاظت کرتے تھے ورنہ پھر اس تعلق کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔ ایک عاشق جس قدر اعلیٰ مرتبہ کا ہوتا تھا اسی قدر لڑکے کے خاندان والے فخر و ناز کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ مع تحائف کے اپنے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔

قدیم یونان کے طرزِ معاشرت میں امرد پرستی کا رواج اس قدر عام ہو گیا

تھا کہ اگر کسی لڑکے کو کوئی چاہنے والا بانکا شہسوار نہیں ملتا تھا تو اُس کے لیے یہ بات باعثِ شرم و ذلت سمجھی جاتی تھی اور اگر کسی کے چاہنے والوں کی تعداد درجنوں تک پہنچ جاتی تھی تو باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ کریٹیا، تھیبیا اور تھیرہ میں تو لڑکوں کے ساتھ شادی کرنے کی رسم کو مذہباً منظور کرلیا گیا تھا، شہر تھیبا سے قریب اسمندر کے کنارے اپالو کے مندر سے تقریباً ۷۰۰ گز کے فاصلہ پر وہ مقام ہے جو خداوند زیوس کے نام سے منسوب ہے۔ یہاں حسب ذیل کتبہ پتھر پر منقوش ہے :۔

"اس مقدس و متبرک مقام پر زیر سایہ خداوند زیوس بادشاہ کریون نے باثقلیس کے بیٹے سے شادی کی اور اس نے اپنی حرکت کا دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ اعلان کرکے اس کی یادگار میں یہ کبھی نہ محو ہونے والا کتبہ قائم کیا اس کے ساتھ بہت سے اہل تھیرہ نے اور اس کے بعد بھی بہت سے لوگوں نے اسی مقدس مقام پر لڑکوں سے شادیاں کیں۔"

روم کے دورِ ملوکیت میں فحاشی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان کو دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ شاید لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ اسی زمانہ کا حال قلمبند کرتے ہوئے جبل (Bable) نے لکھا ہے کہ :۔

"مرد و زن فحاشی میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے، قحبہ خانوں کی تعداد بے حد بڑھ گئی تھی اور امرد پرستی کا ذوق اس درجہ عام ہو گیا تھا کہ شہر روما میں عصمت فروش لڑکوں کی تعداد کسبیوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا جب

امرد پرستی کے خلاف جہاد ہونے لگا اور شہنشاہ قسطنطین اور تھیوڈوسیس نے سخت سزائیں تجویز کیں یہاں تک کہ مرتکبین جرم کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔"

استلذاذ بالمثل اقوام و ملل قدیمہ میں

ڈاکٹر ڈبلیو۔ اے۔ ہیمنڈ (Hammond) نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:-

"امریکی ریاست "نیو میکسکو" میں علاقہ "پیوبلو" (Pueblo) کے قدیم امریکن قبائل میں یہ رواج ہے کہ ان کا ہر قبیلہ اپنے ہاں ایک آدمی تیار کرتا ہے جسے ان کی اصطلاح میں مجیرادو (Majirado) کہتے ہیں۔ یہ شخص فصل بہار کے مذہبی رسوم اور تہواروں میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے۔ ان تہواروں میں خوب رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں اور امرد پرستی کا بازار گرم ہوتا ہے۔"

یہ شخص یعنی "مجیرادو" اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ قبیلہ میں سے کوئی تندرست مرد چن لیا جاتا ہے۔ اس شخص کو گھوڑے کی سواری خوب کرائی جاتی ہے اور کثرت کے ساتھ استمنا بالید کی ترغیب دی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ بالکل بے کار ہو جاتا ہے اس کی ڈاڑھی مونچھ کے بال گرنے لگتے ہیں آواز کا مردانہ پن زائل ہو جاتا ہے اور مزاج میں نسائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد "مجیرادو" کی جگہ مردوں میں نہیں رہتی۔ وہ عورتوں کے سے اوضاع و اطوار اختیار کر لیتا ہے لیکن بایں ہمہ تہواروں میں اس کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہیمنڈ کی چونکہ یہ قبائل بے حد عزت و توقیر کرتے تھے اس لیے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو دو "مجیرادو" دیکھنے کا موقع دیا۔ ان میں ایک کی

عمر ۴۵ سال کی تھی اور سات سال قبل اس کی قلب ماہیت ہو چکی تھی پہلے وہ بڑا اچھا تنومند مرد تھا جس وقت ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کو دیکھا تھا تو وہ عورتوں میں شامل ہو چکا تھا اور اس میں اور عورتوں کے اطوار میں مطلق فرق نہ تھا۔ قدرت کا قاعدہ ہے کہ جب انسان کی کسی خاص قوت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے تو وہ دوسری طرف ظاہر ہونے لگتی ہے۔ مثلاً اندھوں کا حافظہ قوی ہو جاتا ہے، ان کی قوت لامسہ اور خوش گلوئی میں ترقی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب اس شخص کی قوت مردمی زائل ہوئی تو سینہ پر چھاتیاں بھی ابھر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کئی بچوں کی "ماں" ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ کئی بچوں کو جن کی مائیں فوت ہو گئی تھیں اس نے اپنا دودھ پلا کر پالا۔

دوسرے "مخیر زادہ" کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ اس پر جب بارہ برس ہو گئے، نسائیت طاری ہوئی تھی لیکن اس کی چھاتیاں زیادہ نہ ابھری تھیں آواز میں نسائیت اور جسم میں نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔

کثرت کے ساتھ گھوڑے کی سواری کرنا مردمی کے لیے سخت مضر ہے، اور اس امر کی تائید بڑے بڑے ماہرین فن نے کی ہے۔ آپاچے اور نواجو قومیں اپنی عمر کا زیادہ حصہ گھوڑے کی پشت پر گزارتی ہیں۔ یہی باعث ہے کہ لوگ عموماً ضعیف الباہ ہوتے ہیں۔ کراپروتھر (Kmaprothr) اور چوونسکی (C. Kotomski) نے لکھا ہے کہ:-

"فی زمانہ ستانادیوں میں نامردی کی علت بہت زیادہ پائی جاتی ہے جس کا باعث یہی ہے کہ وہ لوگ کثرت کے ساتھ گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں۔"

ویسٹر مارک (۱) نے اپنی مشہور یادگار کتاب "ابتداء و ارتقاء تخیلات اخلاقیہ" میں قوم کوریاس کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"کراشے نینی کاف (Krashineni Koff) نے (Kiveew) لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو مردوں کے پاس بطور حرم کے رہتے ہیں۔ موسیو موصوف بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ علاقہ بحرین (Behring Strait) کی قوم کمچاڈل (Kamchidal) کے ان لوگوں کے مانند ہیں جنھیں ان کی اصطلاح میں کوئی توق (Koi Kaue) کہتے ہیں یعنی وہ مرد جنھیں عورت بنا لیا گیا۔ کوئی توق کو فن سحر و ساحری اور تعبیر خواب کا بھی ماہر سمجھا جاتا ہے، یہ لوگ زنانہ لباس پہنتے ہیں، عورتوں کے کام کرتے ہیں اور مردوں کے ساتھ عورت کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ شمالی امریکہ کے باشندوں کے متعلق ویسٹر مارک تحریر کرتے ہیں۔

"شمالی امریکہ کے اصلی باشندے ان لوگوں سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرتے جو استلذاذ بالمثل کے عادی ہیں یا جنھوں نے زنانہ لباس اور زنانہ اوضاع و اطوار اختیار کر لیے ہیں۔ بلکہ کاڈیاک والے ایسے افراد پر فخر و ناز کرتے ہیں اور ان کو محبت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

کپتان جیمس ولسن نے ۱۷۹۶ء سے ۱۷۹۸ء تک جزائر بحر جنوبی کی سیر و سیاحت کی تھی اور وہاں انھوں نے ایسے مرد دیکھے جو زنانہ لباس پہنتے تھے اور

(۱) Wester Marcks Origin and development of the Moralideas.

لوگ ان کی عزّت بھی کرتے تھے۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"مجھے یہ بات دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں کی عورتیں بھی ان لوگوں سے نفرت و حقارت نہیں کرتیں بلکہ دوستانہ تعلقات رکھتی ہیں"

ایک دوسرے سیّاح اور مسیحی مبلّغ جنھوں نے جزائر بحر جنوبی کی سیر کی تھی ولیم ایلس (Williams Ellis) ہیں۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان جزائر کے باشندوں کو استلذاذ بالمثل کی اجازت پوجاریوں کی طرف سے ہے اور بعض اوقات وہ اپنے دیوتاؤں کا سچا نمونہ بن جاتے ہیں۔

چین و جاپان نیز ملایا میں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ مقتدایان مذہب کے پاس جنھیں بونزہ یا بونجہ (Bonzes) کہتے ہیں لڑکے ہوتے ہیں جن کا تعلّق مندر کی خدمت سے ہوتا ہے۔ ہر پروہت یا پجاری کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ایک چیلا رکھے ، اسے تعلیم دے اور مذہبی رسوم ادا کرنا سکھائے اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ گرو اور چیلے دونوں میں بہت گہری محبت ہوتی ہے۔ فرانسیس زیویز جنھوں نے ۱۵۴۹ء میں جاپان کی سیاحت کی تھی انھوں نے بھی یہی حال بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

"بونجہ لوگ خود اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ چیلوں سے ان کے تعلقات شہوانی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ فعل کوئی گناہ نہیں ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ لڑکوں سے تعلق تو ان کے نزدیک کوئی گناہ نہیں اگر عورت سے تعلق رکھنا گناہ کبیرہ ہے جس کی سزا قتل ہے"

ایک روسی سیّاح موسیو داویداؤ (Dawydow) نے

سنہ ۱۸۰۵ء کے قریب اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ شمالی امریکہ کے جزیرہ نمائے الاسکا (Alaska) کے متعلق کادیاک (Kadiak) نامی ایک جزیرہ ہے جس میں کونیاگا قوم رہتی ہے۔ اس قوم میں بعض مرد پائے جاتے ہیں جن کی ٹھوڑیاں گودی ہوئی ہیں اور جو زنانہ لباس پہنتے ہیں۔ عورتوں کی طرح اُن کے شوہر بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض تو بجائے ایک کے دو خاوند رکھتے ہیں ان کو وہاں کی زبان میں اخنوتشیق (Achnutschisk) کہتے ہیں۔ قوم میں ان لوگوں کی سب سے زیادہ عزت و توقیر کی جاتی ہے اور لوگ عام طور پر انھیں بادِ دگر سمجھتے ہیں۔ جو مرد بجائے عورت کے کسی "اخنوتشیق" کو رکھتا ہے وہ قابلِ رشک خیال کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں جب کوئی بچہ صورت شکل میں زنانہ پیدا ہوتا ہے یا اس کے اوضاع و اطوار زنانہ ہوتے ہیں تو اس لڑکے کو اخنوتشیق بنا دیا جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر والدین کو لڑکی کی خواہش ہے اور بجائے لڑکی کے پیدا ہو گیا لڑکا تو اس لڑکے کو "اخنوتشیق" بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فریزر (Frazer) نے اپنی کتاب "اڈونیس ایڈ نیس آتیس و ادسی ریز" (Adonis Attis Asemes) میں جزیرہ پیلو (Pelews) کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ پجاری لوگ جو زنانہ لباس پہنتے تھے اس کا باعث یہ بتایا جاتا تھا کہ دیوی اپنے پجاری اور بھگت کو عورت بنانا پسند کرتی ہیں۔ جب ایسا ہوتا تھا تو منظورِ نظر پجاری زنانہ لباس پہن لیتا تھا اور اُسی روز سے اُسے عورت سمجھا جاتا اور اس کے ساتھ عورتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اکثر وحشی قبائل میں جو زنانے

پائے جاتے ہیں اس کا باعث، غالباً یہی عقیدہ ہے۔ ایسے لوگ عام طور پر بہت بڑے جادوگر اور طبیب خیال کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے زنانے پجاری اور جادوگر بورنیو کی قوم ڈیاک (Dyaks) جنوبی سیلی بیز کی قوم بوجی (Bugis) جنوبی امریکہ کے پاٹاگونیوں (Patagonions) اور جزیرہ مڈگاسکر میں پائے جاتے ہیں، یہ لوگ زنانہ لباس پہنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دیوتاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ افریقہ کی سلطنت کانگو (Cango) میں ایک بڑا پجاری تھا جو ہمیشہ زنانہ لباس پہنتا تھا اور جب لوگ اسے "نانی اماں" کہتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

ممالک مشرق کی قدیم ترین کتابوں میں استلذاذ بالمثل کا ذکر بائبل میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو توریت صحیفہ پیدائش باب ۱۹۔ آیت ۴ لغایت ۸:۔

"اور اس سے پہلے کہ وہ لیٹنے شہر کے مردوں یعنی سدوم کے مردوں نے جوان سے لے کے بوڑھے تک سب لوگوں نے ہر طرف سے اُس کے گھر کو گھیر لیا اور انھوں نے لوط کو پکار کے کہا کہ وہ مرد جو آج کی رات تیرے یہاں آئے کہاں ہیں؟ انھیں ہمارے پاس باہر لا تاکہ ہم اُن سے صحبت کریں۔ تب لوط اُن کے پاس باہر گیا اور کواڑ اپنے پیچھے بند کر لیا اور کہا کہ اے بھائیو ایسا برا کام نہ کیجیو۔ اب دیکھو میری دو بیٹیاں ہیں جو مرد سے واقف نہیں مرضی ہو تو ان کو تمہارے پاس نکال لاؤں، مگر ان مردوں سے کچھ کام نہ رکھو........"

اقتباس مندرجہ بالا سے دو باتیں معلوم ہوئیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس زمانہ میں شہر سڈوم (Sodom) استلذاذ کا زبردست مرکز تھا
اسی لفظ سڈوم سے انگریزی لفظ سوڈومی (Sodomy) نکلا
ہے جس کے معنی استلذاذ بالمثل کے ہیں۔

(۲) لوطؑ کے زمانہ میں امرد پرستی کا بے حد چرچا تھا۔ اسی سے الفاظ لوطی
اور لواطت نکلے ہیں جو آج تک رائج ہیں۔

ابتدائے تاریخ سے اس وقت تک یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں اس کا شوق موجود رہا ہے اور اب بھی ہے اگرچہ وقتاً فوقتاً بانیانِ مذہب و مصلحین ملت اس فعل مذموم کو جرم قرار دیتے رہے۔ وادی فرات و دجلہ میں خط میخی (Cuneiform) کے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں شہنشاہ اشوریہ حمورابی کے آئین و قوانین بھی درج ہیں۔ ان کے مطالعہ سے کہ کسی وقت ملک اشوریہ میں بھی یہ شوق موجود تھا۔

ملک مصر کے علاقہ فیوم سے فلنڈرس پیٹری (Flinders Petrie) کو ایک قدیم مخطوطہ دستیاب ہوا تھا جس کا ترجمہ گریفتھ نے کیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ہزار برس سے زیادہ گزرے کہ اس وقت بھی یہ فعل بکثرت رائج تھا اور لوگ اسے اس قدر اچھا سمجھتے تھے کہ انہوں نے اس کو اپنے دو مشہور و معروف دیوتاؤں ہورس (Horus) اور سیت (Seth) کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ قدیم مصریوں کے نزدیک یہ فعل کوئی جرم یا گناہ نہ تھا بلکہ وہ لوگ حسن مرداں کو معیار حسن و جمال سمجھتے تھے اور ہرشفیلڈ ([illegible]) کا قول ہے کہ قدیم مصری عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل

کا شوق موجود تھا۔ (۱)

حکیم ارسطو نے بیان کیا ہے کہ جزیرہ کریٹا میں کثرت آبادی کم کرنے کی غرض سے یہ مشغلہ قانوناً جائز قرار دیا تھا اور پروفیسر ہیڈن کا قول ہے کہ شمالی آسٹریلیا اور نیوگنی کے جنوبی سواحل پر جو قومیں بستی ہیں ان میں کبھی آبادی کی روک تھام کے لیے اس کی تائید و حمایت کی جاتی ہے۔ لیکن اس بات کی شہادتیں بہت کم ہیں۔

یہ مشغلہ زیادہ تر سپاہیوں اور جنگجو اقوام میں پایا جاتا ہے کیونکہ جنگ کے زمانہ میں فطری ذرائع حاصل نہ ہونے کی وجہ سے سپاہی استلذاذ بالمثل کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اہل قرطاجنہ، نارمنوں، ڈوریوں (Dorians) سیتھوں (Scythians) تاتاریوں اور کلٹیوں (Celts) میں اسکا بکثرت رواج تھا اور نیو کالیڈونیا کے قدیموں میں تو اس کی ضرورت سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی تھی اور اس کے متعلق قواعد و ضوابط بھی وضع کئے گئے تھے۔

ڈاکٹر ہان (Hahn) لکھتے ہیں کہ اہل البانیہ میں اس کا شوق بکثرت پایا جاتا ہے۔ (۲) اس ملک میں یہ شوق اگرچہ مسلمانوں میں زیادہ پایا جاتا تھا لیکن البانوی عیسائی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے بلکہ عیسائیوں میں تو یہ حالت تھی کہ پادری صاحب گرجا کے اندر اس رابطۂ غیر فطری کو

(۱) ملاحظہ ہو ہرشفیلڈ کی کتاب (Die Homosexualität) صفحہ ۳۹۰
(2) Albanesische Studien, 1854 P. 166.

برکت دیتے تھے۔ (۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل البانیہ اور قوم ڈورین دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ یونان میں اگرچہ اس کا شوق پہلے سے موجود تھا لیکن جب ڈورین قوم نے یونان فتح کیا تو انھوں نے اس فعل بد کو اپنی معاشرت میں باقاعدہ طور پر داخل کر لیا۔ یہ قوم یونان کی شمالی مغربی سمت یعنی البانیہ سے آئی تھی اور یونان فتح کرتے ہی تمام گرد و نواح کے جزائر اور سواحل ایشیائے کوچک پر پھیل گئی۔ ڈاکٹر بیتھے (Bethe) نے ڈورین قوم پر ایک گراں قدر کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"یہ قوم غیر فطری شادی کرنا جائز سمجھتی تھی اور اس قسم کی "شادیوں" کے سلسلہ میں "مذہبی رسوم" بھی باقاعدہ ادا کی جاتی تھیں اور "مقتدایان دین" "میاں بیوی" کی طرح ان کو برکت دیتے تھے۔"

جزیرۂ کریٹ میں تو یہ حالت تھی کہ اگر کسی امرد کی طرف اس طرح کا میلان کرنے والا نہ ہوتا تھا تو اُس کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ایشیا کے انتہائے شرق میں اقوام (Kamschatdals) اور (Tchuktsches) وغیرہ میں مردوں کے درمیان باقاعدہ شادیاں ہوتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اس قسم کا "ازدواج" باہم عورتوں میں بھی ہوتا تھا۔ یہ "شادیاں" پورے تزک و احتشام اور مذہبی رسوم کے ساتھ ہوتی تھیں اور قوم کا ہر شخص ان کی باقاعدگی کو تسلیم کرتا تھا۔

---

(1) Nachs Jahrbuch for Sexuelle Z.ewis Chenstufen Vol. IX 1908 P. 327.

ڈاکٹر نیک (Nacke) کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے اس طرح کے لڑکے وہاں کے حماموں میں اکثر پائے جاتے ہیں جو رات بھر کھلے رہتے ہیں لیکن اب جدید ترکیہ میں یہ رواج تقریباً مفقود ہو گیا ہے (۱)

چین میں ایسے لوگوں کے خاص مکانات ہوتے ہیں اور جب کوئی دولتمند اپنے احباب کو مدعو کرتا ہے تو وہ عورتوں اور لڑکوں دونوں کے طائفے طلب کرتا ہے۔ لڑکے خوب ناچتے ہیں اور اپنی بذلہ سنجیوں اور حاضر جوابیوں سے مہمانوں کا دل خوش کرتے ہیں اور عورتیں کھانے کے وقت فن موسیقی کے کمالات دکھا کر غذائے روحانی بہم پہنچاتی ہیں۔ ان لڑکیوں کو اس فن میں خاص طور پر تربیت دی جاتی ہے۔ جلسہ کے بعد یہ لڑکے معقول رقم لے کر چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر موراشے (Morache) ان عصمت فروش چینی لڑکیوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ :-

"ان لڑکیوں کے والدین ان کو چار یا پانچ برس کی عمر میں فروخت کر دیتے ہیں اور پھر ان کو خوب تعلیم و تربیت دی جاتی ہے اور گانا بجانا، نقاشی، بذلہ سنجی، شعر گوئی، شعر خوانی سکھائی جاتی ہے چینی تو وہ خانوں کے قدر شناس لڑکیوں کے اوصاف سے خوب واقف ہیں اور جو شخص انہیں طلب کرتا ہے تو یہ قدر شناس لڑکے ہیں جس طرح جیبیوں کے ساتھ عموماً ایک سازندہ ہوتی ہے اسی طرح

(1) Russian Anthropological Journal (Quoted in Sexual Problem) for January 1913. 2. 44.

ان کے ساتھ بھی ان کا "سرپرست" آتا ہے۔ ان کے اوضاع و اطوار سب زنانے
ہوتے ہیں۔ شوخ رنگ اور مکلف لباس پہنتے ہیں اور عطریات میں بسے رہتے ہیں
جب کسی جلسہ میں جاتے ہیں تو پیدل کبھی نہیں جاتے۔ (۱)

شمالی چین، اور خصوصاً ترکستان میں ایک جماعت عصمت فروش لڑکوں کی ہوتی ہے جو تعلیم یافتہ اور ماہر موسیقی ہوتے ہیں۔ اس ملعون ادارے کے قیام کا باعث یہ بتایا جاتا ہے کہ ان ممالک میں صنف نازک کی قلت ہے۔ علاوہ ازیں کثرت الازدواج کے باعث عام مردوں کو عورتیں نہیں ملتیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں عموماً جاہل، بدسلیقہ اور بدمزاج ہوتی ہیں۔ مگر یہ لڑکے نہایت شائستہ اور نستعلیق ہوتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان ممالک میں یہ ادارہ مکروہ ایران سے آیا تھا۔ (۲)

افغانستان، بلوچستان، سندھ اور دیگر ہمسایہ ممالک میں یہ بلا ضرور ایران سے پہنچی تھی۔ کیونکہ ہندوؤں میں تو اس شوق کا مطلق پتہ نہ تھا۔ لیکن برٹن (Burton) نے اپنے ترجمہ "الف لیلہ" کے اختتامی مضمون میں لکھا ہے کہ:-

(1) Moruche Article "Chine" Dictionnaire Encyclopedique Des Science Medicale.

(2) Hermans, "Die Padrastie Bie Den Sarten Sexual Problem June 19.H.

"جب ۱۸۴۵ء میں سر چارلس نیپر (Napier) نے ملک سندھ فتح کیا تو معلوم ہوا کہ چھوٹے سے شہر کراچی میں زنانہ قحبہ خانوں کے علاوہ تین اڈے ایسے تھے جن میں ہیجڑے لڑکے عصمت فروشی کیا کرتے تھے"
افغانستان میں بھی اس کا شوق عام ہے۔ چنانچہ برٹن صاحب نے لکھا ہے کہ:-

"ہر قافلہ جو افغانستان سے آتا ہے اس میں چند لڑکے ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی آنکھوں میں سرمہ، رخساروں پر غازہ، ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی اور سر میں خوشبودار تیل اور زلفیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کا لباس زنانہ ہوتا ہے اور وہ آرام سے ساتھ اونٹوں کے شغدفوں میں بیٹھ کر آتے ہیں"
لینگسڈارف (Langsdurff) نے شمالی امریکہ کے ملک الاسکا (Alaska) کا حال لکھا ہے اور اپنے سفرنامہ[۱] میں تحریر کیا ہے کہ:-

"علاقہ اونالشکا کی ایک قوم الیوٹ (Aleut) میں عجیب دستور ہے یعنی اگر ان میں کوئی خوبصورت لڑکا ہوتا ہے تو اکثر اس کی تربیت لڑکیوں کی طرح کرتے ہیں اور یہ اپنے ہاتھ اور پاؤں میں زیور پہنتے ہیں، بستر آغاز ہوتے ہی تمام بال ہونٹھ سے نوچ کر صاف کر دیتے ہیں اور ان کی ٹھوڑی پر گودنا گودا جاتا ہے۔ ان کے بال عورتوں کی طرح سنوار کر جوڑے اور

۱؎ Langdwarffs Vayages and Travels 1814, Part II, P. 47.

چوڑیاں باندھی جاتی ہیں۔ یہاں کی اصطلاح میں ان کا نام سیخو پان (Schoopans) ہے اور ان کی وضع قطع دیکھ کر کوئی اجنبی شخص یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ یہ عورتیں ہیں یا لڑکے؟"

ڈاکٹر لیسیانسکی[1] (Lisiansky) تحریر کرتے ہیں کہ "جن مکانوں میں کوئی سیخو پان رہتا ہے اس کو بہت مبارک خیال کیا جاتا ہے۔" سیاح موصوف نے اس ملک میں ایک سیخو پان کے دو خاوند دیکھے تھے، اسی طرح ڈاکٹر ہو مبرگ[2] (Holmberg) نے لکھا ہے کہ ان سے ڈیوڈاف (Davydoff) سیاح نے بیان کیا کہ "سیخو پان" بنائے نہیں جاتے بلکہ ہمیشہ ایسے لڑکوں کو اس کام کے لیے چنا جاتا ہے جو ماں کے پیٹ سے نسائیت لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انگلمان کا بیان ہے کہ انھوں نے ملک الاسکا کی اس اسکیمو (Eskimo) قوم میں جو راس بیرو (Point Barrow) کے آس پاس آباد ہے، چھوٹی چھوٹی بستیوں کے اندر بھی پانچ پانچ چھ چھ سیخو پان دیکھے ہیں۔

ممالک لوئسیا، فلوریڈا، یوقاتان (Yocatan) وغیرہ میں بھی اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ برازیل میں جن لڑکوں کو اس کے لیے تیار کیا جاتا انھیں قووینا (Cudinas) یعنی "خصی" کہتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تمام شمالی مغربی علاقوں میں اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مونتانا

---

[1] Lisiansky, Voyage, Eles London 1814, P.1399.

[2] Ethnografiheschne Kizzen, 1855, P.121.

(Montana) قوم میں انھیں بوٹے (Boti) کہتے ہیں یعنی "مرد نہ عورت"
علاقہ واشنگٹن کی امریکی اقوام میں ان کا نام بَرداش (Burdash)
ہے یعنی "نیم مرد نیم عورت" [۵۱]

جزیرہ تاہیتی (Taheti) کے دیسی باشندوں میں بھی ایسا ہی ایک طبقہ پایا جاتا ہے جو کھلم کھلا یہ مکروہ پیشہ کرتا ہے۔ یہاں کی اصطلاح میں ان لوگوں کو ماہو (Mahoo) کہتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً عورتوں ہی کے ساتھ رہتے اور سینے پرونے، کپڑا اور چٹائیاں بُننے کا کام کرتے ہیں مگر اس ملک میں یہ مکروہ فعل صرف قبائلی سرداروں تک محدود ہے۔ [۵۲]

جزیرہ مڈگاسکر کی سکلاوی قوم (Sakalaves) میں بھی ایک خاص طبقہ پایا جاتا ہے جنھیں سکاترہ (Sakatra) کہتے ہیں۔ ان کے اطوار عورتوں جیسے ہوتے ہیں اور بلحاظ صورت و شکل زنجباری "زنانوں" سے ملتے جلتے ہیں یہ لوگ پیدائشی مخنث ہوتے ہیں اس لیے زیادہ ذلیل نہیں سمجھے جاتے لیکن جو لوگ طبعی حالت میں پیدا ہو کر یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں ان کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ [۵۳]

افریقہ کے ممالک یوگنڈا اور انا موزی میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں اور

---

۵۱ New Yark Medical Journal Dicr, 7, 1871.

۵۲ J. Turn Bill, Avoyage Round The Word in the Year, 1800 Etc.

۵۳ Annales D. Hygiene d. De medicine Coloneal, 1899, P. 494.

بالائی کانگو میں بھی یہ فعل عام ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ لوگ اپنے گھروں سے دور رہوں[۵]
جزیرہ نیوگنی کی پاپوا اقوام میں بھی یہ شوق عام طور پر پایا جاتا ہے اور خلاف
قانون نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ان لوگوں میں نکاح دیر سے ہوتا
ہے اور تمام لڑکے اور نا کتخدا مرد ایک ساتھ پنچایت خانوں میں رہتے ہیں[۶]۔ اسی
طرح مغربی آسٹریلیا کے علاقہ کمبرلے میں جو قدیم اقوام بستی ہیں ان میں یہ دستور ہے کہ
اگر کسی شخص کو بیوی میسر نہیں آتی تو وہ استلذاذ بالمثل کے لیے آزاد ہوتا ہے

اسپنسر اور گلن کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے شمال مغربی سواحل پر جو قومیں
آباد ہیں ان میں بھی اس کا رواج ہے، یہ لوگ تو اس قدر وحشی ہیں کہ مبرز و انثیین
کے درمیانی حصہ میں شگاف دیدیتے ہیں۔ ڈاکٹر کلاش (*Klaatsch*) کا بمقام
نیول نیول (*Nial Niol*) وہاں کے پادریوں نے یہ حال بتایا تھا
علاوہ ازیں سنہ ۱۹۰۹ء میں روتھ (*Roth*) نے بھی بمقام بولیا (*Boulia*)
بتایا تھا کہ یہاں لڑکوں پر اسی قسم کا عمل جراحی کیا جاتا ہے۔

انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے مزدوری پیشہ اور کاریگر طبقوں میں اس کا
رواج بہت پایا جاتا ہے۔ بہت سے لڑکے دن کو محنت مزدوری سے اور رات کو

---

۵ Oskar Baumann, Ucentrere Sexual Erscheinungen Nie Die Neger Beud-keaung Zanzibars.

۶ Maskowski Zeitschrift for Ethnologie, 1911 (2) Heft 2 - P. 339.

اس مشغلہ سے روپیہ کماتے ہیں۔ انگلستان کی طرح فرانس اور جرمنی کی فوجوں
میں بھی اس کا رواج عام ہے۔ فرانسیسی سپاہیوں میں یہ علت الجزائر
(Algeria) جا کر پیدا ہوئی اور اب کوئی رجمنٹ فرانسیسی فوج کی ایسی باقی
نہیں رہی جس میں یہ علت کم و بیش پھیل گئی ہو۔ فرانسیسی لجنۃ الاجنبیہ (Foreign
Legion) کی نسبت جب تحقیقات کی گئی تو ایک سپاہی نے جو جرمن
تھا بیان کیا کہ فوج میں فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی نسلوں کے سپاہی تو عموماً
"عاشق" ہوتے ہیں اور سوئس و جرمن سپاہی عموماً "معشوق" کا کام دیتے ہیں۔[1]

روس کا طبقہ عوام اس حرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بقول تارنوسکی
(Tarnowsky) عوام کا قول یہ ہے کہ یہ شوق امیروں کا ہے۔ سوئزرلینڈ[2] کے
کسانوں میں بھی شادی سے قبل جوانوں میں یہ شوق دیکھا گیا ہے۔

روما الکبریٰ کے عہد ملوکیت میں بھی اس کا ذوق عام تھا اور روم کے اکثر
شہنشاہ اس مرض میں مبتلا تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جولیس قیصر۔ آغسطس۔ تائبیریس
کالیگولا۔ کلاڈیوس۔ نیرو۔ گالبا۔ ٹیٹس۔ ڈومیشین۔ نروا۔ ترایجن۔ ہیڈرین۔
ڈومیڈوس اور ہیلوگابالس۔ شہنشاہان روما اور بہت سے دیگر امراء کا نام
لیا جاتا ہے۔[3] جولیس کو تو لوگ طنزاً یہ کہا کرتے تھے کہ "یہ سب عورتوں کا

---

۱ Memnon; P. 27 See Also General Brossiers Report Quoted By Burton in his Aracian Nighs Vol X P. 251.

۲ Shoalarl, Inversion Sexualle, P. D., 85-106.

شوہر اور سب مردوں کی جورو ہے"۔ اس شہنشاہ کو اپنے حسن و جمال پر بڑا ناز تھا۔ ہیڈرین کو اپنے غلام انٹینوس (Antinous) سے اس قدر عشق تھا کہ یہ دونوں یورپ میں محمود و ایاز کی طرح مشہور ہیں [۱] اور ہیلو گابالوس تو عورتوں کا سا لباس پہنتا تھا اور جن مردوں سے اُسے محبت ہوتی تھی ان کی خدمت بیویوں کی طرح کیا کرتا تھا۔[۲]

قید خانوں اور جیلوں میں بھی عام طور پر یہ مرض پایا جاتا ہے۔ تادیب خانہ المیرا (Elmira Reformatory) واقع نیویارک میں ڈاکٹر وے (Way) عرصہ دراز تک نگراں رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"قید خانوں میں سب سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ اس شوق کے انسداد کا ہے جہاں تک میں خیال کر سکتا ہوں اسی فیصدی آدمی اس علت مکروہ میں مبتلا ہیں۔ بہت سے قیدی ایسے ہیں جو خوبصورت اور نازک بدن ہوتے ہیں اگر کوئی شخص اس وضع کا قید خانہ میں آجاتا ہے تو گویا قیامت آجاتی ہے۔

---

[۱] J. A. Semonds Wrote and Interesting Essay on this Subject, See Also Kiefer, Jahrbuch, F. Sex-Zwischeufen Vol. VIII, 1906

[۲] L. Vou Sheffler "Elaga Bad" Jahr Buch, A. Sex Sarscheustufufen Vol, iii (1901).

نیویارک کے قید خانہ سنگ سنگ میں بیس فی صدی قیدی "عامل" اور
اسّی فی صدی "معمول" ہیں۔"

قید خانوں کے علاوہ امریکہ اور یورپ کے آوارہ گرد فقیروں میں بھی یہ علت مکروہ بدرجۂ غایت رائج ہے۔ ایک شخص مسمّی جوشیا فلنٹ (Josiah Flynt) آوارہ گرد فقیروں کے طبقہ میں پچیس برس تک شامل رہا تھا۔ اس نے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر ان لوگوں کے حالات میں لکھا ہے:۔

"امریکہ میں دو قسم کے آوارہ گرد ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بوجہ بے کاری دریوزہ گری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو پیشہ ور فقیر ہیں۔ موخر الذکر لوگوں کو وہاں کی اصطلاح میں "ہوبو" (Hoboes) کہتے ہیں اور ان میں ہر طبقہ کے تبذل آدمی شریک ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس مکروہ حرکت سے واقف نہ ہو۔ یہ لوگ اپنے شوق کے لیے لڑکوں کو مختلف طریقوں سے قبضہ میں لاتے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ وہ اثنا سفر میں جب کسی شہر یا قصبہ میں پہنچتے ہیں تو وہاں غریب طبقہ کے لڑکوں سے میل جول پیدا کر لیتے ہیں اور بالآخر جب کوئی لڑکا خوبصورت مل جاتا ہے تو اسے ساتھ لے کر غائب ہو جاتے ہیں۔ چند روز بعد اس غریب لڑکے کو اپنے معرف کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ان آوارہ گردوں کی اصطلاح میں لڑکے کو "پرُوشن" (Prushun) اور اس کے محافظ کو "جاکر" (Jocker یا بگ سوار) کہتے ہیں۔ لڑکے کی عمر عموماً دس اور پندرہ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کو ہر بستی میں بھیک مانگنا پڑتی ہے اور اگر وہ کسی قسم کی

شستی دکھاتا ہے تو سخت سزا دی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں آٹھ دس آوارہ گردوں کی جماعت میں ریل کا سفر کر رہا تھا کہ گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھہری وہاں ایک حبشی لڑکا ٹرین کے اسی ڈبہ میں داخل ہوا جس میں ہماری جماعت تھی، جب اسٹیشن سے گاڑی چھوٹ گئی تو فوراً ان لوگوں نے اس حبشی بچہ کو دبوچ لیا۔ امریکہ میں اس قسم کے آوارہ گرد ساٹھ ہزار کے قریب ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ساحل اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے بندر میں ایک میلہ کے موقع پر ہم دس بارہ آدمی معروف جرعہ کشی تھے، رات کا وقت تھا، اسی اثناء میں ایک بوڑھا اندھا سارنگی نواز بوزہ خانہ میں پہنچا اس کے ساتھ سولہ سترہ برس کا ایک نہایت خوبصورت لڑکا تھا، جو اسکاٹ لینڈ کی وضع کا تہمد باندھے ہوئے تھا، اس کے سنہرے لمبے بال شانوں پر پڑے ہوئے نہایت خوبصورت معلوم ہوتے تھے، سر پر عورتوں کی وضع کی پرانی ٹوپی تھی۔ اور جسم پر سیاہ مخمل کا زنانہ کوٹ تھا، یہ لڑکا صورت شکل میں اس قدر جاذب نظر تھا کہ ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو گیا، اسی اثناء میں ایک شرابی نے فقرہ کسا کہ یہ لڑکی معلوم ہوتا ہے۔ لڑکے نے یہ سنتے ہی کہا کہ میں لڑکی نہیں لڑکا ہوں یہ کہتے ہی وہ بالکل عریاں ہو گیا۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ لوگوں نے اسے خوب شراب پلائی۔ اس کے بعد وہ اندھا اپنا بیلا بجانے لگا اور لڑکے نے زنانہ اوہ کے ساتھ ناچنا شروع کیا۔ اُس وقت مجمع کے ہیجان کی حد نہ رہی اور آخر کار بے غیرتی اور بے حیائی کا یہ منظر ختم نہ ہوا تھا کہ

مالک دوکان اُٹھ کر آیا اور اُس نے لیمپ گُل کر دیا"

استلذاذ بالمثل کے مختلف نظریے

کیمپف (Kempf) کا خیال ہے کہ بعض مردوں میں عورت کی طرف سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور اس نفرت کا سبب درحقیقت عورت کا رعب یا خوف ہوتا ہے اور مرد باور کر لیتا ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ استلذاذ بالمثل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ مردوں یا عورتوں کی کوئی جماعت عرصۂ دراز تک اس طرح رہنے پر مجبور ہوتی ہے کہ جنس مخالف سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تو ان میں یہ مذموم عادت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ فوجوں کے سپاہی اور جہازوں کے ملاح جنہیں عرصۂ دراز تک عورتوں سے جُدا رہنا پڑتا ہے وہ استلذاذ بالمثل کے عادی ہو جاتے ہیں۔

زمانۂ حال کے بہت سے ماہرین جنسیات اس امر پر غور کرتے ہیں کہ اس عادت کے اسباب کیا ہیں۔ چنانچہ چند سال کے اندر اس کے متعلق کثیر مواد جمع ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ (Krafft Ebbing) ایسا شخص ہے جس کے اقوال کی بکثرت سند دی جاتی تھی اور اس کی تصنیفات کا اب بھی عوام پر بہت اثر ہے اس شخص کا قول یہ ہے کہ اس فعل کی عادت آبائی ہے۔ یعنی بچہ کو والدین سے وراثتاً ملتی ہے۔ لیکن مابعد کے محققین جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس سے ڈاکٹر صاحب کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔

کرافٹ ایبنگ کا قول یہ بھی ہے کہ بچپن میں جن بچوں کو استلذاذ بالنفس یعنی استمناء وغیرہ کی عادت ہو جاتی ہے وہی بڑے ہو کر استلذاذ بالمثل میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ بہت سے لوگ ایسے مل جائیں گے جنھوں نے طفولیت کی غلط کاری کو جوان ہو کر بالکل چھوڑ دیا، اور پھر کوئی غیر فطری طریقہ حظِ نفس کا اختیار نہیں کیا۔

کرافٹ ایبنگ کا بیان ہے کہ :-

"استلذاذ بالنفس سے زیادہ مذموم کوئی عادت نہیں جو حسن و جمال کی تمام دلکشی و دل فریبی کو زائل کر کے انسان کے اخلاق و مزاج پر بھی اثرانداز ہوتی ہے"

لیکن ڈاکٹر اسٹیکل (Stackle) نے اس خیال کی تردید کی ہے وہ اپنی کتاب "اختلاط ذو الجنسین" میں تحریر کرتے ہیں :-

"(کرافٹ ایبنگ کی) یہ دلیل قطعی غلط ہے جس قدر اصحاب فکر و ذہن میں نے استلذاذ بالنفس کے شائقین میں دیکھے ہیں اتنے کسی دوسرے طبقہ میں نہیں دیکھے۔ میں نے نوجوان مصوروں، شعراء اور خصوصاً ماہرین موسیقی میں شدید رجحانات اس کے دیکھے ہیں اور یہ واقعہ اس نظریہ کے عین مطابق ہے کہ تمام مصور ذو جنسین ہوتے ہیں۔ اس وضع کے نوجوان اکثر ایسے نازک طبع اور حساس ہوتے ہیں کہ وہ استلذاذ بالضد میں ایک قسم کی "بہیمانہ بیرحمی" محسوس کرتے ہیں، اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کو دنیا بھر سے چھپاتے ہیں۔ ان شائقین استلذاذ بالنفس میں بڑے

بڑے علمبرداران حق وصداقت بڑے بڑے معلمین اخلاق اور بڑے بڑے ارباب فکر اور مصلحین شامل ہیں۔"

کرافٹ ایبنگ، ہرشفیلڈ اور بلاخ وغیرہ مشہور محققین اور مصنفین نے استلذاذ بالمثل کے متعلق نظریے تو بہت قائم کیے لیکن افسوس ہے انھوں نے ان نفسیاتی عناصر کو نظر انداز کر دیا جو اس فعل سے متعلق ہیں۔ ہر نوخیز بچہ غیر شعوری طور پر اپنے اوضاع واطوار کسی دوسرے شخص کے نمونہ پر تعمیر کرتا ہے۔ مثلاً جب کسی لڑکے کی پرورش اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوضاع واطوار کا نمونہ اور اپنی سیرت کا سانچہ اپنی ماں کو بنائے تو اس میں خود بخود نسائیت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ خود بخود بلا ارادہ نسوانی طور وطریق کی تقلید کرنے لگتا ہے اور سرگرمی عمل کے تقریباً ہر میدان میں خواہ وہ شہوانی ہو یا کاروباری اس کا تمام رنگ ڈھنگ نسوانی ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ اس طرح نفسیاتی لحاظ سے رفتہ رفتہ "عورت" بن جاتا ہے اور فطری یا طبعی طور پر عورتوں کو اپنی جنس کی طرف شہوانی رغبت نہیں ہوتی بلکہ مردوں کی طرف ہوتی ہے اس لیے وہ لڑکا بھی مردوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اگر ماں یا کسی دیگر سرپرست کے رجحانات طبع استلذاذ بالمثل کی طرف ہوتے ہیں تو وہ لڑکا بھی ویسا ہی کرنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر اسٹیکل کا بھی یہی نظریہ ہے وہ کہتے ہیں کہ:-

"جب کوئی لڑکا نسوانی رنگ ڈھنگ اختیار کرلے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بات اس کے اندر فطری طور پر ہے بلکہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ

اپنی سیرت اپنی ماں یا بہن یا کسی دوسری عزیز قریب عورت کے نمونہ پر تعمیر کر رہا ہے۔"

ڈاکٹر سیڈ گر (Seligman) نے مندرجہ ذیل اسباب بتائے ہیں:-

"(۱) استلذاذ بالمثل کا شوق حُبّ نفسی (Self Emotions) سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) ایسے شخص کے نصب العین میں نہ صرف سابق عورتوں اور مردوں کے اعمال و افعال شہوانی موجود ہوتے ہیں بلکہ وہ اس میں اپنی ذات کی طرف سے بھی کوئی پہلو شامل کر لیتا ہے۔

(۳) جب لڑکے کی پرورش اور تربیت خالص نسوانی ماحول میں آتی ہے تو اس میں نسائیت پیدا ہو کر انفعالی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور عموماً دیکھا گیا ہے کہ اکلوتا بیٹا اکثر استلذاذ بالمثل کا شائق ہو کر بعد میں مفعول بن جاتا ہے۔

(۴) ناقص تربیت سے بھی اس طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر دیکھا گیا ہے کہ مائیں اپنے لڑکوں کو لڑکیوں میں کھیلنے نہیں دیتیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لڑکوں میں کھیلتا ہے اور وہ لڑکیوں کے بجائے اُسے لڑکوں سے رغبت ہو جاتی ہے اور یہی استلذاذ بالمثل کی ابتدا ہے۔"

الفریڈ ایڈلر (Alfred Adler) کا نظریہ بھی اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ جب اٹھان کے وقت لڑکوں کے سامنے کوئی نسوانی نمونہ ہوتا ہے تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ

وہ "کامل عورت" بن جائیں۔ اِس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اپنی شخصیت کی طاقت کو بڑھائیں اور چونکہ وہ "پوری عورت" نہیں ہوتے اس لیے وہ اپنی ذلّت کے خوف سے عورتوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ انھیں عورت سے ڈر لگتا ہے اور خوف، نفرت، شرم اور حقارت وہ جذبات ہیں جن کے باعث ایسا شخص دوسری جنس سے الگ رہتا ہے۔

ہنوور (جرمنی) میں ایک فاضل قانون داں گزرا ہے جس کا نام کارل ہنریخ یولریخ تھا۔ ان حضرت نے کئی برس تک استلذاذ بالمثل کی حمایت و تلقین کی، وہ خود بھی اِس علّت میں مبتلا تھے اور انُھوں نے اس امر کی بے حد کوشش کی کہ جرمنی کے اندر اس کی قانونی اجازت حاصل ہو جائے۔

محقّقین کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر اسٹیکل کا یہ نظریہ زیادہ صحیح اور معقول معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تمام آدمیوں کے اندر ذو جنسیت (Bi-sexuality) موجود ہوتی ہے اور یہ کیفیت سن بلوغ تک باقی رہتی ہے۔ اس کے بعد بعض آدمی اپنے شوق استلذاذ بالمثل کو دبا لیتے ہیں اور طبعی طور پر جنس مخالف کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی طبیعت پر دوسرا شوق غالب رہتا ہے اور وہ صرف استلذاذ بالمثل سے رغبت رکھتے ہیں اور بعض میں دونوں شوق موجود رہتے ہیں۔

انسان درحقیقت حیوانِ مطلق کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے، پہلے حشرات پیدا ہوئے، یہ ترقی پا کر مینڈک، مگرمچھ، کچھوا وغیرہ بنے اور انھیں آبی جانوروں میں سے قانون ارتقاء نے پرندے بنا دیے (چنانچہ اب تک

اُڑنے والی اور درختوں پر چڑھنے والی مچھلیاں پائی جاتی ہیں) پرندوں سے ترقی پاکر چوپائے پیدا ہوئے۔ چنانچہ آسٹریلیا میں ابھی تک ایک چوپایہ جانور ایسا پایا جاتا ہے جو دریا میں رہتا ہے اس کا نام انگریزی زبان میں "ڈک بل" (Duck Bill) ہے یہ انڈے دے کر بچے نکالتا ہے۔ لیکن انھیں دودھ پلا کر پالتا ہے۔ الغرض انسان جانوروں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یہی باعث ہے کہ بہت سی باتیں جو جانوروں میں پائی جاتی ہیں وہ حضرت انسان میں بھی موجود ہیں۔ یا یہ سمجھ لیجئے کہ انسان نے بہت سی باتیں حیوانات سے سیکھی ہیں پھر چونکہ بعض حیوانات میں استلزاد بالمثل کا شوق پایا جاتا ہے، اس لیے بہت ممکن ہے کہ انسان نے بھی یہ فعل مکروہ جانوروں ہی سے سیکھا ہو، یا ورثہ میں اسے ملا ہو۔

مشہور و معروف جرمن ماہر علم الحیوانات پروفیسر کارشس (Carishe) کا قول ہے کہ پلے ہوئے یا مقید جانوروں میں استلزاذ بالمثل کا شوق پیدا ہو جاتا ہے جس کا باعث یہ ہے کہ جنس ثانی موجود نہیں ہوتی۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کو اس بات کا علم تھا۔ چنانچہ قدیم مصریوں میں دو نر تیتروں کو استلزاذ بالمثل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ارسطو نے بھی لکھا ہے کہ:۔

"اگر نر موجود نہیں ہوتا تو مستی میں آکر دو کبوتریاں ایک دوسرے پر بیٹھنے لگتی ہیں۔"

فرانس کے مشہور ماہر علم حیوانات کاونٹ ڈی بفون (Buffoon) نے اپنی کتاب میں جانوروں خصوصاً پرندوں کی بہت سی مثالیں استلزاذ بالمثل

کی لکھی ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ اگر بہت سی قسم کے صرف نر یا صرف مادہ پرند مثلاً تیتر، بٹیر، مرغے، مرغیاں، فاختہ وغیرہ ایک جگہ بند کر دیے جائیں تو ان میں بہت جلد استلذاذ بالمثل کا شوق شروع ہو جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ بمقابلہ مادہ کے نر میں یہ کیفیت جلد پیدا ہوتی ہے اور فرانسیسی محقق سینٹ کلیر ڈی ویلی (St. Clair De Velli) نے لکھا ہے کہ:-

"اگر مینڈھوں، بکروں، کتوں، سانڈ بیلوں وغیرہ کو الگ بند کر دیا جائے تو ان میں بھی یہی شوق پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی مادہ ان کو مل جاتی ہے تو وہ پھر طبعی حالت پر آ جاتے ہیں۔"

بومبار ڈا (Bom Baridus) ساکن شہر لزبن کا قول ہے کہ:-

"ملک پرتگال میں ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ سانڈ بیلوں کے غول میں ہمیشہ ایک بیل ایسا رہتا ہے جو اپنے ساتھی بیلوں کے اس شوق کی تسکین کرتا رہتا ہے اور گائے بکری میں تو یہ حرکت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔"

استیناخ (Ustinakh) کا مشاہدہ یہ ہے کہ سفید چوہوں میں یہ عادت ہے کہ جب ان کے پنجرے سے مادہ دور کر دی جاتی ہے تو وہ آپس میں یہ حرکت کرنے لگتے ہیں، مول (Moll) نے بندروں اور گدھوں کو بھی یہ حرکت کرتے دیکھا ہے۔

استلذاذ بالمثل اور بعض مشہور افراد تاریخی

ایسے مشہور و معروف تاریخی آدمیوں کے سلسلہ میں ڈاکٹر رافائو ویلش (Raffatowitsrki) نے اپنی

کتاب یورانسمہ (Uranisma) میں اسکندر اعظم(۱)، اپیامناداس(۲) (Campramnadas) ورجل(۳)، کانڈ سے(۴) اعظم اور شہزادہ یوجین(۵) کو بھی شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر ہرشفیلڈ (Her Shhafeld) نے اپنی مبسوط کتاب

---

(۱) اسکندر اعظم (۳۵۶ لغایتہ ۳۲۳ ق م) فیلقوس (Philip) شاہ مقدونیہ کا بیٹا تھا ۳۳۶ ق م میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس بادشاہ میں اوائل ہی سے روح عسکریت نمایاں تھی۔ اس نے تمام یونان، ایشیائے کوچک، شام، فینیقیہ، فلسطین و مصر کو فتح کیا۔ بعد ازاں ایران پر حملہ کر کے دارا شہنشاہ ایران کو قتل کیا اور تمام ملک فتح کر لیا اس کی فتوحات ممالک باختر و ہندوستان تک پہنچ گئیں۔ ہندوستان سے وہ براہ سمندر واپس ہوا اور شہر بابل میں گیارہ روز بیمار رہ کر فوت ہوا۔

(۲) اپیامناداس یونان کا زبردست شاعر تھا، طبقہ متقدایان دین سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ اپنی عقل و دانش کے باعث بعض اوقات وہ یونان کے "سات رشیوں" میں بھی شمار ہوتا تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں جزیرہ کریٹا میں پیدا ہوا۔ ایک روایت کے مطابق وہ ستاون برس تک سوتا رہا اور اسی خواب شیریں میں اُسے دیوتاؤں کی طرف سے الہام ہوا جس کے مطابق اس نے اپنی آیندہ زندگی بسر کی۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص ۲۹۹ برس کی عمر تک جیا۔

(۳) ورجل (Virgil) ۷۰ لغایتہ ۱۹ ق۔م۔ روم کا مشہور آفاق شاعر تھا۔ شہر مانتوا میں پیدا ہوا۔ اوّل اوّل زراعت پیشگی کرتا تھا بعد میں دربار تک رسائی ہو گئی تو امیر کبیر ہو گیا۔ منجملہ دیگر تصانیف کے اس کی نظم (اینیڈ) Aenied بے حد مشہور ہے جس کے بارہ حصے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۲۰۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

الموسوم بہ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۲ء میں صفحہ ۶۵۰ لغایتہ ۶۷۴ قدیم و جدید مشہور آدمیوں کی دو فہرستیں درج کی ہیں جن میں تین سو آدمیوں کے نام ہیں۔ خاص خاص نام ملاحظہ ہوں۔ جولیس قیصر[1]، اگسٹس[2]، تائبریس[3]، کالیگلا[4]، کلاڈیس[5]، نیرو[6]، ٹیٹوس[7]، ڈومیشین[8]، نروا[9]، ٹراجن[10]، ہیڈرین[11]، فریڈریک اعظم[12]۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۳) (۴) کانڈے اعظم (Great Gande) ۱۶۲۱ء لغایتہ سنہ ۱۶۸۶ء این ملکہ آسٹریلیا کا بہت بڑا جنرل تھا لیکن بعد ازاں دربار ہسپانیہ میں ملازم ہوگیا۔ سنہ ۱۶۵۹ء میں دربار فرانس سے اس کی صلح ہوگئی اور وہ صوبہ برگنڈی کا گورنر بنا دیا گیا۔

(۵) پرنس یوجین سنہ ۱۶۶۳ء لغایتہ سنہ ۱۷۳۶ء۔ آسٹریلیا کا بہت بڑا مدبر جنرل تھا، جنگ ہسپانیہ میں اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

---

(۱) "جولیس قیصر" (Julius Caeser) سنہ ۱۰۰ء لغایتہ سنہ ۴۴ ق۔م، اول اول بحیثیت ایک فاتح رومی جنرل کے شہرت حاصل کی۔ بعد ازاں اپنی سحر بیانی اور خطابت کے ذریعہ سے رومیوں پر اپنا زبردست اثر قائم کیا۔ یہی طاقت فوجی اور اثر کی بدولت شہنشاہِ روم بن گیا لیکن امراء کا طبقہ اس سے برافروختہ ہوگیا، ایک جماعت نے سازش کرکے تاج پوشی سے ایک ماہ بعد بر سرِ عام قتل کر ڈالا۔

(۲) "اگسٹس" (Caius Octavius Augustus) سنہ ۶۳ لغایتہ سنہ ۱۴ ق۔م۔ روم کا پہلا شہنشاہ ہوا، ۴۵ برس تک سلطنت کی۔ اس کا عہد امن و صلح اور فارغ البالی کے لیے مشہور ہے۔

(۳) "تائبریس" (Tiberius) روم کا دوسرا شہنشاہ تھا، سنہ ۴۲ ق۔م میں پیدا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۴) ہوا اور ۷۹ء میں فوت ہوا، غیر محدود قابلیتوں کا آدمی تھا لیکن خانگی امور میں سخت بدنام تھا۔

(۴) "کالیگلا" (Caligula) روم کا تیسرا شہنشاہ تھا۔ ابتدا میں اچھی سلطنت کی لیکن بعد میں اس کی شہوت رانیوں اور بدمستیوں سے لوگوں نے عاجز آ کر ۴۱ء میں قتل کر دیا۔

(۵) "کلاڈیس" (Claudius) کالیگلا کے بعد شہنشاہ روم ہوا، لیکن اپنی عیش پرستیوں کے باعث وہ اپنے مصاحبوں کے پھندے میں ایسا پھنسا کہ اس کی بیوی اگرپینا (Agrippina) نے زہر دے کر قتل کر دیا۔

(۶) "نیرو" (Nero) ۵۴ء لغایۃ ۶۸ء روم کا سخت بدنام شہنشاہ تھا، بیحد عیش پرست اور بے حد سفاک شخص تھا، بالآخر قتل کیا گیا۔

(۷) "ٹیٹس" (Titus) ۷۹ء لغایۃ ۸۱ء روم کا شہنشاہ تھا، اسی شخص نے سب سے پہلے یروشلم فتح کیا جس کی یادگار میں اب تک "محراب ٹیٹس" مشہور ہے۔ بیحد فحاش اور ظالم شخص تھا۔

(۸) "ڈومیشن" (Domition) شہنشاہ روم۔ سفاکی اور بدکاری میں رسوائے عالم تھا۔ ۹۶ء میں قتل کر دیا گیا۔

(۹) "نروا" (Nerva) ۹۶ء سے ۹۸ء تک شہنشاہ روم رہا۔

(۱۰) "تراجن" (Trajan) اپنے باپ کی جگہ ۹۸ء میں روم کا شہنشاہ ہوا اور ۱۱۷ء تک سلطنت کی۔

(۱۱) "ہیڈرین" (Hadrian) اپنے چچا تراجن کے بعد شہنشاہ روم ہوا اور ۱۳۸ء تک سلطنت کی۔ شہنشاہان روم میں سب سے بڑا شمار کیا جاتا ہے۔

(۱۲) "فریڈریک اعظم" (Friderick II) ۱۷۱۲ء لغایۃ ۱۷۸۶ء جرمنی کی ریاست

شعرائے انگلستان میں مارلو، شیکسپیر، سوفٹ، جان فلیچر، شیلے، بائرن اور ٹینی سن کی نسبت بھی لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انھیں اس کا شوق تھا۔ مؤخرالذکر کے محبوب کا نام آرتھر ہیلم (Arthur Hallam) تھا، ایڈورڈ، کارپنٹر (Edward Carpenter) کا قول ہے کہ اس شوق کے مردوں کو جنگ و جدال سے نفرت ہوتی ہے اور اس کی شائق عورتیں خانہ داری سے گھبراتی ہیں اس لیے ان کے قوائے ذہنی کا رجحان دیگر پُر امن مشاغل خصوصاً علم و فضل کی طرف ہو جاتا ہے اور یہی باعث ہے کہ ان لوگوں میں اکثر صاحب کمال، موجد و مخترع، شاعر، کاریگر، جوتشی، رمال، کاہن، ساحر، ڈاکٹر اور مقتدایانِ دین پیدا ہوئے ہیں۔ یورپ کے عہد نہضت پر غور کر کے دیکھا جاتا ہے تو اس زمانہ میں اس قسم کے بہت سے لوگ ملتے ہیں جو صاحب کمال تھے۔ مثلاً:-

میورسے (Muret) عہد نہضت میں علم مجلسی، اخلاق و ادب کا زبردست ماہر تھا۔ اپنے زمانہ میں بوجہ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت بہت شہرت حاصل کی تھی لیکن یہی شخص ۱۵۵۳ء میں استلذاذ بالمثل کے الزام میں قید ہوا۔ بلکہ جان کے لالے پڑ گئے۔ کسی نہ کسی طرح اس کی رہائی ہوئی اور وہ شہر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۵) پروشیا کا بادشاہ تھا۔ ۱۷۴۰ء میں تخت نشین ہوا، اپنی قابلیت اور فوجی فتوحات سے اپنی ریاست کی شان کو چار چاند لگا دیے حتیٰ کہ وہ یورپ کی بہت بڑی طاقت بن گئی، یہ بادشاہ عالم فاضل و علم دوست تھا، اس کی تصنیف کردہ کتب کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔

طولوز (Toulouse) میں رہنے لگا لیکن دو سال بعد پھر وہ اس جرم میں متہم ہو کر فرانس سے فرار ہوا اور شہر پیڈوا میں رہنے لگا لیکن چار برس بعد یہاں پھر وہ اسی جرم میں ماخوذ ہوا۔

ایرازمس (Erasmus) جو بلحاظ علم و فضل میورسے سے بھی بلند درجہ رکھتا تھا۔ شہر اسٹین (Stein) کی خانقاہ میں رہتا تھا وہاں ایک دوسرے راہب پر عاشق ہو گیا اور اسے عاشقانہ خطوط لکھے جو پکڑے گئے اور بھید کھل گیا۔

عہد نہضت میں جوں جوں علم و فضل کی ترقی ہوتی گئی لوگوں میں اس مشغلہ کا شوق زیادہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ پولیزیانو[1] (Polizianus) اور آریٹینو[2] (Aritino) بھی شائق تھے اور یہی عیب پاپائے اعظم جولیس[3] میں بھی پایا جاتا

---

(۱) انجلو پولیزیانو ۱۴۵۴ء تا ۱۴۹۴ء لاطینی، اطالین اور یونانی زبانوں کا زبردست ماہر تھا، جب اس نے یونانی ملک الشعرا ہومر کی کتاب ایلیڈ (Eliad) کا ترجمہ کیا تو تمام یورپ میں دھوم مچ گئی۔ پرنس لورنزو ڈی میڈیسائی نے اس کی سرپرستی کی اور "ملک الافاضل اطالیہ" بنا دیا۔ علاوہ ازیں وہ فلورنس یونیورسٹی میں السنۂ یونانی و لاطینی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ جب پرنس لارنزو نے اسے اپنے دو لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا تو شہزادہ کی بیوی نے اعتراض کیا کیونکہ وہ کافی بدنام ہو چکا تھا۔

(۲) "آریٹنو" (Aritino) سولھویں صدی میں اطالیہ کا مشہور شاعر اور ظریف تھا ۱۴۹۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۵۶ء میں ایک تپائی پر سے گر کر ہلاک ہوا۔ اپنے غیر فطری ذوق کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے نکالا گیا۔

(۳) "جولیس دوم" بمقام ایلزولا ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۱۳ء میں فوت ہوا۔

تھا، حتیٰ کہ ارسطو شاعر و ادیب تک نے پاپائے موصوف پر حملے کیے تھے اور تاشو[1] (Tasso) کی بھی انفعالی کیفیت بہت مشہور تھی۔

فرانس کا مشہور نقاش و مصور لیونارڈ ڈی ونسی[2] (Leonard Davince) بھی اس مشغلہ کی وجہ سے بدنام تھا۔ ۱۴۷۶ء میں جب اس کی عمر ۲۴ سال کی تھی تو اس پر فلورنیس کی عدالت میں اس الزام پر مقدمہ چلا۔ اسی طرح وہ کئی بار ماخوذ ہوا اور قید کر دیا گیا۔ تمام عمر اس کے گرد خوبصورت لڑکے جمع رہے اور عورت کی طرف کبھی ملتفت نہ ہوا۔

اسی طرح دورِ نہضت کا مشہور و معروف آرٹسٹ مائیکل اینجلو[3] (Michael Angelo) بھی اس طرف بہت مائل تھا۔ اس کے خطوط اور نظمیں جذبات غیر فطری سے مملو ہیں

مائیکل اینجلو کا ہمعصر مصور بزی[4] (Bazzi) اس علت مذمومہ میں اس قدر مشہور تھا کہ لوگوں نے اس کا نام ہی سوڈوما (Sodoma) رکھ دیا۔

(۱) تاشو (Taurquats Tasso) اطالیہ کا مشہور عالم اور شاعر تھا۔ تمام سیورنٹو ۱۵۴۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۵۹۵ء میں فوت ہوا۔

(2) S. Freud, Eina Kindhutserinnerung Delconards Da Yinci 1910.

(3) J. A. Symonds, Life of Michaelanegels.

(4) R. H. hobartcust, Younam an tonis bazzi.

سیلینی (Cellini) بھی اس کا شوقین تھا۔ یہ شخص اپنے زمانہ کا مشہور سنگ تراش اور بُت ساز تھا، خلاف وضع فطری کے جرم میں اس شخص کو سزا بھی ہو گئی تھی۔ (۱)

ملک فلینڈرس کے مشہور و معروف سنگ تراش و مجسمہ ساز جیروم ڈوکیسری (Jerome Duquesnoy) کو اس قدر شوق تھا کہ اسی جرم میں قتل کیا گیا۔ اس کی آخری حرکت یہ تھی کہ وہ شہر گھینٹ (Ghant) کے بڑے گرجا میں بھی وہ اس حرکت سے باز نہ آیا اور آخرکار گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ (۲)

تیرھویں صدی میں فرانس کے اندر یہ علت اس قدر وبا کی طرح پھیلی کہ پیرس کی کونسل نے ۱۲۱۲ء میں اور روئن کی کونسل نے ۱۲۱۴ء میں اس کی سزا قتل قرار دی اور اس مد نظر کیا گیا کہ اگر کوئی عورت کسی مرد کی طرف راغب ہوتی اور وہ مرد اس کی طرف توجہ نہ کرتا تو اسے انسی مشغلہ کا عادی قرار دے کر سزا دیتے تھے۔

فرانس کے اندر چودھویں صدی میں بھی یہ علت بہت پھیلی ہوئی تھی اور بانکوں (Knights) کے طبقہ ٹمپلرس (Tamplars) میں خاص طور پر پائی جاتی تھی جن کی نسبت خیال تھا کہ وہ اس علت مذموم کو ممالک مشرق سے لائے ہیں۔ علاوہ ازیں اطالوی ملکہ کیتھرائن دی میڈیسا نی

---

(1) J. A. Symoud's Life of Cellina

(2) Eekhond's Account of Duguesnoy Jahrbuck Pür Senuelle Zwischepistufen 1899.

دربار اس قسم کے شوقینوں سے اس قدر (Catherine De Medis) کا
مشہور تھا کہ وہ دنیا بھر میں رسوا ہو گئی۔ بایں ہمہ مرتکبین جرم کو وقتاً فوقتاً سخت
سزائیں بھی جاتی تھیں۔ مثلاً ۱۵۸۶ء میں پیرس یونیورسٹی کے ریکٹر (Rector)
دادون (Dadon) نے جب یہ مذموم حرکت کی تو بھانڈا پھوٹ گیا اور
سزا یہ ملی کہ پھانسی پر لٹکا دیے گئے اور لاش کو پھونک دیا گیا۔(۱)

اٹھارویں صدی کے فرانس میں بھی اس کا چرچا اس قدر پایا جاتا تھا کہ
اس زمانہ میں مادام نے جو نوعمر بادشاہ کی طرف سے نائب السلطنت کے فرائض
انجام دے رہی تھی اس شوق مذموم کی اپنے خطوط میں بار بار شکایت کی۔ اس کا
شوہر بھی اسی قسم کا آدمی تھا۔ اس زمانہ میں چونکہ بدچلن لوگوں کو چھانٹ چھانٹ
کر پیرس کے مشہور قید خانہ بیسٹل (Bastille) میں بھر دیا گیا تھا اس لیے
یہ محبس اس قسم کی مذموم عادت کا مرکز بن گئی تھی۔ ۱۷۰۲ء میں بیسٹل کے
اندر ایک نہایت جمیل اور متناسب الاعضاء نوجوان لیبل (Lebel) تھا
پہلے یہ لڑکا ادھر ادھر خدمت گاری کیا کرتا تھا لیکن خود کو بہت شریف زادہ
اور اونچے طبقہ کا ظاہر کرتا تھا۔ جب اس کی عمر دس سال کی ہوئی تو دوپلیسی
(Duplessis) نے اس کے اخلاق خراب کر دیے۔ اس کے بعد یہ بڑے
بڑے فوجی افسروں، نواب زادوں اور پادری صاحبان کے پاس رہا۔ جب
تحقیقات ہوئی تو بہت سے آدمی جو اس سے ملوث تھے زندہ جلا دیے گئے۔

---

(1) P. de l'Estoile Memaries journause, Vol II P. 326.

بعض نے ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے اپنا گلا خود کاٹ لیا، کچھ چھوڑ دیے گئے اور کچھ قید خانہ میں ڈال دیے گئے۔

جرمنی میں قدیم الایام سے اس کا شوق چلا آتا ہے۔ امانیس مارسیلینس (Ammianus Marcellinus) نے لکھا ہے کہ:۔

"سلطنت روم کے آخری عہد میں بعض جرمن قبائل کے اندر یہ مذموم عادت پائی جاتی تھی۔ قرون وسطیٰ میں بھی یہ شوق موجود تھا۔ جرمن خاندان شہنشاہی کے بہت سے شہزادے آپس میں یہی تعلقات رکھتے تھے۔"

جرمنی کے مشہور شاعر ہنری فان کلیسٹ (Henrich Von Klist) کو اس کا بہت شوق تھا۔ اس کا خاص محبوب ارنسٹ فان فیوبل (Ernst Von Fuel) تھا جو بعد میں پروشیا کا وزیر جنگ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ اس خط سے کیا جا سکتا ہے جو کلیسٹ نے ۱۸۰۵ء میں بعمر ۲۸ سال کو لکھا تھا، لکھتا ہے کہ:۔

"تم نے میرے لیے یونانیوں کا دور پیدا کر دیا ہے۔ میری روح تمہارا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جب تم تھون (Thun) کی جھیل میں نہاتے تھے تو میں تمہارے خوبصورت جسم کو تکا کرتا تھا .... آؤ میرے ساتھ انسپاخ (Anspach) چلو اور عشق و محبت کے لطف اٹھاؤ .... میں کبھی شادی نہ کروں گا۔"

انیسویں صدی کی جرمنی کے اندر ہر طبقہ میں بعض نہایت مشہور لوگ اس

[illegible]ق کے پیدا ہوئے۔ چنانچہ ایک طرف ہم کو ایک اعلیٰ صاحب علم و فضل اور عالی دماغ شخص الکزینڈر وان ہمبولٹ (Alexander Van Hambdolt) نظر آتا ہے اور دوسری طرف ایف۔ اے کرپ (F. A. Krupp) جیسے شخص کو دیکھتے ہیں یہ وہی شخص ہے جس نے بمقام ایشین (Essen) جرمنی کا مشہور کارخانہ آہن سازی قائم کیا تھا، اس شخص کی نسبت لکھا ہے کہ وہ "جزیرہ کیپری" (Capri) کی تفرج گاہ میں خوب رنگ رلیاں منایا کرتا تھا ہر وقت خوبصورت لڑکے اسے گھیرے رہتے تھے اور یہ ان پر پانی کی طرح روپیہ بہاتا تھا، بالآخر حد درجہ بدنام ہو گیا" مشہور جرمن اخبار وور وار ٹس (Vor Wiarts) نے کیپری کے متعلق کرپ کی زندگی کے حالات شائع کیے جس پر خاندان کرپ نے برافروختہ ہو کر اخبار مذکور پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا لیکن تھوڑا ہی بعد کو کرپ نے خودکشی کر لی اور وہ مقدمہ اٹھا لیا گیا۔

اہل قلم جرمنوں میں منجملہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے پلیٹن (Platen) کے۔ پی۔ مارٹز (K. P. Maritz) اور ایفلینڈ (Iffland) کا نام بھی اسی سلسلہ میں لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مول (Mall) کا قول ہے کہ خاص شہر برلن میں چھ سات سو اشخاص انھوں نے ایسے دیکھے ہیں جنھیں اس کا شوق ہے اور ڈاکٹر ہرشفیلڈ بیان کرتے ہیں کہ وہ برلن میں دس ہزار سے زیادہ ایسے لوگوں کو جانتے ہیں۔ برلن میں بعض بڑے بڑے ہوٹل ایسے ہیں جہاں عموماً اس کے شائق جاتے

ہیں۔ علاوہ ازیں وہاں بہت سے نیپن (Kneipen یعنی کھانے پینے کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں جہاں خوبصورت لڑکے بطور خدمتگار ملازم ہوتے ہیں۔ برلن کی پولیس اگرچہ ان رازوں سے آگاہ ہے لیکن کوئی دخل نہیں دیتی۔

جرمنی ہی دنیا بھر میں ایسا ملک ہے جہاں کھلم کھلا اس کی تحریک پائی جاتی اور اس کے متعلق جتنی کتابیں جرمنی سے شائع ہوئی ہیں اتنی دنیا کے کسی ملک سے شائع نہیں ہوئیں۔

قدیم ٹیوٹانک (Teutonick) زمانہ میں جرمنی کے اندر اس فعل کی کوئی سزا مقرر نہ تھی لیکن جب تمام قوم عیسائی ہوگئی اور کلیسا کا زور بڑھا تو یہ فعل جرم قرار دیا گیا۔ شاہ الارِیق دوئم کا فرمان جاری ہوا کہ ایسے شخص کو زندہ جلا دیا جائے۔ بعد ازاں ساتویں صدی میں شاہ چنداسس ڈنڈ (Chindas Dind) نے فرمان جاری کیا کہ جو شخص یہ حرکت کرے اس کو خصّی کر دیا جائے اور تیرھویں اور چودھویں صدی میں زندہ جلانے کی سزا مقرر ہوئی۔

عورتیں اور استلذاذ بالمثل

حکیم افلاطون یونانی کی "سمپوزیم" (Symposium) یعنی "بزم نشاط" میں رجحانات جنسی کا جو نظریہ ارسطوفانیس[1] (Aristo Phanes) نے قائم کیا ہے اس میں عورت اور مرد کا درجہ مساوی رکھا ہے۔ ایک کیتھولک پادری نے ہیولاک ایلس[2] (Havelock Ellis) کو سے بیان کیا کہ چار میں ایک مرد اور تین عورتیں اس شوق کا اقرار کرتی ہیں، یعنی یہ شوق بہ نسبت لڑکوں کے لڑکیوں میں زیادہ پایا جاتا ہے، کیونکہ اسکولوں، کالجوں اور خانقاہوں میں ان کو اس کا بہت موقع ملتا ہے۔

اس شوق کا سب سے پہلا واقعہ جو مفصل طور پر قلمبند کیا گیا، اس میں ایک عورت ہی ملوث تھی، اس کا نام (Catherine Margretha Lincham) تھا۔ اس نے مردانہ کر ایک دوسری عورت سے "شادی" کی۔ بالآخر بھانڈا پھوٹا، گرفتار ہوئی۔ اور ۱۷۲۱ء میں اس سزا کے موت دی گئی۔[3]

(۱) ارسطوفانیس (۴۴۸ لغایت ۳۸۰ ق۔م) یونان کا مشہور ڈرامہ نویس و ظریف شاعر تھا۔

(2) Havelock Ellis. Sexual Inversion P. 135.

(3) F. C. Muller Ein Weiterer Fall Von Contrarer Sexual Empfindung.

عورت کے اس شوق کے متعلق خاص واقعہ وہ ہے جو ہنگری کی (Countess Saroltauy) پر چلایا گیا تھا۔ یہ عورت ہمیشہ مردانہ لباس میں رہتی تھی۔ اس نے ایک لڑکی سے "شادی" کر لی جس پر مقدمہ چلا لیکن ملزمہ عدالت سے بری ہو گئی اور اسے مردانہ لباس پہننے کی اجازت مل گئی۔(۱)

ایک عجیب بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ جس طرح اس ذوق کے مردوں میں اکثر صاحب کمال ہوتے ہیں اسی طرح اس ذوق کی عورتوں میں بھی کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جن عورتوں کو اس کا شوق ہوتا ہے ان میں کوئی مردانہ خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ مگر ہم اس قول سے متفق نہیں، کیونکہ دنیا کی تاریخ ایسی بہادر عورتوں سے بھری پڑی ہے جن میں یہ مذموم عادت نہیں پائی جاتی تھی۔ مثلاً مصر کی ملکہ ہتشپسٹ (Hatschepsut) کو لیجیے جس کی نسبت ایک مؤرخ کا قول ہے کہ وہ تاریخ میں سب سے پہلی صاحب عظمت وجلال عورت تھی۔ اس ملکہ میں زبردست مردانہ خصوصیات تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی یادگار مردانہ لباس میں قائم کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات مصنوعی داڑھی بھی لگا لیتی تھی، اسی طرح آشوریہ کی ملکہ سمی رامیس (Semi Ramis) ہندوستان کی ملکہ رضیہ سلطانہ، چاند سلطانہ، نور جہاں بیگم، تارا بائی وغیرہ شجاعت، تدبر و سیاست میں مردوں سے کم نہ تھیں لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کو اس حرکت کا شوق تھا۔ اگر عہد قدیم و جدید کی بعض عورتیں ضرور ایسی گزری ہیں جو کسی خصوصیت خاصہ کی مالک تھیں اور ان میں یہ ذوق بھی پایا جاتا تھا۔

(1) K. Rafet-Ebing Psychopathia Sexualis.

چنانچہ کیتھرائن دوم، ملکۂ روس اور سویڈن کی ملکہ کرسٹینا (Christina) مردانہ جرأت و بہادری کے ساتھ استلذاذ بالمثل کی بھی عادی تھیں، بعض بڑی بڑی ماہر دینیات اور معلمۂ اخلاق عورتیں مثلاً بادام بلاوٹسکی (Blavatisky) اور لوئسی مائکل (Lousi Michel) بھی یہ ذوق رکھتی تھیں۔

اٹھارویں صدی سے اب تک بعض بڑی مشہور ایکٹریسیں اور دیگر فنون کی اعلیٰ ماہر عورتیں کسی نہ کسی صورت میں اس کی شائق پائی گئی ہیں سیفو (Sappho) جو اپنے زمانہ کی بڑی زبردست شاعرہ مانی جاتی تھی اور جس کا نام نہایت ادب و احترام کے ساتھ شعرائے یونان کے باوا آدم ہومر کے ساتھ لیا جاتا تھا اس عادت میں مبتلا تھی۔ ایک لڑکی فاؤن (Phaon) کے عشق میں وہ اس قدر شدت سے مبتلا ہوئی کہ جان دینے کے لیے سمندر میں کود پڑی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو اسی ذوق و شوق کے خطوط لکھا کرتی تھی جیسا الکائیس (Alcaeus) اپنے محبوب لڑکوں کو لکھا کرتا تھا۔(۱) اس زمانہ کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے اندر یہ شوق قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا اور اس فن میں اسپارٹا (Sparta) لزبون (Lasbon) اور ملیطوس (Miletus) کی عورتیں زیادہ مشہور تھیں۔

یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ لٹریچر میں بمقابلہ مردوں کے ایسی عورتوں کا ذکر زیادہ آتا ہے۔ چنانچہ آریوسطو (Ariosto) نے عورتوں کے اس

(۱) سیفو (Sappho) کی اس بدنامی کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ انگریزی زبان میں لفظ "Sapphism" کا مفہوم ہی "خلاف فطرت فعل" ہو گیا۔

قسم کے رجحانات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ واُدرو (Diderod) کا مشہور ناول لا ریلیجیس (La Religieuse) جب اول اوّل شائع ہوا تو عام خیال یہ ہوا کہ یہ ناول درحقیقت کسی کلیسہ کی کنواری (Nun) کا لکھا ہوا ہے جس نے ان مظالم کا حال بیان کیا ہے جو دَیر کی راہبہ (Albes) نے بسلسلۂ استلذاذ باشن اس پر کیے تھے۔ عوام کا خیال یہ بھی ہوا کہ مصنف نے راہبہ کے پردے میں درحقیقت (Albess of Chelles) کا خاکہ اُڑایا ہے جو نائب السلطنت کی لڑکی اور شاہی خاندان کی ایک رکن تھی۔

اسی طرح ایک فرانسیسی ڈرامہ بنام "لی پلیزر دوس دو کلائٹر" (La Plaisirs Ducloitre) یعنی راہبہ خانہ کا "عیش و عشرت" ۱۷۷۳ء میں لکھا گیا اس میں بھی ایک سین اس ذوق کا دکھایا گیا ہے۔

۱۸۳۵ء میں گاتے (Goutiers) نے اس قسم کی ایک عجیب و غریب دلچسپ حکایت "مادیموزیل دی ماپن" (Mademaiselle De Manpier) کے نام سے لکھی۔ اس میں ہیروئن مردانہ لباس پہن کر زندگی بسر کرتی ہے، کبھی عورتوں کو پٹہ بازی سکھاتی ہے اور کبھی کسی تھیٹر میں مغنّیہ بن جاتی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ فرانس کے مشہور اور ہردلعزیز فسانہ نگار موسیو اسے بیلو (A. Belat) نے ایک دلچسپ ناول موسوم بہ "مادیموزیل جراد ما فمہ" (Mademoiselle Giraud Mafemma) شائع کیا جس سے عوام کو بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس قصّہ کا خلاصہ یہ ہے کہ

ایک شخص نے شادی کی تھی مگر اس کی بیوی پاس نہیں آنے دیتی تھی کیونکہ وہ اپنی پرانی سہیلیوں سے بہت مالوف تھی۔ الغرض اسی قسم کے بہت سے ڈرامے بہت سے ناول اور بہت سی نظمیں ہیں جن میں مختلف مصنفین نے عورتوں کے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

ایک امر اور بھی قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اس شوق کے سلسلہ میں تشدد کے جس قدر جرائم سرزد ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر عورتیں ملوث پائی جاتی ہیں، اس ذوق کے مرد بوجہ اپنی نسائی خصوصیات کے کسی کو زدوکوب یا قتل کرنے کے مرتکب نہیں ہوتے لیکن عورتیں ان جرائم سے بھی نہیں چوکتیں۔

اس قسم کا سب سے پہلا تاریخی مقدمہ وہ ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اندر ۱۸۹۲ء میں ہوا اور جسے عرف عام "ممفس کیس" (Memphis Case) کہتے ہیں۔ واقعات مقدمہ یہ تھے کہ ایک عورت ایلائس مائیچل (Ellice Mitchell) نے مردانہ لباس اور نام اختیار کرکے ایک بھولی بھالی لڑکی فریڈا وارڈ (Frida Wood) کو بہکا کر اس سے شادی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب یہ راز فریڈا کی بہن کو معلوم ہوا تو کامیابی نہ ہوئی۔ ایلائس مائیچل کے دل کو اس واقعہ سے اس قدر صدمہ گزرا کہ اس نے اپنی معشوقہ فریڈا ہی کا گلا کاٹ ڈالا، مقدمہ چلا لیکن عدالت نے ملزمہ کو فاترالعقل قرار دے کر چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر جے۔ جی کیرنان (J. G. Kiernan) نے شہر شکاگو کی دو بہنوں کی نسبت بیان کیا جو عام طور سے "ملر ہمشیران" (Tiller Sisters)

کے نام سے مشہور تھیں، دونوں بہنیں ادنٰے درجہ کے تھیٹروں میں کام کیا کرتی تھیں، نسل کے لحاظ سے ان میں یورپین اور حبشی خون ملا ہوا تھا کہنے اور دیکھنے کو تو یہ دونوں عورتیں "بہنیں" تھیں۔ لیکن فی الحقیقت "میاں بیوی" کی طرح رہتی تھیں۔ ایک کو فطرتاً اس فعل سے رغبت تھی اور دوسری کو نفرت۔ چنانچہ جب اس کا تعلق کسی مرد سے ہو گیا تو اس نے اپنی بہن کو چھوڑ دیا، اس بہن کو آتش رقابت نے اس قدر جلایا کہ جب رات کو وہ دونوں کمرہ میں پڑے سو رہے تھے تو یہ چپ چاپ اُس کمرہ میں گھس گئی اور مرد کو گولی مار دی، ملزمہ گرفتار ہوئی مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام کی سزا دی گئی۔

ایسا ہی ایک واقعہ جو شکاگو میں گزرا تھا ماہ جون ۱۸۹۹ء کے "نیو آرلینز Medicine" میں شائع ہوا تھا ایک سند یافتہ نرس (Nurse) دوسری جوان عورت کے ساتھ چودہ برس تک رہی، اسی دوران میں وہ عورت چار مرتبہ اسے چھوڑ کر چلی گئی لیکن ہر مرتبہ کہنے سننے سے واپس آگئی۔ آخر کار پانچویں مرتبہ جا کر اُس نے ایک مرد سے شادی کر لی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نرس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اُس نے اُس مرد کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ خوش قسمتی سے زخم مہلک نہ تھا اور مرد کی جان بچ گئی۔ ملزمہ گرفتار ہوئی، مقدمہ چلا لیکن عدالت نے صرف سزائے جرمانہ دینے پر اکتفا کی اس نے دو مرتبہ شادی کی لیکن دونوں شوہروں کو چھوڑ بھاگی۔

شکاگو میں ایک اور واقعہ ایسا ہی گزرا جس میں ایک روسی لڑکی انارو بینوچ (Annaru Binovitch) نے ایک دوسری روسی لڑکی کو سفر

رشک و حسد کی بنا، پر گولی ماردی، اناّ اس لڑکی کو بچپن سے چاہتی تھی۔ معشوقہ کو گولی مار کر اناّ نے اپنے بھی گولی مار لی اور اس طرح دونوں کا خاتمہ ہو گیا، بات یہ ہوئی کہ اناّ کی معشوقہ ایک مرد سے ملنے لگی۔ اِس پر آتشِ رقابت بھڑکی جس نے "عاشق و معشوق" دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

جن عورتوں کو اس کا شوق ہوتا ہے وہ کبھی کبھی دِل شکستہ ہو کر خودکشی بھی کر لیتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۰۱ء میں امریکہ کی ریاست مساچوسیٹس (Massochusettes) میں اسی قسم کا مہلک واقعہ رونما ہوا۔ اکیس ۲۱ سال کی ایک لڑکی بیمار پڑی جس کی تیمار داری ایک شوہر دار عورت نے کی، یہ عورت اس لڑکی سے عمر میں چودہ ۱۴ سال بڑی تھی۔ دونوں میں محبت پیدا ہو گئی۔ اور اس قدر بڑھی کہ عشق کے درجہ تک پہنچ گئی۔ لیکن لڑکی کی ماں اور عورت کے شوہر کو یہ ضرورت سے زیادہ "گہری محبت" ناگوار معلوم ہوئی اور انھوں نے روک تھام کرنا چاہی، چنانچہ لڑکی کو ایک دُور دراز مقام پر بھیج دیا گیا۔ مگر باایں ہمہ دونوں میں چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اِن ملاقاتوں کا راز افشا ہو گیا تو اور زیادہ سختی ہونے لگی۔ بالآخر مجبور ہو کر نوجوان لڑکی نے ریوالور لیا اور اپنی ماں کے سامنے اپنی کنپٹی میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔

اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ ۱۹۰۵ء میں بمقام نیویارک گزرا، عورت واقعہ یہ تھی کہ ایک بہت پرانا جہاز ران جو سالہا سال یورپ اور امریکہ کے درمیان آنے جانے والے جہازوں کی ناخدائی کر چکا تھا بیمار پڑا۔ اور "ملاح خانہ" (Sailor's Home) میں داخل کر لیا گیا۔ اس کا نام جان وینڈ

(John Weed) تھا۔ چند روز بعد دل شکستہ ہو کر اس کپتان نے اپنا گلا کاٹ لیا۔ مرنے کے بعد معلوم ہوا کہ "کپتان ویڈ" در حقیقت ایک عورت تھی اور یہ بھی تفتیش سے ثابت ہوا کہ خودکشی کا باعث اپنی "معشوقہ" سے جدائی تھی۔

نوجوان لڑکیاں بسا اوقات خوبصورت ایکٹرسوں پر ایسی عاشق ہو جاتی ہیں کہ انھیں دین و دنیا تک کی خبر نہیں ہوتی اور اکثر اس یک طرفہ عشق کا نتیجہ مایوسی اور پھر خودکشی ہوتا ہے۔ مثلاً چند سال ہوئے فلاڈلفیا میں ایک انیس سال کی نوجوان لڑکی جو ایک متمول اور عالی مرتبہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی نہایت حسین و جمیل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ مس میری گارڈن ایکٹریس پر عاشق ہو گئی، ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملاقات کرنا کبھی نصیب نہ ہوا۔ نوجوان عاشق زار لڑکی ایکٹریس کی تصویر کے سامنے دو زانو بیٹھ جاتی اور اس کی پوجا کیا کرتی اور پھر اس خیال سے کہ شاید اسے کبھی میری گارڈن کی مشاطگی کی مسرت نصیب ہو۔ نوجوان لڑکی نے بال اور ناخن بنانا بھی سیکھے۔ اور آخر کار دل شکستہ ہو کر ریوالور سے خودکشی کر لی۔

یہ شوق صرف قدیم یونانی عورتوں ہی میں نہیں تھا بلکہ قدیم اینگلوسیکسن (Anglo Saxons) قوم میں بھی تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ساتویں صدی میں تھیوڈور کی کتاب "الکفارہ" (Throdores Panitantial) رائج تھی جس میں اس فعل کے شائق مردوں اور عورتوں کے لئے بطور کفارہ علیحدہ علیحدہ ریاضتیں درج تھیں۔ مرد کے لیے مدت ریاضت اگرچہ زیادہ تھی لیکن عورت کے لیے صرف تین سال کی ریاضت مقرر کی گئی تھی۔

دنیا کی تمام وحشی قوموں کی عورتوں میں یہ شوق مردوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مور نہاٹ (Moerenhout) سیاح کا قول ہے کہ نیوزی لینڈ کی عورتوں کو اس کا بہت شوق ہے یہی حال برازیل کی عورتوں کا ہے ڈاکٹر گنڈارو (Gandaro) نے اقوام برازیل کی نسبت تحریر کیا ہے کہ:۔

"وہاں کے اصلی باشندوں میں عورتوں کا ایک خاص طبقہ ہے جنہوں نے تمام عمر پاک دامن رہنے اور کسی مرد کی صورت نہ دیکھنے کا عہد کر لیا ہے یہ عورتیں تمام زنانہ مشاغل ترک کر دیتی ہیں۔ تمام کام مردوں جیسے کرتی ہیں، بال بھی ترشوا کر مردوں جیسے رکھتی ہیں، یہ عورتیں تیر و کمان سے مسلح ہو کر مردوں کے ساتھ میدان جنگ میں جاتی اور لڑتی ہیں، ہر عورت کے ساتھ ایک دوسری عورت ہوتی ہے جو اس کی ہر طرح خدمت کرتی ہے"(۱)

امریکہ کے اصلی باشندوں میں اس طرح کی عورتیں بکثرت پائی جاتی ہیں، اور روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں یہ شوق زمانہ قبل تاریخ سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ برطانوی کولمبیا (Columbia) کی قدیم قوم سالش (Salish) میں اس قسم کی روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔(۲)

کناڈا و مونٹانا کی قوم اسینی بوئین (Assini Boini) اور

---

(1) Gandona Quoted By Lamaces Archinis -Per-i-Anthropologie, 1889.

(2) Journal Anthropological Institute July-Decr, 1904. P. 342.

آئیووا (Jowa) کی قوم "فاکس" (Foxe) میں بھی قدیم روایات اس طرح کی پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہم دو روایتیں ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

ایک روایت یہ ہے کہ ایک شخص کی بیوی اپنی نند کی محبت میں اس قدر مبتلا ہوئی کہ دونوں نند بھاوج گھر سے بھاگ گئیں۔ ان دونوں کے تعلق سے ایک بچہ پیدا ہوا جو گوشت کا لوتھڑا تھا۔ مرد نے ان دونوں کا تعاقب کر کے ڈھونڈھ نکالا اور اپنی بیوی اور اس مضغۂ گوشت لڑکے کو مار ڈالا۔

دوسری روایت ہے کہ عرصہ ہوا کسی زمانہ میں دو جوان عورتیں آپس میں بہت محبت رکھتی تھیں اور اسی طرح دو جوان مرد آپس میں بہت دوست تھے دونوں مرد ان عورتوں میں ایک ایک پر فریفتہ تھے۔ لیکن وہ عورتیں ان سے بات تک نہ کرتی تھیں۔ چند روز تک تو ان جوانوں نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ مگر پھر انھیں ان عورتوں کی طرف سے کچھ شک پیدا ہوا۔ بالآخر ایک دن موسم گرما میں جب وہ دونوں عورتیں باہم مل کر جنگل میں لکڑیاں توڑنے گئیں تو وہ دونوں جوان بھی چھپ کر ان کے پیچھے گئے اور ایک مقام پر خاموشی کے ساتھ چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک تو وہ دونوں عورتیں لکڑیاں توڑنے میں مصروف رہیں لیکن بعد میں ان کی آواز آنا بند ہو گئی۔ جب یہ حالت ہوئی تو وہ دونوں جوان چپکے چپکے دبے پاؤں اس طرف گئے جہاں وہ عورتیں تھیں اور وہاں جو کچھ دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔

بقول مسٹر جیکبس (Jacobs) جن کا قول پلاس ... ہ دبارٹیلس (Plass & Bartils) نے بھی نقل کیا ہے جزیرۂ بالی (Bali) کے

مردوں میں جتنا شوق اس حرکت کا پایا جاتا ہے اُسی قدر وہاں کی عورتوں کو بھی ہے۔

ڈاکٹر بامین (Baumaun) سیاح جنھوں نے جزیرۂ زنجبار وغیرہ کی خوب سیر و سیاحت کی ہے فرماتے ہیں کہ مردوں میں تو یہاں یہ شوق خیر پایا ہی جاتا ہے لیکن یہاں کی عورتیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ یہ لکھتے ہیں کہ:-

"اگرچہ مشرقی رسم و رواج کی وجہ سے یہ عورتیں کھلم کھلا مردانہ لباس نہیں پہن سکتیں۔ لیکن پرائیوٹ طور پر محلوں میں وہ ایسا ضرور کرتی ہیں اس قسم کی عورتوں کی چال ڈھال تمام مردانہ ہوتی ہے اور خوبصورت عورتوں کو سبز باغ دکھا کر اپنے پھندے میں پھانس لیتی ہیں۔"

ڈاکٹر کوچر (Kocher) لکھتے ہیں کہ:-

"اگرچہ عرب کے مردوں میں یہ شوق بہت عام ہے، لیکن ان عورتوں میں یہ شوق اس قدر زیادہ نہیں ہے۔"

مصر کے متعلق ڈاکٹر گوورڈ کوچر (Gouerd Kocher) لکھتے ہیں کہ:-

"اس ملک کی عورتوں میں یہ شوق فیشن بن گیا ہے۔ حتیٰ کہ حرم سرا کی ہر عورت اپنے لیے ایک "دوگانہ" رکھتی ہے۔"

کہتے ہیں کہ ترکی کی عورتوں میں یہ شوق بہت شاذ پایا جاتا ہے۔ البتہ سولھویں صدی میں بقول برانتومی (Brantome) ترک عورتوں کا شوق وہاں کے حماموں میں نظر آتا تھا اور اسی صدی میں لیوا فریقانوس (Leo Africanus) نے بیان کیا تھا کہ مراکش کی عورتیں اس میں

اس قدر مبتلا ہیں کہ وہاں دار الخلافہ شہر فاس (Faz) میں ایسی عورتوں کے باقاعدہ اڈے موجود ہیں۔ شہر اناپیہ میں ایک ترک شاعرہ کی قبر ہے جس کا نام مہری خانم تھا اور اس شوق میں یعقوب سے کم شہرت نہ رکھتی تھی۔

ڈاکٹر کورے (Corre) کا بیان ہے کہ فرانس کے فرقہ مقبوضات کی عورتوں میں بھی یہ شوق بشدت پایا جاتا ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ:-

"میں ایک خوبصورت اور شریف یورپین عورت سے واقف ہوں جو کئی بچوں کی ماں ہے۔ یہ شریف عورت ڈر کے مارے بازار نہیں جاتی کیونکہ وہاں کی عورتیں اس سے گستاخانہ طور پر اظہار عشق کرنے لگتی ہیں اور ایسے ایسے اشارے کنایے کرتی ہیں جسے کوئی شریف زادی گوارا نہیں کر سکتی۔"

ان ہی ڈاکٹر صاحب نے کئی واقعات ایسے بیان کیے ہیں کہ بعض دیسی عورتوں نے کمسن لڑکیوں کو پکڑ کر زبردستی ان کو اپنا معمول بنایا۔

بقول ڈاکٹر لوریان (Lorian) چین و ماچین کی عورتوں میں اس شوق کا پتہ نہیں لیکن ہندوستان کے زن و مرد میں یہ شوق موجود ہے۔

ہندوستان کی عورتوں میں اس کے شائق ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان میں اس شوق کے متعلق کم از کم پانچ اصطلاحیں پائی جاتی ہیں یعنی (۱) دوگانہ (۲) زناخی (۳) سحتر (۴) چپٹ بائی (۵) چپٹ باز۔

ہندوستانی شعراء نظیر، رنگین و جان صاحب نے اپنے کلام میں اس شوق کی نسبت کثرت سے اشارے کیے ہیں۔ بلکہ جان صاحب نے تو تمام کاروائی نظم کی

بیان کردی ہے۔ عورتوں کی اصطلاح میں اس فعل کو "چپٹ" یا "چپٹی" کہتے ہیں اور ایسی عورتوں کی اصطلاح میں "ساتھ رہنے" کو "جدا رہنا" کہتے ہیں۔

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب (Sexual Inversion) میں ہندوستان کے بعض واقعات بیان کیے ہیں:۔ مثلاً:۔

"شہر ..... کے جیل خانہ میں سپرنٹنڈنٹ نے عورتوں کے احاطہ سے متعدد آلات برآمد کیے جو چکنی مٹی سے بنا کر دھوپ میں سکھا لیے گئے تھے۔ ان کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں کام میں لایا گیا ہے۔"

"شہر کے قید خانہ میں ایک مردنما عورت تھی جو اوائل عمر سے خراب ہو کر کسبی بن گئی تھی۔ اس عورت کی "بیوی" ایک ذلیل سی عورت تھی لیکن اس میں عنصر نسائیت زیادہ غالب تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک روز وہ عورت مقامی پنڈت جی کے پاس گئی اور ان سے درخواست کی کہ وہ دیوتا سے کہہ سن کر ایسا کر دیں کہ اس کی "بیوی" حاملہ ہو جائے۔"

(واضح ہو کہ سنسکرت کی کتب طب مثلاً چرک و سشرت میں اس امر کا امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ دو عورتوں کے اس تعلق سے حمل قرار پا کر ایک مضغۂ گوشت بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو آریوں کی علم طب کی مختصر تاریخ — (History of Aryan Medical Science)

"شہر ...... میں دو عورتیں "جدا جدا رہتی تھیں" ان میں ایک برہمنی تھی اور دوسری گڈریہ۔ دونوں آپس میں "میاں بیوی" تھیں۔ اسی طرح ایک مسلمان عورت کو دیکھا گیا جس نے اس کا اقرار کیا کہ ایک اور مسلمان

عورت نے بیان کیا کہ اسے یہ شغل بارہ برس کی عمر میں ایک پڑوسن نے سکھایا تھا۔ اسی طرح مالن کی دو بیوہ لڑکیاں تھیں جو اس کی شائق تھیں۔"

ہندوستان کے جیل خانوں میں عورتوں کا جو حال ہے وہی یورپ کے جیل خانوں میں ہے۔ بلکہ تحقیق کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے قیدیوں میں مردوں کے اندر استلذاذ بالمثل کی علت اس قدر زیادہ نہیں جس قدر عورتوں میں ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات بھی بہت دلچسپ ہے یعنی پیشہ ور عورتوں میں بھی جنہیں مردوں کی کوئی کمی نہیں، اس کا شوق ہوتا ہے۔ برلن میں ۲۵ فیصدی پیشہ ور عورتیں یہ شوق رکھتی ہیں اور بقول پیرنٹ دوشاتلے (Parent Dechalets) پیرس میں بھی یہی نسبت ہے لیکن ڈاکٹر بورنوائل (Bourneville) کا قول ہے کہ "پیرس کے شفاخانوں میں جس قدر عورتیں زنانہ امراض کے سلسلہ میں زیر علاج ہیں ان میں ۷۵ فی صدی ایسی ہیں جو اس کی عادی تھیں۔"

ڈاکٹر ہیمر کا قول ہے کہ جرمنی کے اندر منجملہ ۶۲ کے ۱۴۱ اس کی شائق پائی گئیں۔ ہیولاک ایلس (Havelock Ellis) کے ایک دوست نے بیان کیا کہ پیرس کی پیشہ ور عورتوں میں اس کا شوق بے حد رائج ہے۔

لمبروزو اور فریرو (Lombroso & Ferrero) نے اپنی کتاب "پست اخلاق عورت" (La Dauna Deliquente) میں پیشہ ور عورتوں میں اس شوق کے پائے جانے کے اسباب حسب ذیل تحریر کیے ہیں:-

(۱) ضرورت سے زیادہ ہیجانِ نفس۔

(۲) عرصہ تک مرد سے دور کسی جگہ مقید رہنا۔

(۳) ہر وقت عورتوں ہی کی صحبت میں رہنا جیسا قحبہ خانوں میں اکثر ہوتا ہے۔

(۴) بڑھاپے کے ساتھ خواہش نفسانی کی زیادتی۔

(۵) پیشہ کرتے کرتے جنس مقابل سے جی بھر جانا۔

(۶) اپنے جاننے والوں کے ساتھ محبت کا نہ ہونا۔

یہ شوق خصوصیت کے ساتھ ان عورتوں میں زیادہ نظر آتا ہے جو اپنے مشاغل زندگی کے لحاظ سے زیادہ وقت مردوں سے علیحدہ بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں، چنانچہ کلیسا کی کنواریوں (Nuns.) میں اور بڑے بڑے ہوٹلوں کی خادمہ عورتوں میں اسی سبب سے یہ عادت پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں سوئزرلینڈ کا ایک واقعہ بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ ایک انگریز نے معہ اپنی بیوی کے وہاں بود و باش اختیار کی اور بیوی کے لیے ایک خوبصورت لڑکی بطور پیش خدمت ملازم رکھی گئی، جسے رات دن وہیں رہنا پڑتا تھا، کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ رات کے وقت سونے کے لیے اور نئی نئی عورتیں لاتی ہے، معلوم ہوا کہ وہ عورت پہلے ایک بڑے ہوٹل میں کام کیا کرتی تھی وہیں اسے یہ شوق پیدا ہوا تھا۔

اسی طرح بڑی بڑی دوکانوں، کوٹھیوں اور کارخانوں میں جو لڑکیاں یا عورتیں عرصہ تک ساتھ رہتی ہیں، بلکہ جنھیں ایک ہی جگہ سونے کا موقع ملتا ہے اُن میں یہ شوق پیدا ہو جاتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ایک کمرے میں

صرف دو عورتیں ہوں۔

روم کے کارخانوں میں نائسفورو (Nice Foro) نے عورتوں کے متعلق زبردست تحقیقات کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ:۔

"قوم کی وہ "نیک بچیاں" جن کی عمر بارہ چودہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور جو بغل میں بقچہ دبائے، نگاہیں نیچی کیے نہایت معصومانہ انداز سے گزر جاتی ہیں، اپنے دلوں میں کیسے طوفانی جذبات رکھتی ہیں، سلائی کے کارخانوں میں جاکر دیکھیے کہ جس وقت کوئی نگراں موجود نہیں ہوتا تو ان لڑکیوں میں باہم کس قسم کی شہوت انگیز باتیں ہوتی ہیں۔ بلکہ بسا اوقات وہ نگراں کی موجودگی میں بھی مترنم کے انداز باتیں کر لیتی ہیں۔ الغرض ان کارخانوں میں ہر وقت ایک پر ہیجان فضا طاری رہتی ہے جس سے متاثر ہو کر اکثر لڑکیاں "خیالی استلذاذ" (Psychic Onanism) کرتی رہتی ہیں یا بعض اوقات کسی اور طریقہ سے عملاً استلذاذ کر لیتی ہیں۔

موسم گرما میں صورت حالات اور زیادہ موافق ہو جاتی ہے کیونکہ کمروں کے اندر لڑکیاں زیر جامہ نہیں پہنتیں بلکہ اکثر اپنے شلوکوں کے بٹن بھی کھول دیتی ہیں، ران پر ران رکھ کر کام کرتی ہیں جس سے ان کا بدن کم و بیش عریاں ہو جاتا ہے ایسی حالت میں اکثر لڑکیاں قریب کھسک کر ایک دوسرے کو عریاں دیکھتی ہیں، بعض اٹھی گدرائی رانوں کی تعریف کرتی ہیں، بعض کو اپنے سڈول سرینوں پر ناز ہوتا ہے اور اس مشغلہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ دوپہر سے دو بجے دن تک جبکہ سخت گرمی ہوتی ہے یہ

منظر اور بھی زیادہ ہیجان انگیز ہو جاتا ہے۔ اُس وقت کارخانہ کی مالکہ
تو اپنے کمرے میں جا کر سو جاتی ہے، میدان خالی ہوتا ہے اور تمام
لڑکیاں بلا استثنار استلذاذ غیر فطری میں مشغول ہو جاتی ہیں۔"(۱)

مندرجہ بالا واقعات کا تعلق چونکہ نوعمر لڑکیوں سے ہے اس لیے ممکن ہے
ان کے شغل کو "بچیوں کا کھیل" خیال کیا جائے لیکن بڑی عمر کی عورتوں میں تو اس
قسم کے واقعات دیکھے گئے ہیں جن کی نوبت جبر تک پہنچتی ہے۔ ہسپانیہ کے
سگار سازی کے کارخانوں میں بھی عورتوں کے اندر یہ شوق دیکھا گیا ہے۔ فصل
گرما میں یہ تقریباً عریاں ہو کر کام کرتی ہیں اور اس لیے جب کارخانہ کے اندر کوئی
غیر شخص آتا ہے تو اطلاع کے لیے پہلے سے گھنٹی بجا دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا اپنا
لباس پہن لیں۔

اشبیلیہ کے ایک ایسے ہی کارخانہ کا مندرجۂ ذیل واقعہ قابل غور ہے جس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی عورتوں میں رشک و حسد کے جذبات بھی نہایت
سختی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں :-

"ایک صبح جب کارخانہ میں داخل ہو کر کاریگر عورتیں اپنا صاف ستھرا
لباس اُتار کر کام کرنے کے کپڑے پہن رہی تھیں، ایک عورت نے اپنی شال
کے نیچے سے چھرا نکال کر دوسری عورت پر ایک حملہ کیا اور اُس کے چہرہ و
گردن پر جلد جلد چھ سات زخم لگائے اور دھمکی دی کہ اگر کسی نے دخل دیا تو

(۱) Nice Toro Il-Lenzo Cap. VI 1897
Turan.

وہ اُسے بھی قتل کر ڈالے گی۔ یہ دونوں عورتیں اُسی کارخانہ میں عرصہ سے کام کیا کرتی تھیں اور اشتانیوں میں داخل تھیں، ایک کی عمر ۴۲ سال تھی، جس میں کسی قدر مردانہ پن تھا اور دوسری کی عمر ۳۰ سال تھی جس میں نسوانی خصوصیات کا غلبہ تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں عورتیں آپس میں ناجائز تعلق رکھتی تھیں لیکن چند روز سے کم عمر عورت کسی اور عورت سے "ملنے" لگی تھی۔ اس سے پہلی عورت کے دل میں جذبات رشک و حسد بھڑک اُٹھے اور اس نے دونوں کو قتل کر ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔"

تھیٹروں میں بھی عورتوں کا عموماً یہی حال دیکھا گیا ہے کیونکہ ایکٹرسوں کو بار بار برہنہ ہو کر لباس بدلنا پڑتا ہے اور بعض اوقات کسی خاص پارٹ کے لیے علیحدہ کمرے میں کئی کئی بیکار رہنا پڑتا ہے۔ ان باتوں سے ایکٹرسوں کی طبیعت استلذاذ بالمثل کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔

سن شعور تک پہنچنے سے پہلے ہی اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بھی اس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ بورڈنگ ہاؤس میں جب دو لڑکیاں ایک کمرہ میں رہتی ہیں تو دونوں میں عموماً الفت پیدا ہو جاتی ہے اور یہیں سے استلذاذ بالمثل کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب (Sexual Inversion) میں ایک عورت کی تحریر درج کی ہے جس میں اس نے ظاہر کیا ہے کہ:۔

"اسکولوں کی اکثر لڑکیوں کی طرح مجھے بھی دیر کی ایک لڑکی نے اس طرف راغب کیا اور پھر میں نے دیگر لڑکیوں کو اس کا عادی بنایا۔"

لڑکیوں میں اس کا شوق پیدا ہونے کے اسباب عموماً حسب ذیل ہوتے ہیں:۔

(۱) لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت آزادی سے رل مل سکتی ہیں، اور لڑکے ایسا نہیں کر سکتے۔

(۲) لڑکیوں میں محبت اور خلوص کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔

(۳) معاشرتی رواج کے موافق کوئی لڑکی کسی جوان مرد سے مخفی یا نطیع ہو کر نہیں مل سکتی لیکن جوان لڑکیاں آپس میں رل مل سکتی ہیں۔

(۴) دو جوان لڑکیوں کا آپس میں بے تکلف ہو کر ملنا برا نہیں سمجھا جاتا۔

اس امر کی شائق عورتوں میں کسی قدر مردانگی پائی جاتی ہے اور وہ اکثر لباس مردانہ کر لیتی ہیں۔ بعض مثالیں اس قسم کی ہم پیش کر چکے ہیں بعض اور دلچسپ تاریخی واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

پادری جوزف لابڈیل (Lobdelli) جس کا اصلی نام لیوسی تھا۔ عورت ہی تھی لیکن مردانہ لباس میں رہتی تھی جوانی میں ایک مرد سے شادی کی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا لیکن شوہر سے موافقت نہ ہوئی اور وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بالآخر لیوسی نے مردانہ لباس اختیار کیا اور اپنا نام پادری لابڈیل رکھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کی نادر انداز تھی۔ رائفل سے بال باندھا نشانہ مارتی تھی بسر اوقات کے لئے اس نے شکاری کا پیشہ اختیار کر لیا اور امریکہ کے اصلی باشندوں میں لانگ ایڈی (Longeddy) شکاری عورت (Female Hunter of) کے نام سے مشہور ہوئی۔ فن شکار پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔ اس اثنا میں وہ ایک نوجوان تعلیم یافتہ عورت پر

واقف ہو گئی۔ اس عورت کا ناؤ ند بھی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بالآخر دونوں نے "شادی" کر لی۔ لیکن چند روز بعد جانڈ ا بعوث گیا اور حکومت نے یوسمی کو بعلت آوارہ گردی قید کر دیا۔ لیکن جب دوسری عورت نے حقیقی حالات بتا دیئے کر نامومست کا ناک میں دم کر دیا تو اس کو چھوڑ دیا گیا۔

اس سے بھی زیادہ پر لطف ایک اور واقعہ ہے جو مجلہ "دی لینسٹ" (Lancet) بابت ماہ فروری ۱۸۸۴ء میں درج ہے:-

"ستند رگاہ بلفاسٹ میں ایک مزدور جان کولٹر (John Coulter) بارہ سال سے ملازم تھا۔ ایک روز وہ اتفاقاً زینہ سے گر کر مر گیا۔ معائنہ کے وقت یہ راز کھلا کہ متوفی جس کی عمر اس وقت پچاس برس کی تھی۔ درحقیقت عورت تھا۔ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بحیثیت مرد بسر کیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور اوضاع و اطوار بالکل مردانہ تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ "جوان" تھا تو ایک کسان کے یہاں مزدور کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے مالک کی لڑکی سے باقاعدہ "شادی" کر لی تھی۔ دونوں "میاں بیوی" انتیس ۲۹ برس تک اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ پچھلے چھ سال سے دونوں میں علیحدگی ہو گئی تھی جس کا باعث اس کی کثرت شراب خواری تھی۔"

ذیل کا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے جو ویکلی اسکاٹس مین (Weekly Scotsman) بابت فروری ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا:-

"میری اینڈرسن (Mary Anderson) عرف

"مرے ہال" (Murry Hall) جس کا سنہ ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ اسکاٹ لینڈ میں بمقام گوران (Govan) پیدا ہوئی اوائل عمر ہی میں یتیم ہو گئی اور جب اس کا بھائی بھی مر گیا تو وہ اس کے کپڑے پہن کر بحیثیت مرد وہاں ادنبرا چلی گئی لیکن ایک مرتبہ جب وہ بیمار ہوئی تو اس کا راز فاش ہو گیا۔ اسکاٹ لینڈ سے بھاگ کر امریکہ پہنچی جہاں وہ مردانہ لباس و مشاغل میں تیس برس تک زندہ رہی۔ اور اسی دوران میں اس نے کافی دولت جمع کر لی وہ اکثر سیاسیات میں بھی حصہ لیتی تھی اور بزم ہائے نشاط میں بھی شرکت کرتی تھی وہ شراب خوب پیتی، اور شراب پی کر خوب فحش گیت گاتی تھی، مردوں کی طرح گھونسہ بازی بھی کرتی تھی اس نے دو مرتبہ "شادی" کی۔ پہلی شادی کے بعد "خلع" ہو گیا۔ لیکن دوسری بیوی بیس برس تک زندہ رہی۔ اس کے علاوہ وہ دوسری نوجوان لڑکیوں سے اختلاط کرتی رہتی تھی۔ مرنے کے بعد اس کی جنسیت کا راز فاش ہوا۔

ایک اور واقعہ جو لندن کے اخبارات میں شائع ہوا تھا کیتھرائن کوم (Catherine Coome) کا ہے جو چالیس برس تک کامیابی کے ساتھ مرد بنی رہی۔ اس نے مردوں کی تمام باتیں اختیار کر لی تھیں حتیٰ کہ اس نے ایک اور عورت سے "شادی" بھی کر لی تھی۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں تختۂ جہاز پر ایک عورت مس کیرولائن ہال (Caroline Hall) ساکن بوسٹن کی موت واقع ہوئی جو عرصہ تک شہر میلان میں مصوری کرتی رہی تھی۔ یہ عورت مردانہ لباس پہنتی تھی اور ایک اطالوی لیڈی کے "شوہر"

کی حیثیت سے رہتی تھی۔ وہ اپنا نام ہمیشہ "مسٹر ہال" بتاتی تھی اس کے اوضاع و اطوار تمام مردانہ تھے۔ وہ دراصل بے نہایت اچھا نشانہ لگاتی تھی اور تمام مردانہ کھیلوں میں شرکت کرتی تھی۔ مرض دق میں مبتلا ہو کر فوت ہوئی۔

سب سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ شہر اشبیلیہ کے ایک پولیس مین کا ہے جو تیس برس تک حاکم شہر کا اردلی رہا۔ ایک اتفاقی حادثہ میں مضروب ہو کر وہ ہسپتال پہنچا جہاں یہ راز فاش ہوا کہ زخمی پولیس مین مرد نہیں بلکہ ایک سن رسیدہ عورت ہے اس نے اپنا نام فرنینڈو میکنزی (Fernando Machenies) رکھا تھا اور اگرچہ اس نے عرصۂ دراز تک پولیس کی ملازمت کی لیکن اس کا راز کسی طرح فاش نہ ہو سکا۔ یہ عورت ۱۸۳۶ء میں بمقام پیرس پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ انگریز اور ماں ہسپانوی تھی، اس نے اوائل عمر ہی سے مردانہ لباس اختیار کر لیا تھا اور فرانسیسی فوج میں بطور سپاہی ملازم ہو گئی تھی، مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد وہ ۳۵ سال کی عمر میں ہسپانیہ میں آ کر رہنے لگی اور یہاں بھی اس نے جوڑ توڑ لگا کر محکمۂ پولیس میں نوکری کر لی۔ میڈرڈ میں اس نے ایک عورت سے "شادی" کر لی۔ اس عورت کے پہلے خاوند سے ایک لڑکا بھی تھا، جسے وہ ہمیشہ اپنا لڑکا بتایا کرتی تھی۔ میڈرڈ سے وہ اشبیلیہ تبدیل ہوئی، یہاں وہ شہر کے گورنر کی خدمت میں بحیثیت باورچی اور اردلی تعینات کی گئی۔ اسی طرح وہ یکے بعد دیگرے سات گورنروں کی ماتحتی میں رہی لیکن جب اس کا راز فاش ہو گیا تو اسے ملازمت سے بغیر پنشن کے علیحدہ کر دیا گیا۔ دو سال پیشتر اس کی "بیوی" کا انتقال ہو چکا تھا جس کا جنازہ اس نے بہت دھوم دھام سے اٹھایا تھا۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں بمقام ٹنگ کو، روسی قونصل کے متعمد خصوصی نکولس ڈی ریلان (Nicholas-De Raylon) کا بعمر ۲۳ سال انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کے وقت معلوم ہوا کہ وہ دراصل "عورت تھے"۔ وہ ہمیشہ مردانہ لباس پہنتی تھی۔ امریکہ میں اس نے دو مرتبہ شادی کی لیکن پہلی "بیوی" نے دس برس کے بعد طلاق لے لی اور شکایت یہ کی کہ اس کا "شوہر" ظلم کرتا ہے اور تھیٹر کی ایکٹرسوں کی صحبت میں رہتا ہے۔ بعدازاں اس نے ایک دوسری عورت سے جو تھیٹر میں ناچتی بھی گاتی بھی تھی۔ یہ عورت اپنے "شوہر" کی بڑی وفادار و خدمت گزار تھی۔ دونوں بیویوں کو کامل یقین تھا کہ اُن کا "شوہر" مرد کامل ہے۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں بمقام سینٹ لوئی (   ) ایک بائیس سالہ نوجوان عورت کا راز فاش ہوا۔ جو نو سال تک مرد بنی رہی تھی۔ اس نے مردانہ بھیس میں مختلف جگہ محنت مزدوری کی، اصطبلوں میں سائیسی کی اور لوہار کے ہاں گھن چلایا۔ ایک مرتبہ اسے ایک آدمی نے بہنیلی کر لیا جس کی چند لڑکیاں بھی تھیں اُس نے اُن لڑکیوں کو بھی دھوکا دیا، اور خود کو مرد بتایا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ بمقام سینٹ لوئی، آئی اور ایک کارخانہ میں بید کی کرسیاں اور ٹوکریاں وغیرہ بنانے لگی۔ تمام کاریگروں سے مردوں کی طرح بدرجۂ مساوات ملتی تھی۔ ایک خصوصیت اس میں اور بھی تھی یعنی وہ ہمیشہ مشکل کام کو پسند کرتی تھی اور سخت سے سخت محنت سے نہیں گھبراتی تھی۔ وہ مردوں کی طرح شراب پیتی، مردوں کی طرح گالی بکتی، لڑکیوں سے محبت کرتی، شکار کھیلتی، مچھلیاں پکڑتی اور جب کبھی کوئی جھگڑا ہو جاتا تو آستینیں چڑھا کر لڑنے کو تیار ہو جاتی۔ اس کا جسم ورزشی

ہو گیا تھا، فٹ بال وہ کھیلتی تھی، کرکٹ وہ کھیلتی تھی، اکھاڑہ میں کشتیاں وہ لڑتی تھی اور اچھے اچھے طاقتور پٹھوں کو پچھاڑ دیتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں بمقام لندن ایک ۲۳ سالہ مادسہ ایکٹن (Acton) کی عدالت فوجداری میں پیش ہوئی۔ وہ ہمیشہ مردانہ لباس میں رہتی تھی، اور ایک دوسری خوبصورت عورت کے ساتھ جو اس سے کمسن تھی بحیثیت شوہر کے رہتی تھی لیکن عدالت نے دونوں عورتوں کو اُن کے اعزہ کے سپرد کر دیا۔ بلکہ اُن کے لیے نوکری کی بھی فکر کر دی اور چونکہ ان دونوں میں اس قدر محبت تھی کہ وہ ہرگز جدا نہ رہ سکتی تھیں، اس لئے مجبوراً دونوں کو ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔

ایسی ہی ایک اور عورت کورا اینڈرسن (Cora Andarson) تھی۔ یہ عورت تیرہ برس تک مرد بنی رہی اور دو عورتوں کو بیوی کی حیثیت سے اپنے پاس رکھا۔

جزیرہ نمائے بلقان کی جنوبی سلانی قوم کی عورتوں میں استلذاذ بالمثل کا طریقہ سحق کے طور پر رائج ہے۔ لیکن سب سے زیادہ عام طریقہ وہ ہے جس میں ایک مصنوعی آلہ یا "معبودہ" سے کام لیا جاتا ہے۔ مصنوعی آلہ کے استعمال کا طریقہ قدیم یونان میں بھی رائج تھا جیسا کہ ہیروندس (Harondas) نے بیان کیا ہے اور سوئداس (Siadas) کا قول ہے کہ اس کی ایجاد ملیٹوس (Miletus) کی عورتوں نے کی تھی اور ارسطوفانیس (Aristo Phanis) نے اپنی کتاب لائسسٹریٹا (Lysistrata) میں

لکھا ہے کہ مصنوعی آلہ بنانے کی خاص جگہ تھیبوٹس تھی۔ یورپ میں بزمانۂ قرون وسطیٰ بھی اس کا رواج موجود تھا چنانچہ بارھویں صدی میں شہر وارمس کے اسقف برچارڈ (Burchards) نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح اٹھارویں صدی کے اوائل میں مارگریطہ لنکن (Margharetha Lincelu) نے جرمنی میں اس کی مدد سے ایک عورت کے ساتھ شادی کی تھی۔

سولھویں صدی میں فرانس کے اندر بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہوا تھا۔ مقام شامول (Shammoul) کی چھ سات لڑکیوں نے یہ ارادہ کیا کہ مردوں کا لباس پہنیں اور مردوں جیسے کام کریں۔ ان میں سے ایک لڑکی مقام وتری (Vitry) پہنچی اور ایک لڑکی پر عاشق ہو کر اس سے شادی کر لی۔ لیکن بدقسمتی سے شال کے ایک شخص نے اسے پہچان کر راز فاش کر دیا۔ پکڑی گئی، مقدمہ چلایا گیا اور عدالت نے پھانسی کی سزا دے دی۔ (۱)

---

(1) Moitaigues Journal Due Voyageen — Italian 1850.

استلزاذ بالوحوش
(ZOROASTRA)

استلزاذ بالوحوش کے متعلق سب سے پہلا تاریخی ثبوت مشہور و معروف یونانی مورخ و سیاح ہیرو دوطوس (Herodotus) کا بیان ہے جس نے منڈیس (Mendes) کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"یہاں ایک مقدس بکرا ہے جس کی لوگ بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مقدس بکرا در حقیقت پان دیوتا (Pan) کا اوتار ہے اور لطف یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں اولاد حاصل کرنے کی خواہش میں اس کی مدد حاصل کرتی ہیں۔" (۱)

اسی طرح مصر قدیم کی عورتوں کے متعلق دولار (Dulare) نے لکھا ہے:- (۲)

شت پتھ برہمن میں جس کا ترجمہ انگریزی "کتب مقدسہ مشرقیہ" کی ریاز دہم صفحہ ۳۲۵ پر موجود ہے اور جس کا اقتباس بھی میکڈانلڈ ایم اے

(1) Herodotus, Book II, Chapter, 46.
(2) Dulare (Des Divinities General Rices, Chapter II)

ڈی۔ ڈی نے اپنی کتاب الموسوم بہ "ویدوں کے برہمن" صفحہ ۱۷ پر دیا ہے حسب ذیل روایت لکھی ہے:۔

"پہلے پرجاپتی اکیلا ہی تھا۔ اس نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے۔ چنانچہ اس نے اگنی، وایو، آدیتہ وغیرہ دیوتاؤں کو پیدا کیا۔ بعد ازاں اس نے اپنے منہ کی پھونک سے گائے کو پیدا کیا، اگنی دیوتا نے جب گائے کو دیکھا تو اس کا دل للچایا اور اس نے چاہا کہ میں اس گائے کے ساتھ التفات کروں۔ چنانچہ وہ ایسا کر گزرا۔"

سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں صفحہ ۳۲۴ پر تحریر فرمایا ہے:۔

"سنتے ہیں کہ اس ملک میں گوردھن پور کا ایک راجہ تھا۔ پوپوں نے یگیہ کرایا اور اس کی پیاری رانی کا سنگم گھوڑے کے ساتھ کرایا جس سے وہ مرگئی۔"

قدیم خرافیات یونان میں بھی اس قسم کی اکثر روایات موجود ہیں۔ جن میں کسی دیوی یا دیوتا کا بہ صورت انسان جانوروں سے حظ حاصل کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں آؤر ( ) کے اور سانڈ بیل اور لیڈا (Leda) اور ہنس کی روایات زیادہ مشہور ہیں۔

بائبل مقدس کے مطالعہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اب سے چار پانچ ہزار برس پیشتر ملک فلسطین اور قریب کے ممالک میں بھی استلذاذ بالوحوش کا شوق لوگوں میں موجود تھا۔ چنانچہ توریت میں ایسے شخص کے لیے حسب ذیل سزا مقرر ہے:۔

جو کوئی چار پایہ کے ساتھ لیٹے گا وہ جان سے مارا جائے گا۔ (خروج باب ۲۲ آیت ۱۹)

اگر کوئی مرد کسی چوپایہ سے شہوانی لطف حاصل کرے گا وہ جان سے مارا جائے گا

اور جانور بھی ہلاک کیا جائے گا (Leviticus باب ۲۰ آیت ۱۵)

سیاحوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں قدیم باشندوں کے اندر اس کا شوق موجود تھا، متمدن دنیا میں یہ شوق عموماً دیہاتوں میں پایا جاتا ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں:-

(۱) حیاتِ انسانی کے متعلق قدیم خیالات جن میں انسان اور حیوان کے اندر کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

(۲) دیہاتیوں اور اُن کے جانوروں کا ہر وقت ساتھ رہنا۔

(۳) عورت کا میسر نہ آنا۔

(۴) بعض قدیم روایات جن کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بعض بیماریاں کو شفا ہوتی ہے۔

بعض قدیم اور پست قوموں کا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد بعض آدمی جانور اور بعض جانور آدمی بن جاتے ہیں۔ لہٰذا انسان اور جانوروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اسی لیے جانوروں سے استلذاذ کوئی ذلت اور شرم کی بات نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جانور درحقیقت آدمی ہی ہوتے ہیں صرف "چولا" بدلا ہوا ہے۔ مذہبی کھیلوں تماشوں اور لیلاؤں میں بعض جانوروں کا روپ اسی خیال سے اختیار کیا جاتا ہے۔

مختلف ممالک میں مختلف زمانوں کے اندر مختلف جانوروں کا ذکر پایا

جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر انھیں جانوروں کا نام آتا ہے جو گھروں میں پالے جاتے ہیں۔ مثلاً گائے، گھوڑی، بھینس، بھیڑ، بکری، گدھی وغیرہ۔ بعض حالات میں کتّوں، بلیوں، خرگوشوں، بطخوں اور راج ہنسوں کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ قدیم رومی عورتوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات اس کام کے لیے سانپ پالتی تھیں، اسی سلسلہ میں ریچھوں، بندروں، حتّی کہ مگرمچھوں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کوچر (Kocher) کا بیان ہے کہ عرب میں بھیڑوں، بکریوں، اور گھوڑیوں سے استلذاذ کا رواج پایا جاتا ہے اور فرانسیسی ڈاکٹر مونڈیری (Mondiere) کا بیان ہے کہ انام میں شوربیا اور کتوں سے کام لیا جاتا ہے اور جزیرہ سیلون کی سنگھالی قوم میں بکریوں اور گائے سے۔

اس سلسلہ میں مسٹر ہاورڈ، ڈاکٹر جی۔ ایف۔ لڈسٹن، ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ اور ڈاکٹر مول نے عجیب عجیب واقعات درج کیے ہیں جن کا ذکر کرنا اس جگہ ہم مناسب نہیں سمجھتے۔

دیہاتیوں میں استلذاذ بالوحوش کا شوق محض اس سبب سے نہیں ہے کہ ان کی طبیعت میں نفاست نہیں ہوتی یا انھیں عورتیں میسر نہیں آتیں بلکہ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ہر وقت جانوروں میں رہتے ہیں اور خود بھی رفتہ رفتہ حیوان بن جاتے ہیں۔

مرابو (Mirabeau) نے قوم باسق (Basque) کے پادریوں سے اٹھارویں صدی میں معلوم کیا تھا کہ کوہستان پیری نیز کے تمام

گڈریے اپنی بھیڑ، بکریوں سے لذت اندوز ہوتے تھے۔ یہی حالت اطالیہ میں بھی ہے۔ جنوبی اطالیہ اور جزیرہ صقلیہ (Sicily) کے چرواہوں گڈریوں اور کسانوں کے یہاں تو یہ شغل ایک قومی رواج یا دستور بن گیا ہے۔ شمالی یورپ میں بجائے بھیڑ، بکری اور گائے وغیرہ کے ہرنی کام دیتی ہے۔

مانٹی گازہ (Mante Gazza) نے اپنی کتاب (Gli Amoridegli Uomini) کے باب پنجم میں لکھا ہے کہ:-

"مقام ریمنی (Rimini) میں ان کی ملاقات کوہستان پری نیز کے ایک گڈریے سے ہوئی جو بری طرح ضعفِ اعصاب میں مبتلا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس تکلیف کا باعث صرف یہی شوق تھا۔"

گشیٹ (Gutlcaet) نے کتاب ("Dreissigg Ahuparseis") کے صفحہ ۱۰۳ پر لکھا ہے کہ:-

"بعض روسی افسروں نے جو ۱۸۲۸ء کی جنگ روم و روس میں شریک تھے اپنے اس ذوق کا اعتراف کیا۔ پھر جس طرح بعض مردوں میں یہ ذوق پایا جاتا ہے اسی طرح عورتیں بھی اس میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔"

چنانچہ ڈاکٹر بلاخ نے لکھا ہے کہ بعض قحبہ خانوں میں پیشہ ور عورتیں اس قسم کے تماشے لوگوں کو دکھاتی ہیں۔ ماسچکا (Maschaka) نے بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے پیرس میں ایک عورت کو دیکھا تھا جو لوگوں سے فیس لے کر یہ تماشہ دکھایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر روشہ (Rossa) نے واشنگٹن کی ایک نا کتخدا جوان عورت کا حال بیان کیا ہے جو اس شوق کی بدولت آخر مر گئی۔

ان ہی ڈاکٹر روشہ (Rossa) نے ورجینا میڈیکل منتھلی (Virgina Medical Monthly) بابتہ ماہ اکتوبر ۱۸۸۲ء کے صفحہ ۳۴۹ پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ یورپ میں ایک عورت اس طرح تماشا دکھایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر کراؤس (Kreusao) نے لکھا ہے کہ:-

"ملک بوسنہ (Bosnia) کی عورتوں میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے اور اگر وہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتے تو انھیں ہرگز یقین نہ آتا۔"

شکاگو کے ڈاکٹر کیرنان (Keirnan) نے بھی اپنے ایک پرائیویٹ خط میں ڈاکٹر روشہ کے بیانات کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ:-

"جو حالت ڈاکٹر روشہ نے سان فرانسسکو کی لکھی ہے وہ قریب قریب ہر بڑے شہر میں پائی جاتی ہے۔"

مسوری (Missouri) واقع امریکہ میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان لڑکی علاج کے لیے آئی اور جب اس کے جسم کو چکاپندی لگا کر دھو یا گیا تو معلوم ہوا کہ اندر تین جگہ زخم ہیں جو اس شوق کی بدولت پیدا ہو گئے تھے۔

ملک برازیل میں دریائے ریو امیزان کے قریب کیسٹل نو (Castel nau) سیاح نے ایک عورت کے دروازے پر بہت بڑا بندر بندھا دیکھا سیاح مذکور کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے خرید لینا چاہا۔ چنانچہ اس کے

متعلق سیاح نے ایک دوسری عورت سے جو وہاں موجود تھی بہت بڑی رقم کے بالعوض سودا کرنا چاہا۔ یہ سن کر وہ عورت ہنسی اور کہا کہ:-

"آپ کی کوشش فضول ہے کیونکہ یہ بندر اس عورت کا شوہر ہے"

علاوہ ازیں بعض لوگوں میں استلذاذ کی عجیب و غریب عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ مثلاً بعض کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ جانوروں کی خوش فعلیوں اور مستیوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ استمنا بالید پر مجبور ہو جاتے ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں جنہیں جانوروں کا جسم چھیڑنے میں لطف آتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب "اروٹک سمبلزم" (Erotic Symbolism) میں اسی قسم کے چند واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ اس کو کسی پادری نے لکھ کر بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"آئرلینڈ میں میرے والد کا مکان وہاں کے پادری کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں میری عمر بیس سال کی تھی اور میری طبیعت پر ہر وقت مذہب کا رعب غالب تھا۔ پادری کی دو بیٹیاں تھیں اور دونوں لڑکیوں کی پرورش نہایت سخت مذہبی فضا میں ہوئی تھی اور دونوں مکانوں کے اصطبل ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے لیکن درمیان میں ایک دروازہ تھا جس میں تختے جڑ دیے گئے تھے۔ ایک رات مجھے باغبانی کا ایک اوزار لانے کے لیے اصطبل میں جانے کی ضرورت پڑی۔ میں نے پادری صاحب کے اصطبل کا دروازہ کھلا پایا اور درمیانی تختوں کی درازوں سے روشنی نظر آئی۔ میں حیران ہوا کہ اس وقت اصطبل میں کون

شخص آیا ہے۔ لہٰذا میں نے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پادری صاحب کی ایک صاحبزادی گھوڑی کے تسم کو چھو رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی داہنی آستین چڑھائی اور کہنی تک اپنا ہاتھ آلودہ کر لیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی کو اپنی اس عجیب و غریب حرکت سے بے حد لطف آرہا ہے اور فرطِ لذت سے بار بار اپنے ہونٹ چباتی ہے۔ لڑکی کا یہ واقعہ دیکھ کر مجھے بھی اس کا شوق پیدا ہوا اور میں نے بھی بارہا یہ عمل کیا۔"

ڈاکٹر نیک (Naick) نے بھی (Psychiatrischeen Neurologisch Bladen" ۲ مطبوعہ سنہ ۱۸۹۹ء میں ایسے ہی ایک شخص کا حال لکھا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر گلیرو (Gyuillereau) نے (Journal De Medicine Velernaired De Zoo Jeahnie) بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۸۹۹ء میں ایک لڑکے کا حال لکھا ہے جو یہی عمل گایوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

اُبرے (Aubray) نے لکھا ہے کہ مسٹر فلپ سدفی کی بہن کاؤنٹس پمبروک نے لذت اندوزی کا عجیب طریقہ نکالا تھا۔ یہ عورت حد درجہ کی شہوت پرست تھی اور دریچہ میں بیٹھ کر گھوڑوں کی مستی کا تماشہ دیکھا کرتی تھی۔

اسی طرح برچارڈ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ پوپ الگزینڈر ششم اور ان کی صاحبزادی لکریزیا (Lucrezia) دونوں اس قسم کے تماشے دیکھا کرتے تھے۔

بلرو ڈ اور مرسیر (Balllrud & Mercier) نے ایک مضمون بعنوان (Perversion De Instined Genisique) مجلہ

"صحت عامہ" (Annalesd Hygiene Publique) بابتہ ماہ جون ۱۹۰۳ء میں ایک نوجوان شخص کا حال لکھا ہے جو گورکن تھا۔ یہ اس بات کا عادی تھا کہ جوان لڑکیوں اور عورتوں کی لاش نکال کر اُن سے آلودہ ہوتا تھا۔

استلذاذ بالوحوش کا فعل دنیا کی مہذب سوسائٹی میں ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک میں اس کے لیے سزا مقرر رہی ہے بعض اوقات تو صرف سزائے جرمانہ دے کر مجرم چھوڑ دیا گیا اور بعض اوقات مجرم اور جانور دونوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ قرونِ وسطیٰ میں بھی یورپ کے اندر یہ شوق بکثرت پایا جاتا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی کے مسیحی مبلغین اور واعظین اپنے خطبات میں ہمیشہ اس فعل مکروہ کی بُرائیوں پر زور دیتے تھے۔ دین مسیحی کی کتاب الکفارہ میں اس کے لیے تعزیرات موجود ہیں۔

کتاب الکفارہ ایگبرٹ (Egbert's Penistentials) میں جو نویں و دسویں صدی کی چیز ہے۔ استلذاذ بالوحوش کے لیے دو سال سے لیکر دس سال تک کی سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔

اسی زمانہ کی ایک اور کتاب الکفارہ تھیوڈور میں ایسے لوگوں کے لیے دس برس کی سزا مقرر تھی۔

"پینی ٹینشل سوڈو رومانم" (Penitentiale Pseudo Romanum) کی رو سے ایک سال کی سزا معقول خیال کی گئی تھی اور اگر ملزم کے بیوی نہ ہوتی تھی تو رحم کھا کر اس کی سزا نصف کر دی جاتی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اتنی ہی سزا کسی بیوہ عورت یا دوشیزہ سے ملتفت ہونے پر بھی دی جاتی تھی، گویا!

ان کے نزدیک دوشیزہ، بیوہ اور جانور ایک ہی حیثیت رکھتے تھے۔

اسی طرح فلبرٹ (Fullbert) کی کتاب الکفارہ میں استلذاذ بالوحوش کے لیے دس سال کی سزا مقرر تھی۔

قرون وسطیٰ کے یورپ خصوصاً فرانس میں اس کے لیے وہی سزا مقرر تھی جو شریعت موسوی میں تجویز کی گئی تھی یعنی دونوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا چنانچہ شہر طولوز (Toulouse) میں ایک عورت اور کتا دونوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

علاوہ ازیں قرون وسطیٰ میں جب پادری لوگ اپنے معتقدین سے ہفتہ کے روز اقرار معصیت لینے بیٹھتے تھے تو تمام یورپ خصوصاً جنوبی اطالیہ، فرانس اور جرمنی میں کسانوں اور مویشی پالنے والوں سے یہ بات خصوصیت کے ساتھ دریافت کی جاتی تھی کہ وہ اس ہفتہ میں اپنی گائے، گھوڑی، بھیڑ، بکری، گدھی اور سور یا سے تو آلودہ نہیں ہوئے۔ کیتھولک ممالک میں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے۔

استلذاذ بالنفس

Auto-Erotism

استلذاذ بالنفس جانوروں میں کہتے ہیں کہ استلذاذ بالنفس کا طریقہ بھی انسان نے جانوروں ہی سے سیکھا ہے۔ جانوروں میں خصوصاً بحالت اسیری جبکہ انھیں خواہش نفسانی پوری کرنے کے لیے مادہ نہیں ملتی تو استلذاذ بالنفس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب "ماڈسٹی و آٹو اروٹزم" وغیرہ (Modesty Auto-Erotismetc) میں لکھا ہے کہ ملک ویلز کے ٹٹو ایسی حالت میں اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سخت ہیجان کا اظہار کرتے ہیں۔

مخصوص موسم میں بارہ سنگھے بھی مستی کے عالم میں اپنا بدن کسی چکنے درخت سے رگڑنے لگتے ہیں، اسی طرح بھیڑیں اور اونٹنیاں بھی اپنا بدن رگڑ رگڑ کر لذت حاصل کرتی ہیں۔ ہاتھی کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ مست ہوتا ہے تو وہ اپنی پچھلی ٹانگیں سکوڑ کر اپنی بے تابی کا اظہار کرتا ہے۔ یہی مشاہدہ بلومنباخ (Blue Menbatch) کا ریچھ کے متعلق بھی ہے اور بلاش و بارٹن نے بجو ولی کو بھی اسی عالم میں دیکھا ہے اور بندر خصوصیت کے ساتھ اس میں مبتلا پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مول (Moll) نے اپنی کتاب "Libiclis Sexualis" میں لکھا ہے کہ بعض طوطے جب قفس میں بند ہوتے ہیں تو وہ اپنے جسم کا پچھلا حصّہ کسی چیز سے رگڑ کر لذّت حاصل کرتے ہیں۔

استلذاذ بالنفس افسانوں میں عالمِ انسانی میں اس کا شوق صرف مہذّب و متمدّن دنیا تک محدود نہیں ہے، بلکہ دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ کسی نہ کسی صورت میں نہ پایا جاتا ہو اور اس کے لیے نہ کوئی اصطلاح مقرر نہ ہو۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں خصوصاً نیوساؤتھ ویلز کے رہنے والوں میں یہ شوق زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر راتھ (Roth) کا بیان ہے کہ شمالی کوئنسلینڈ (North Queen's land) اور دیگر علاقوں کے مرد جبکہ وہ گھر سے دُور ہوتے ہیں ایسا کرنا معیوب نہیں جانتے۔

ڈاکٹر نارتھ کوٹ کا بیان ہے کہ نیوزی لینڈ کی ماوری اور راروٹونگا (Maori & Rarotonga) اقوام میں یہ شوق نہیں ہے بلکہ جزیرۂ کوک (Cook Island) کے باشندے اور دیگر جزائر قرب جوار کی قومیں اس کو "خلاف مردی" سمجھتی ہیں اور ان لوگوں میں اس کے متعلق ایک طنزیہ جملہ بولا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "مرد کا خود کو عورت بنا لینا ہے"

افریقہ کی ہاٹنٹوٹ (Hatentati) نسل کی ناما (Nama) قوم میں نوجوان عورتوں کے اندر یہ شوق اس قدر عام ہے کہ علانیہ اس کو پورا کرتی ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی کہانیوں اور قدیم روایتوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے گویا کہ وہ حوادثِ زندگی کی نہایت معمولی بات ہے۔ یہی حال قوم

بسوتو اور کافرو (Basuto & Kaffiro) کا ہے۔

جب اہل ہسپانیہ جزائر فلپائن کے مقام وزکایا (Vizcaya) میں پہنچے تو انھوں نے وہاں کے تمام مرد و زن میں عام طور پر اس کا رواج دیکھا۔ جزیرہ بالی (Bali) کے متعلق جیکب سیاح نے لکھا ہے کہ اس جزیرہ میں یہ شوق عام ہے۔ ڈاکٹر ایرام (Eram) کا بیان ہے کہ ممالک مشرق کی نوجوان عورتوں میں اس کا شوق دیکھا گیا ہے اور حسب بیان ڈاکٹر سونی (Sonnony) مصر میں تو یہ شوق فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔

ہندوستان قدیم میں بھی اس کے رواج کا پتہ یوں چلتا ہے کہ بعض عمارتوں کی دیواروں پر اُبھری ہوئی تصویریں بنی ہوئی ہیں جن میں عورتیں اور مرد اس شغل میں مصروف نظر آتے ہیں۔

جزیرہ سیلان کی تامل قوم میں بھی یہ شوق بکثرت موجود ہے اور ماچین میں یہ شغل صرف شادی شدہ عورتیں کرتی ہیں۔

لیکن جاپان کی عورتوں نے اس فن کو بدرجۂ کمال پہنچا دیا ہے۔ یہ عورتیں پیتل کی باریک چادر کی دو خالی گیندیں بناتی ہیں۔ جو قد و قامت میں کبوتر کے انڈے کے برابر ہوتی ہیں۔ ایک گیند بالکل خالی رکھی جاتی ہے اور دوسری گیند میں سیسہ کی گولی یا پارہ بھر کر اس کا منہ بند کر دیا جاتا ہے پہلے وہ خالی گیند اندرونِ جسم تک پہنچا دی جاتی ہے پھر وہ پارہ والی گیند داخل کی جاتی ہے اور اس کے بعد ڈاٹ لگا کر رانوں کو حرکت دی جاتی ہے ان دونوں گیندوں کا نام جاپانی اصطلاح میں "رین۔نو۔تامہ" (Rin-No-Tama)

ہے۔ ڈاکٹر جوئسٹ (Joest) کا بیان ہے کہ اگرچہ جاپان کی تمام عورتیں اس آلہ سے آگاہ ہیں لیکن پیشہ ور عورتوں میں خصوصیت کے ساتھ اس کا رواج زیادہ ہے۔ جاپان کی عورتیں ایک اور مصنوعی آلہ بھی استعمال کرتی ہیں جسے ان کی اصطلاح میں "اینگی" (ngi) کہتے ہیں۔

استلذاذ بالنفس کی قدیم تاریخ | بابل و آشوریہ کے قدیم کھنڈروں میں جو سنگین محلات اور مندر دریافت ہوئے ہیں ان پر صبورہ کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اس کا شوق تقریباً پانچ چھ ہزار برس قبل مسیح سے موجود تھا۔

ان مذہبی کتب میں جو الہامی ہونے کی دعویدار ہیں۔ صبورہ کی طرف (مثلاً صحیفہ حزقی ایل) اشارہ کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو صحیفہ مذکور باب ۱۶ آیت ۱۷):-

"نیز تو نے وہ زیور جو میرے دیے ہوئے سونے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے لے لیے اور تو اس سے مردوں کے بت بناتی ہے اور ان سے مباشرت کرتی ہے"

برٹش میوزیم میں ایک قدیم یونانی گلدان موجود ہے جس پر ایک قدیم یونانی کسبی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ عورت اپنے ہاتھ میں صبورہ لیے بیٹھی ہے اسی قسم کا ایک دوسرا قدیمی گلدان ہے جو شہر پومپیائی کے کھنڈروں سے برآمد ہوا تھا۔ یہ گلدان شہر نیپلز کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

یورپ کے اندر قرون وسطیٰ میں یہ شغل عام طور پر پایا جاتا تھا۔ کیونکہ پادری لوگ اس کے خلاف مسلسل وعظ کہا کرتے تھے اور پندرھویں صدی میں تو صبورہ کا ذکر کھلم کھلا اور پوری تفصیل کے ساتھ ہونے لگا تھا۔ سولھویں

صدی میں مشہور ناول نویس فورٹینی (Fortini) نے بھی اپنی کتاب (Novella Die Novizi) میں ——" اس آلہ ابلوزیں" کا ذکر کیا ہے جس کا استعمال زنان کلیسہ کیا کرتی تھیں۔

انگلستان میں بھی بعہد ملکہ الزبیتھ مصنوعی آلات سے کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ مارسٹن (Marsten) نے لکھا ہے کہ کس طرح لیوسیا (Lacea) اپنے شوہر کے نرم و گرم بستر پر ایک ابلوزیں کو ترجیح دیتی تھی۔

اس مصنوعی آلہ کو ہندوستان میں سبورہ کہتے ہیں۔ قدیم یونانی عورتوں میں اس کا نام اولسبوس (Olisbus) تھا۔ لاطینی زبان میں اس کا نام فلس (Phallus) یا فیسینم (Fascinum) ہے۔ فرانسیسی زبان میں اسے گادمیشہ (Godemicha) کہتے ہیں اور جرمنی میں سمتھانسے (Samthanse) اطالوی زبان میں اس کا نام پاشاٹمپو اور ڈیلیٹو (Pashatempa & Diletto) ہے۔ موخر الذکر سے انگریزی اصطلاح ڈلڈو (Dildo) کا ہے۔ مردوں کے لیے جو مصنوعی چیز بنائی جاتی ہے اُسے انگریزی اصطلاح میں مرکن (Merkin) کہتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں بقول دوہرین (Dahrens) جرمنی کی امرازادیوں میں اس کا خاص شوق پایا جاتا تھا اور اسی زمانہ میں انگلستان کے اندر بھی ڈلڈو (Dildo) کا استعمال عام ہو گیا تھا۔ آرچمہولز (Archemholtz) کا بیان ہے کہ اگرچہ اس زمانہ میں پیرس کے اندر

مصنوعی آلات کی فروخت مخفی طور پر ہوتی تھی لیکن لندن میں ایک عورت مسز فلپس اپنی دوکان میں جو بمقام چوک لیسٹر واقع تھی ان کی تجارت کھلم کھلا بہت وسیع پیمانہ پر کیا کرتی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں جان بی (John Bee) نے لکھا ہے کہ انگریزی میں اس کا نام اول اول "دلدول" تھا۔

اٹھارویں صدی میں فرانس میں ایک بہت بڑی آبرو باختہ عورت مادام گوردان (Gourdan) تھی جو ان آلات کی وسیع پیمانہ پر تجارت کرتی تھی۔ اُن دنوں فرانسیسی زبان میں اس کو "کنسولیٹر" (Consola-teurs) یعنی "تسکین دینے والا" کہتے تھے۔ ہندوستان میں غالباً اسی فرانسیسی "کنسولیٹر" کا ترجمہ "صبورہ" کیا ہے۔ ڈاکٹر ڈوہرین (Duhren) نے اسی مادام گوردان کی نسبت تحریر کیا ہے کہ جب یہ عورت مر گئی تو خانقاہوں کی راہبہ عورتوں اور کلیسا کی کنواریوں کے بے شمار خطوط اس کے مکان سے برآمد ہوئے جن میں انھوں نے "صبورے" طلب کیے تھے۔

مسیحی دنیا کی طرح ممالک اسلامیہ میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے اور ترکی عورتیں اس کا استعمال کرتی ہیں۔ ڈاکٹر بامن (Baumann) کا قول ہے کہ زنجبار کی حرم سرائیں میں پردہ نشین عورتیں اس کا استعمال بکثرت کرتی ہیں۔

ڈاکٹر بی راسٹرن (B. Stern) نے اپنی کتاب (Modi Zimin De Turki) میں لکھا ہے کہ ترکی اور مصر کی عورتیں بعض اوقات کیلے اور کھیرے بھی استعمال کرتی ہیں۔ عہد عباسیہ کے تمدن و تہذیب کے متعلق الف لیلہ سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے اس میں "نوادر فرنگی"

کا ایک قصہ سنیے جس کے اندر ایک نظم بھی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ :-

"اے کیلے! ملائم اور چکنی جلد والے کیلے! جسے دیکھ کر جوان عورتوں کی آنکھیں پھیل جاتی ہیں ...... اے کیلے! تمام پھلوں میں تو ہی ایک ایسا پھل ہے جس کا دل نرم اور ہمدرد ہے۔ اے کیلے! تو ہی بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو تسکین دیتا ہے۔"

اسی طرح جزائر ہوائی (Hawaii) کے علم الاصنام میں بعض روایتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بیویوں نے کیلے سے کام لیا۔

صرف کیلے ہی پر منحصر نہیں بلکہ کھیروں، گاجروں، بینگنوں، مولیوں سے بھی کام نکالا گیا ہے اور بعض نے پنسلیں، مہر لگانے کی لاکھ کی بتی، سوت کی ریل، بالوں کی سلائیاں، بُننے کی سلائیاں، بوتلوں کی ڈاٹیں، موم بتیاں وغیرہ بھی استعمال کی ہیں۔

ڈاکٹر میرابو (Merabeau) نے اپنی کتاب اروٹیکا ببلیون (Erotika Biblion) میں ان چیزوں کی بہت بڑی فہرست دی ہے جنہیں کلیسہ کی "اچھوتیاں" استعمال کیا کرتی تھیں۔

سوئٹزرلینڈ کے پروفیسر ریورڈین (Reverden) نے چار عورتوں کا حال بیان کیا ہے جنہوں نے اس کا اقرار کیا۔ ان میں ایک عورت جس کی عمر ۲۷ سال تھی ایک مدرس کی بیوی تھی۔ اس عورت نے بلا پس و پیش اور بغیر شرم و لحاظ کے اپنے شوہر کے بالمواجہہ اقرار کیا کہ وہ بالوں میں لگانے کی سلائی سے عادتاً لطف حاصل کر لیتی تھی، دوسری عورت ۲۴ سال کی ایک مجرد

عورت تھی جو ایک ڈاکٹر کے یہاں ملازم تھی اس کا بھی مشغلہ یہی تھا۔ تیسری عورت ایک ہفتہ ۱۷ سالہ انگریز لڑکی تھی، اور چوتھی ایک دوازدہ ۱۲ سالہ لڑکی جس نے اس کا اعتراف کیا۔

بعض عورتوں کو اس کی ایسی بُری عادت پڑ جاتی ہے کہ بغیر اس کے انھیں تسکین ہی نہیں ہوتی، ڈاکٹر مول (Moll) نے ایک ۲۸ سالہ معمورہ کا حال بیان کیا ہے کہ باوجود صاحب شوہر ہونے کے وہ اس کی عادی تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر ہاورڈ (Howard) نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک عورت کا حال لکھا ہے جو نہایت ہی بے اختیارانہ طور پر اس عمل کو جاری رکھتی تھی۔

بعض اوقات بچوں میں ہیجان شہوانی پیدا کرنے کی عجیب عادت ہوتی ہے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ کرسی کے کنارہ یا کسی فرنیچر سے مس کر کے لطف حاصل کرتی ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ ٹی۔ ماریس (Morris) ساکن نیویارک کا بیان ہے کہ:۔

"میری ایک مریضہ خیالات کے لحاظ سے نہایت مذہبی واقع ہوئی ہے اسے گرجا جانے کا بہت شوق ہے لیکن باایں ہمہ وہ ہر روز صبح کو یہ فعل کرتی ہے اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر۔"

ڈاکٹر گیسٹ (Guttceit) نے روس کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں کی اکثر عورتیں اپنے پیراہن کے اگلے دامن میں گرہ باندھ لیتی ہیں اور اسی سے لطف حاصل کرتی ہیں۔ انہی ڈاکٹر صاحب نے ایک عورت کی نسبت

لکھا ہے کہ وہ اپنے پاؤں کی ایڑی برہنہ کرکے اس پر بیٹھ جاتی ہے۔

بعض لڑکیاں چکر کے جھولے میں لکڑی کے گھوڑوں پر اس شوق کی وجہ سے بیٹھتی ہیں اور بعض کو سائیکل کی سواری بھی یہی لطف دیتی ہے۔

ایک فرانسیسی ڈاکٹر پوئلے (Pouillet) لکھتے ہیں کہ :-

"میں ایک مرتبہ کسی فوجی درزی خانہ میں گیا۔ جہاں تقریباً بیس مشینیں چل رہی تھیں، جن کی آواز تقریباً یکساں تھی لیکن اسی اثناء میں دفعتاً میری توجہ ایک مشین کی طرف ہوئی جو بمقابلہ دیگر مشینوں کے زیادہ تیزی سے چل رہی تھی۔ مشین پر کام کرنے والی سنہرے بالوں والی ایک سرخ و سفید لڑکی تھی جس کی عمر تقریباً اٹھارہ یا بیس برس کی ہوگی۔ عین اسی حالت میں جبکہ وہ مشین پر مسلسل چل رہی تھی، اچانک اس کا چہرہ دمکنے لگا، منہ کا دہانہ کسی قدر کھل گیا، ناک کے نتھنے پھول گئے۔ اور اس کے پاؤں مشین کے پائدان پر تیزی سے چلنے لگے۔ عین اسی حالت میں میں نے اس کی آنکھوں میں کسی قدر تشنج دیکھا، اس کی پلکیں جھلک گئیں، چہرہ اس قدر زرد ہوگیا گویا مردنی چھا گئی ہے اور پیچھے کی طرف کرسی کے تکیہ کا سہارا لے کر لیٹ گئی، اس کے ہاتھوں اور پاؤں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔ اس نے انگڑائی لے کر ٹانگیں پھیلائیں۔ گلے سے خفیف سی آواز اور پھر ایک آہ سرد پیدا ہوئی جو گردونواح کے شور و غل میں گم ہوگئی۔ چند منٹ تک وہ لڑکی بے حس و حرکت رہی۔ پھر اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا، چہرہ کا پسینہ پونچھا اور پھر اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کی طرف کسی قدر شرمائی اور لجائی

ہوئی آنکھ ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔"

ڈاکٹر ویڈلر (Vedler) جنھیں ممالک سویڈن اور ناروے کا بہت بڑا تجربہ ہے بیان کرتے ہیں کہ یہاں کی عورتیں دونوں رانوں کی رگڑ سے پوری کیفیت حاصل کر لیتی ہیں۔

ہیولاک ایلس ایک مرتبہ کا ذکر کرتے ہیں کہ :-

"ایک روز میں کسی اسٹیشن پر ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک وُوڈ کی نشست پر جو بالکل تنہائی میں تھی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ نشست کے سہارے لیٹی ہوئی تھی اور اُس کا ایک پاؤں جلد جلد اور مسلسل طور پر ہل رہا تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک مسلسل یہی حرکت کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس کی اس حرکت میں شدت پیدا ہوئی، اس نے اپنا بدن کسی قدر اور سیدھا کیا اور ٹانگیں کسی قدر اکڑا کر اپنا جسم تپائی کے سرے سے ملا لیا، بعد ازاں دو تین جھٹکے کھائے اور ڈھیلی پڑ گئی۔ چند منٹ بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور خراماں خراماں ویٹنگ روم میں جا کر دیگر مسافروں کے پاس پاس جا بیٹھی۔ اُس وقت اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔"

الغرض اس کا شوق متمدن دنیا میں آج کل اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ غالباً کوئی متنفس اس سے خالی نہ رہا ہوگا۔ جرمنی کے مشہور ڈاکٹر برجر (Bergen) نے اپنی کتاب وورلے سنجن (Vorlesungen) میں تحریر کیا ہے کہ :-

"فی زمانہ ۹۹ فی صدی نوجوان مرد اور لڑکیاں وقتاً فوقتاً استلذاذ بالنفس کر لیا کرتے ہیں۔"

ہرمان کوہن (Herman Cohohun) کا قول ہے کہ اس قول کا ملک جرمنی پر بالکل صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ روہیلڈر (Rohelder) کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ۹۵ فی صدی ہے اور جولین مارکیوز کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ۹۲ فی صدی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ڈیوکس (Dukes) کا قول ہے کہ اسکول کے لڑکوں میں ۹۵ فی صدی تعداد ایسے ہی لڑکوں کی ہے۔ ڈاکٹر موریگلیا (Moraglia) نے اطالیہ میں ۳۰۰ سواد نے طبقہ کی عورتوں کی تحقیقات کی۔ ان میں سے ایک سو بیس عورتوں نے اقرار کیا کہ وہ ایسا کرتی ہیں یا کسی زمانہ میں ایسا کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر ارنسٹ (Ernst) کا قول ہے کہ ملک وینی زویلا (Vene Zuela) کی ہسپانوی نژاد دوغلی آبادی میں ہر طبقہ کے لڑکے اور لڑکیاں اس کی عادی ہیں۔

فرانس میں ایک پادری صاحب نے ڈاکٹر ڈبرین (Dubreyen) کو بتایا کہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو ہفتہ بھر بعد اقرار معصیت کرنے آتی ہیں اُن میں منجملہ بارہ لڑکیوں کے گیارہ ایسی ہوتی ہیں جنھیں اس کا شوق ہے۔

پروشیا کے ایک تادیب خانہ کے ایک میڈیکل افسر نے روہیلڈر (Rohleder) سے بیان کیا کہ یہاں کے تمام لوگ جو سن بلوغ تک پہنچ گئے ہیں اس علت میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح اسٹینلی ہال کا بیان ہے کہ امریکہ کے ایک تادیب خانہ میں ہر شخص بلا استثنا اس کا عادی ہے۔

استغناذ بالا دویہ	ڈاکٹر ریورڈین (Reverden) کا بیان ہے

کہ ملک فرانس کے اضلاع آئین و کوٹ دا اور (Ain-E-Cotedor)
میں یہ بات غیر معمولی نہیں ہے کہ نوجوان لڑکیاں اپنے جسم میں ایک بوٹی کے پتے
مل لیتی ہیں جسے علمی زبان میں "لناریہ سیمبالیریا" (Linaria Cymbalian)
اور عام طور پر "پنٹن" (Pinton) یا "ٹمبارڈے" (Timbarde) کہتے
ہیں۔ اس سے ہلکی سی سوزش پیدا ہو کر لطف پیدا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر دوہرن (Dukren) نے اپنی کتاب "Geschte Chtste-Len-in-England" جلد دوم صفحہ ۳۹۲ پر انگلستان
کی عورتوں کی نسبت لکھا ہے کہ نوجوان لڑکیاں اکثر بچھو بوٹی کی پتی مل لیتی ہیں،
جس سے خفیف سی سوزش پیدا ہو جاتی ہے اور مجبوراً سوزش رفع کرنے کے لیے
اس جگہ کو ملنا پڑتا ہے۔

ممالک مشرق خصوصاً ایران و ہندوستان میں اس غرض کے لیے عطر گلاب اور
عاقر قرحا وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے اس سے ایک قسم کی سوزش پیدا ہو کر
تحریک ہوتی ہے اور لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بعض عورتیں صبورہ پر
سہاگہ اور شہد کا ضماد کر لیتی ہیں۔

استلذاذ بالخیال بعض لوگ کسی قسم کے مصنوعی آلہ سے کام نہیں
لیتے۔ نہ وہ اپنے اعضاء کو کسی قسم کی رگڑ یا سوزش پہنچاتے ہیں بلکہ وہ عالم
تصور میں خیالی طور پر پورا لطف حاصل کر لیتے ہیں۔

نائسفورو (Nicifor) نے ایک اطالوی لڑکی کا حال بیان
کیا ہے جس کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور جو ایک کارخانہ میں کام کیا کرتی تھی۔ اس

چھوٹی سی لڑکی کو استلذاذ بالخیال میں اس قدر کمال حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کارخانہ کے اندر سب لوگوں کے سامنے دن بھر میں تین چار مرتبہ اس طرح لطف حاصل کر لیا کرتی تھی۔

شرنگ نوٹزنگ (Schrenk Notzing) نے ایک عورت کا حال بیان کیا ہے کہ وہ اچھا گانا سن کر یا کوئی مرد دیکھ کر حد درجہ بیتاب ہو جاتی تھی۔

اس کی شہادت ہندوستان میں بھی اب سے کئی ہزار سال پیشتر ہندوؤں کی مشہور و معروف رزمیہ نظم مہابھارت کے آدی پرب میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ:۔

"ایک روز اپریچر نامی راجہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا۔ وہاں اُسے اپنی بیوی کی یاد میں انزال ہو گیا۔ اُس نے وہ خارج شدہ نطفہ کسی درخت کے پتے میں دونا بنا کر رکھا اور ایک شکاری پرند کی معرفت اپنی رانی کے پاس روانہ کر دیا۔

اثنائے راہ میں اس کو دوسرا شکاری پرندہ ملا اور اس نے وہ دونا چھیننا چاہا، اسی چھینا جھپٹی میں وہ دونا دریائے جمن میں گر پڑا، پانی میں ایک اپسرا (بہشتی حور) جو کسی رشی کی بد دعا سے مچھلی بن گئی تھی تیر رہی تھی اس نے فوراً اس کو نگل لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاملہ ہو گئی حمل کی مدت پوری ہونے کے وقت اس مچھلی کو ایک ماہی گیر نے پکڑ لیا۔ پیٹ چاک کیا تو ایک لڑکا اور ایک لڑکی توام برآمد ہوئے ماہی گیر نے وہ لڑکا تو راجہ کو دے دیا اور لڑکی خود پالی جس کا نام

پچھو دری رکھا۔ یہی لڑکی وید بیاسس جی کی ماں اور کوروں پانڈوں
کی دادی تھی۔"

یورپ کے اندر بھی سترھویں صدی میں عورتوں کے اندر اس کا شغل موجود تھا۔ چنانچہ سنخوریگ (Sunhureg) نے بحوالہ ریولان (Riolan) لکھا ہے کہ:-

"بعض عورتیں اس قدر مغلوب النفس ہوتی ہیں کہ اگر انھیں کوئی حسین شخص نظر آجاتا ہے تو صرف اس کو دیکھ کر یا باتیں کر کے انتہائی لطف حاصل کر لیتی ہیں۔"

جان پیگٹ (John Paget) نے اپنی کتاب "قانونی معمے" میں ایک شادی شدہ عورت کا حال لکھا ہے:-

"جو اپنے ڈاکٹر پر عاشق ہو گئی تھی اور عالم خیال میں اپنے معشوق سے اس طرح باتیں کیا کرتی تھی کہ تین موٹی موٹی کتابیں بن گئی تھیں۔ ڈاکٹر بیچارے کو اس خیالی عشق کا حال قطعی معلوم نہ تھا لیکن جب اس کے شوہر کو یہ حال معلوم ہوا تو اس قدر جھگڑا بڑھا کر طلاق تک نوبت پہنچی۔"

استلذاذ بالنفس کے اسباب و علل خواہشات نفسانی انسان کے اندر فطرتاً پیدا ہوتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ بچے عالم شیر خوارگی میں بھی جب ان کے اندر کسی قسم کا مادہ شہوانی موجود نہیں ہوتا وہ اپنے عضو جنسی کو اکثر مسلتے رہتے ہیں۔ اس سے انھیں ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے، یہی عادت بعد میں استلذاذ بالنفس کی محرک ہوتی ہے۔

(۲) بعض دایہ اور انا بچوں کو سلاتے وقت ان کے بدن کو ہاتھوں سے سہلاتی ہیں جس سے انہیں ایک قسم کی لذت حاصل ہو کر نیند آجاتی ہے اور یہی عادت بعد میں اس عادت کی محرک ہوتی ہے۔

(۳) مجلسی لحاظ سے انسان نے فعل مباشرت کو ایک قابلِ شرم اور ناپاک فعل قرار دیا ہے جس کے لئے رازداری اور خلوت کی ضرورت ہے اس لیے لڑکوں اور لڑکیوں کو جب وہ خواہش سے مغلوب ہوتی ہیں اس طرح کام نکالنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔

(۴) بعض لوگ مذہبی یا اقتصادی وجوہ کی بناء پر نہ شادی کرتے ہیں، نہ حرام کاری اس لیے وہ اس "گناہ تنہائی" کے ذریعہ سے اپنی خواہشات پوری کر لیتے ہیں۔

(۵) بدکار عورتوں اور مردوں سے التفات کرنے میں آتشک و سوزاک وغیرہ کی بیماری کا خطرہ ہوتا ہے لیکن استلذاذ بالنفس میں اس کا کوئی احتمال نہیں۔

(۶) انسان کسی سے محبت کرنے لگتا ہے اور اُس تک رسائی نہیں ہوتی تو وہ عالمِ خیال ہی میں اس سے لطف حاصل کر لیتا ہے۔

یہ مشغلہ عورتوں میں کیوں زیادہ ہے اگرچہ دنیا بھر میں اس کا شوق عورتوں اور مردوں دونوں میں پایا جاتا ہے لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ شوق بمقابلہ مردوں کے عورتوں میں زیادہ ہے۔ جس کے اسباب حسب ذیل ہیں :۔

(۱) مردوں کی تعداد میں کمی جو جنگ یا وبائی وجہ سے اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) عورتوں میں بمقابلہ مردوں کے شرم وحیا زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہ حرام کاری کے بجائے گناہ تنہائی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔

(۳) جوان مرد وعورت کا ایک ساتھ سونا سوسائٹی میں معیوب خیال کیا جاتا ہے اس لیے عورتوں کے لیے استلذاذ بالنفس میں زیادہ آسانی ہے۔

(۴) بعض اقوام میں دوبارہ شادی کرنا معیوب خیال کیا جاتا ہے اس لیے تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لیے عورتیں اس مشغلہ کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

(۵) مرد جلد کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی خواہش عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔ برخلاف عورت کے کہ اس کی خواہش عرصہ تک قائم رہتی ہے اور اس لیے وہ اس طرح کام نکال لیتی ہے۔

(۶) اکثر عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تسکین فطری طور پر بہ آسانی نہیں ہو سکتی اس لیے وہ خود اس کا علاج کرنا چاہتی ہیں۔

(۷) چونکہ عورتوں کو حاملہ ہونے کا خوف رہتا ہے اس لیے یہ مشغلہ ان کو بہت محفوظ نظر آتا ہے۔

(۸) عورت کو ایام سے فارغ ہونے کے بعد ہی مرد کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اگر اس وقت مرد میسر نہ آئے تو وہ استلذاذ بالنفس کی طرف رجوع کرتی ہے۔

(۹) مرد کے اندر آلۂ خواہش صرف ایک ہے لیکن عورت کے اندر بہت سے

اعضاء ایسے ہیں جن میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔

(۱۰) فی زمانا اقتصادی امور کی بناء پر مردوں کو کام میں اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ وہ عورتوں کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکتے اس لئے عورتیں استلذاذ بالنفس سے اپنا شوق پورا کر لیتی ہیں۔

(۱۱) بعض عورتوں کو ہسٹریا وغیرہ ایسی بیماریاں ہوتی ہیں کہ ان کی طبیعت اس کی طرف خود بخود مائل ہو جاتی ہے۔

(۱۲) بعض عورتیں جو اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہیں خاطر خواہ شوہر نہ ملنے سے اس کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

(۱۳) بعض عورتوں کو اپنے حسن و جمال کا اس قدر غرور ہوتا ہے کہ وہ مرد سے بات کرنا اپنی ذلت سمجھتی ہیں لیکن تقاضائے فطرت استلذاذ بالنفس پر انھیں مجبور کرتا ہے۔

استلذاذ بالنفس کے نقصانات قوانین فطرت کے خلاف جو حرکت کی جائے گی اس کے نقصانات جسمانی یا دماغی طور پر ضرور ظاہر ہوں گے۔ چنانچہ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے استلذ بالمثل یا استلذاذ بالنفس کے جو نقصانات لکھے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔

ہم ذیل میں ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے استلذاذ بالنفس کے نقصانات متعلق ڈاکٹروں کی رائیں ظاہر ہوتی ہیں:-

نام ڈاکٹر	نقصانات
اسپائٹزکا Spitzka	دیوانگی، صرع، مختلف عوارض چشم، شقیقہ، دوران سر،

سیوتج	Savage	کھوپڑی میں عجیب قسم کی تکلیف۔
ایسٹی جے چیپمین	Aest Chapman	مختلف اقسام کے درد۔
چیپمین	Chapman	گدی کا جلد کمزور ہو جانا۔
لاکاشینا	Laca Ssagna	پستانوں کا ڈھیلا پڑ جانا۔
اوسینڈوسکی	Ossendowsky	پستانوں کا لٹک جانا۔
پیئر	Peyer	دمہ۔
سیرلے	Seerly	اختلاج قلب۔
باراڈق	Baraduc	زخموں پر چھالا پڑ جانا۔
کلپسن	Clipson	مساسے اور پھوڑے پھنسیاں۔
اسکین، لوئس، موریگلیا	S.kone, Lewis, Moraglia	آنکھوں کی پتلیوں کا پھیل جانا
پوئلے	Pouilet	آنکھوں کا اوپر چڑھ جانا یا ترچھا ہو جانا۔
بونیر	Bounier	آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، گاہے گاہے ثقل سماعت۔
جے چیپمین	J. Chapman	تکلیف کے ساتھ حیض ہونا۔
ونکل پوئلے	Winckel Pouilet	سیلان الرحم
جیسٹ	Jusait	خصیتین میں تکلیف ہونا۔
لوئس، موریگلیا	Louis Moraglia	زرد رنگ۔ یا چہرے کی بے رونقی۔

گرونر	Gruner	ناک کا سُرخ ہو جانا۔
جول میکنزی	Joal Mackenzie	نکسیر پھوٹنا۔
گوورس	Gowers	خراشِ گلو وقتِ بلوغ۔
فلائس	Fliess	ناک میں مختلف بیماریاں پیدا ہونا۔
شوفیلٹ	Shufellet	اندامِ نہانی میں تیزابی کیفیت۔
گرانڈو	Grindow	ضعفِ مثانہ۔
دور۔ کچمار۔ خان ادئی	Dur, Krichmar, Oye.	عورتوں کے ہاتھوں پر مسّے ہو جانا۔
گریسنجر، لوئس	Griesinger Lewis	توہم سامعہ و شامّہ
ہرٹر	Herter	قارورہ کا غلیظ ہو جانا۔
اسکین	Skene	عورتوں کے جسم سے بو کا پیدا ہونا۔

فحاشی عہد قدیم میں

قدیم یونان یورپ میں باقاعدہ فحاشی کی ابتدا مشہور یونانی مقنن حکیم سولن (Solon) کے زمانہ سے قرار دیتے ہیں۔ یہ شخص بڑا مصلح تھا اور فحاشی کے اڈے اور چکلے جو اس نے قائم کئے تھے ان سے اس کی غرض اشتراک فی النسواں کے رواج کو قائم کرنا تھا نہ کہ بڑھانا۔ سولن کے قانون کے مطابق ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ اگر وہ کسی شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوث دیکھے تو اسے قتل کر ڈالے لیکن اگر ناکتخدا عورت سے کوئی شخص بالجبر ملوث ہوتا تھا تو اُسے سزائے جرمانہ دی جاتی تھی جس کی مقدار سو بھیڑوں کی قیمت ہوتی تھی اور اگر کوئی شخص پیشہ ور عورت کے علاوہ کسی ناکتخدا عورت کو اغوا کرتا تھا تو اُسے کم جرمانہ کی سزا ہوتی تھی یعنی صرف بیس بھیڑوں کی قیمت حکیم سولن نے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو فروخت نہ کریں جب تک وہ صاحبِ عصمت ہیں۔

اس کے مُرتب کردہ قوانین نے بہت سی باتوں کو جو اسی قبیل سے تھیں باقاعدہ کر دیا تھا۔ ایک قانون یہ تھا کہ اگر کسی صاحب جائداد عورت کا شوہر ہیچ کارہ ثابت ہو تو وہ اپنے کسی رشتہ دار کو پسند کرلے تاکہ اس سے کوئی وارث مال پیدا ہو سکے۔ صاحب مال و جائداد عورت کے خاوند کو

مہینہ میں کم از کم تین مرتبہ تعلق جنسی کرنا پڑتا تھا۔
بعض قوانین حکیم سولن کے ایسے ہیں جو غالباً آج کل کے شوہروں کو بھی پسند آئیں۔ مثلاً کسی عورت کو اجازت نہ تھی کہ وہ تین جوڑے سے زیادہ کپڑے لے کر سفر کرے۔ وہ رات کے وقت سفر نہیں کر سکتی تھی، اگر کرتی تھی تو ایک بند گاڑی میں جس کے آگے آگے روشنی لے کر چلنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے کہنے سننے سے اپنی وصیت میں بعض خاص شرائط لکھ دیتا تھا تو انھیں ناجائز قرار دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ایوان بلاخ نے حکیم سولن کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"وہ پہلا شخص ہے جس نے غلط منطق سے کام لے کر آئین و قوانین حکومت کی تائید و حمایت کی۔ جو لوگ اس بات کے حامی ہیں کہ چکلوں کو موقوف کیا جائے، ان کی نظروں میں سولن کی یہ دلیل غلط ہے کہ اگر بدکاری کو قانوناً جائز قرار دے دیا جائے تو اس سے گھروں کی حرمت و عزت قائم رہتی ہے اور شہریوں کی بیبیوں اور بیٹیوں کی عصمت محفوظ رہتی ہے۔ آجکل بھی بعض پابند قانون عورتوں اور مردوں کا خیال ہے کہ چکلوں کی جو تائید و حمایت کی جاتی ہے وہ سولن کی اسی دلیل کی بنیاد پر ہے۔"

قدیم یونانیوں میں حکومت ابویت (Paternism) بہت زیادہ رائج تھی اور جس شخص نے حکیم افلاطون کی کتاب "جمہوریت" یا حکیم ارسطو کی سیاسی و اخلاقی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ گھر کے بعض معاملات چلانے کے لیے جو تدبیر سولن نے

تجویز کی تھی اس میں کوئی جدید بات نہ تھی۔ سولن ہرگز عورتوں کا طرفدار نہیں تھا اس نے اخلاقیات جنسی کا معیار بلاچون وچرا تسلیم کر لیا تھا، اس کا مرتب کردہ تمام نظام بیوی کو اپنے شوہر سے وابستہ رکھتا تھا اور اس نے مردوں کو ارتباط و اختلاط کی کامل آزادی دے رکھی تھی تا وقتیکہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی یا بیٹی سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔

نظام سولن کے ماتحت کسبیوں کا طبقہ رضاکار عورتوں سے نہیں بھرتی کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس میں لونڈیاں اور کنیزیں داخل تھیں جو زیادہ تر غیر ملکی ہوتی تھیں۔ ان کسبیوں کے چکلوں کے مصارف منجانب ریاست ادا کیے جاتے تھے اور بقول مورخ نکاندر (Nickander) جو آمدنی سولن کو ان چکلوں سے حاصل ہوتی تھی وہ آفرودیتہ پانڈیموس کے مندر میں پجاریوں کو دیدی جاتی تھی۔ غالباً سولن یہ سمجھتا ہوگا کہ بدکاری اب بھی کسی نہ کسی طرح مذہب سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ مذہب خود کسبیوں کو مقدس قرار دیتا ہے۔ یہ وہ بدنصیب عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں قید ہو کر آتی تھیں اور چکلوں کے سامنے خوش غلاف ہو کر آنے جانے والے پر ڈورے ڈالتی تھیں ان عورتوں کو کسی مرد کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل نہ تھا بلکہ انھیں ہر اس شخص کے لیے رضامند ہونا پڑتا تھا جو ازروئے قانون مقرر کردہ حقیر ترین رقم پیش کرے۔

اس زمانہ میں عورتیں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، اور بیویوں کا فرض بچے جننے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بایں ہمہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے

ہیں۔ سولن نے ان عورتوں کے حقوق کا تحفظ کر دیا تھا جو صاحب مال و جائداد ہوتی تھیں۔ پلوٹارک (Plutarch) نے سولن کے ان قوانین کی تعبیر عجیب و غریب طور پر کی۔ عام طور پر شادی شدہ عورت سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ گھر میں رہے اور اپنے بال بچوں کی دیکھ بھال کرے۔

لڑکیوں کی شادیاں عموماً اوائل عمر میں ہو جاتی تھیں اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ ان ضروری فنون کی تعلیم پاتیں جو ایک اچھی گھر والی کے لئے ضروری ہیں۔ قدیم یونان کی معزز عورت مطلق تعلیم یافتہ نہیں ہوتی تھیں علاوہ ازیں وہ دُنیا بھر سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ شادی سے پہلے اکثر شوہر کو دیکھنا تک نصیب نہ ہوتا تھا۔ دولہا اور دُلھن میں باہم محبت کا ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔

عورتوں کو تھیٹروں، مردانہ کھیلوں، یا دیگر پبلک مقامات میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ان احکام امتناعی سے پیشہ ور عورتیں عموماً مستثنےٰ کر دی جاتی تھیں۔ ہومر کے زمانہ میں عورتوں کی حالت نسبتاً اچھی تھی۔ تاہم مرد عورتوں کو جبراً بھگا لے جاتے تھے یا انھیں قید کر کے شادی کرتے یا گھر میں ڈال لیتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں بعض مرتبہ سخت جنگ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ہیلن کے حسن و جمال نے جس طرح ایک ہزار جنگی جہازوں کا بیڑہ تباہ کر دیا تھا وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔

قدیم یونان میں کسی شخص کی بیوی سے یا کسی اپنی ناکتخدا رشتہ دار عورت سے تعلق پیدا کر لینا معمولی بات سمجھی جاتی تھی اور جس شخص کے خلاف یہ جرم کیا

جاتا تھا اس کو عموماً یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ مجرم سے وہ جو چاہے انتقام لے۔ اس میں سزائے موت بھی شامل تھی۔ حکومت کی طرف سے بھی مختلف قسم کی سزائیں انسدادِ زناکاری کے لیے مقرر تھیں۔

ان سزاؤں کے خوف سے صاحبِ عصمت عورتیں محفوظ رہتی تھیں اور مرد جنگلوں میں جا کر لونڈیوں سے متمتع ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں کسی کسبی کے گھر جانا اصطلاحاً معیوب نہ تھا اور نہ نحوست کا سبب کیونکہ ان کسبیوں کا خرچ حکومت اُٹھاتی تھی اور یہ اندیشہ نہ تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں سے مل کر لوگوں کو لٹوا دیں گی۔ اسی کے ساتھ البتہ یہ امر قابلِ توجہ ضرور ہے کہ اُس زمانہ میں آتشک یا سوزاک جیسی ناپاک بیماریوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ یورپ میں آتشک کا پتہ اُس وقت کے بعد سے چلتا ہے جب کہ کولمبس امریکہ دریافت کر چکا تھا۔ یقیناً یہ ناپاک بیماری اُس وقت جزیرہ ہائٹی یا سان ڈومنگو واقع مجمع الجزائر غرب الہند سے ہسپانیہ میں لائی گئی تھی۔ سوزاک قدیم یورپ میں ضرور پایا جاتا تھا۔ لیکن اس بیماری کی نوعیت اور اس میں مبتلا ہونے کے اسباب لوگوں کو معلوم نہ تھے۔

الغرض کسبیوں کا وجود ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے طبقۂ احرار کی بیویوں کی عصمت و عفت محفوظ رہتی تھی۔ قدیم زمانہ کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں غلام کا بہت بڑا حصہ تھا۔ مسیح سے قبل چوتھی صدی میں ایتھنز کی مردم شماری ہوئی تو معلوم ہوا کہ آزاد شہری ۲۱ ہزار، غیر ملکی باشندے ۱۰ ہزار اور غلام ۴ لاکھ ہیں۔ زمانۂ مابعد میں غلاموں کو آزاد کرنا رسم عام ہو گیا تھا۔ لیکن یونان

میں یہ بات شاذو نادر تھی۔

واقعات مندرجہ بالا سے یہ بات پوری طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ بہت کم آزاد عورتیں کسبیوں میں شامل ہوتی تھیں۔ لیکن یہ ہوتا تھا کہ کسی شہری کی لڑکی کو بحری قزاق پکڑ لیتے تھے یا وہ جنگ میں اسیر کرلی جاتی تھی۔ یا لڑکی کا باپ اسے فروخت کر دیتا تھا۔ اور اس طرح یہ سب یونان قدیم کے چکلوں میں چلی جاتی تھیں۔

قدیم زمانے کے یونانی کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہونا بڑی کمزوری خیال کرتے تھے اس لیے کسبی صرف مردوں کی تفریح کا کام دیتی تھی۔ داشتہ عورت خانگی فرورتوں کو دیکھتی تھی اور بیوی اس لیے تھی کہ جائز بچے جنے۔ یونان میں بیوی کو ایک ناگزیر مصیبت خیال کیا جاتا تھا اور عشق و محبت ان کے نزدیک ایک بیماری یا ہلکا سا جنون تھا۔

قدیم یونانیوں میں عشق و محبت کو غیر اہم چیز سمجھنے کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہاں تعلق جنسی بغیر کسی آڑ یا پردہ کے ہوتا تھا۔ یونانیوں کے نزدیک برہنگی کوئی گناہ نہ تھا۔ اور اولمپیائی کے کھیلوں میں جو لوگ کرتب دکھاتے تھے وہ کرتہ پاجامہ نہیں پہنتے تھے۔ ہر جگہ عُریاں بت اور ننگی تصویریں نظر آتی تھیں اور انہیں دیکھ کر کوئی شخص نہیں شرماتا تھا۔ یہی "عریانی" تھی جو عشق و محبت کی کیفیت دل میں قائم نہ ہونے دیتی تھی۔

عشق و محبت کے خیال کو نحش سے علیحدہ کرنا قدیم یونانیوں کے حکیمانہ رجحان کے قطعی خلاف تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر صورت سے حکومت کی

تکمیل کریں اور کسی خاص بات کی ترقی پر توجہ نہ کی جائے تا وقتیکہ وہ ریاست کی ترقی میں مدد نہ دے۔

بہت سے یونانی اہل فکر کے نزدیک باقاعدہ فحاشی سے ریاست کی خدمت ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک فحاشی ذریعہ شہوت رانی نہیں تھا۔ بلکہ خواہشات فطری کے پورا کرنے کا ذریعہ تھا۔

قدیم زمانہ میں بدکاری صرف بڑے بڑے شہروں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی عورتوں کے چکلے پائے جاتے تھے اسی کے ساتھ جب کسی مہم پر فوجیں بھیجی جاتی تھیں تو ان کے ساتھ کسبیاں بھی جاتی تھیں یہ یونیورسٹیوں میں بھی پہونچ جاتی تھیں۔ تہواروں اور مذہبی میلوں میں تیرتھ کے مقامات میں اور اُن تمام میلوں میں جہاں مرد بکثرت جمع ہوتے تھے کسبیوں کے جھرمٹ ضرور ہوتے تھے۔

روما کے تہوار فلورلیا کی طرح بہت سی مذہبی تقریبیں کسبیوں سے خاص طور پر تعلق رکھتی تھیں۔ اور بعض ایسے تہوار بھی ہوتے تھے جن کا تعلق صرف کسبیوں سے تھا اور ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ میلہ تھا جو آفرودیتہ دیوی کے اعزاز میں بمقام کارنتھ برپا ہوتا تھا۔

اگرچہ یونان کی اکثر کسبیاں کنیزیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے درجے تھے۔ درجۂ خاص کی کسبیاں وہ تھیں جو بطور مدخولہ عرصہ تک ایک ہی مرد کی پابند رہتی تھیں اور ادنیٰ درجہ کی کسبیاں وہ تھیں جو وقتی طور پر نہایت ہی حقیر معاوضہ کے قبول کرنے میں بھی عذر نہ کرتی تھیں۔

بہت سی کسبیاں شریف خاندان کی لڑکیاں ہوتی تھیں جو قزاقوں کے ہاتھ پڑنے یا جنگ میں مفتوح ہونے کے بعد لونڈیاں بنائی جاتی تھیں اور پھر ان سے کسب کرایا جاتا تھا۔ ان میں بعض ایسی بھی ہوتی تھیں جو علم مجلس اور فن موسیقی سے واقف ہوتی تھیں اور اگر وہ قبول صورت اور تعلیم پانے کے قابل ہوتی تھیں تو انھیں چکلوں میں بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

جو کنیز ناچنا گانا اور ساز بجانا جانتی تھی اس کی قیمت بازار میں بمقابلہ دوسری کنیز کے زیادہ ہوتی تھی۔ اگرچہ اکثر یونانی اپنی بیویوں کا تعلیم یافتہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ انھیں کسبیوں کی طرف زیادہ مائل رہتے تھے جو تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔

جو کسبیاں چکلوں کے سامنے کھڑی ہو کر مردوں کو ترغیب دیا کرتی تھیں وہ نہایت ادنیٰ اور ذلیل طبقہ کی ہوتی تھیں۔

اعلیٰ طبقہ کی کسبیوں میں وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو اس زمانہ کے مختلف سازوں کو عمدگی اور ہنرمندی کے ساتھ بجا سکتی تھیں۔ یہ کسبیاں گویوں، مسخروں، نقالوں اور بھانڈوں کے ساتھ ضیافتوں اور جلسوں میں اکثر طلب کی جاتی تھیں۔ بیویوں کو ہمیشہ گھروں پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ ایسی صحبتوں میں شریک نہیں کی جاتی تھیں۔ ان پیشہ ور لونڈیوں کے ناچ ہمیشہ عریاں اور شہوت انگیز ہوا کرتے تھے کیونکہ رقص کا فلسفہ یہی ہے کہ اشارۃً و کنایۃً یا صراحۃً جذبات حیوانی کو حرکت میں لایا جائے اور پھر چونکہ اس عہد میں شرم وحیا اخلاقی دنیا میں بہت کم وزن چیز سمجھی جاتی تھی اس لیے ان کے رقص کی قدرتاً

زیادہ عُریاں اور شہوت انگیز ہونا چاہیئے تھا۔

عہد حاضر کی طرح قدیم زمانہ میں بھی ناچ کے ساتھ ناٹک کی بعض خصوصیات متعلق ہوتی تھیں اور جس طرح اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تھیٹر معزز عورتوں کے جانے کی جگہ نہیں ہے اسی طرح یونانیوں میں جو عورت اسٹیج پر آکر کام کرتی تھی اُس کو کسبی سمجھا جاتا تھا۔

جیسا کہ اب سے پہلے انگلستان میں رواج تھا اسی طرح یونان قدیم میں بھی اسٹیج پر زنانہ اور مردانہ پارٹ سب مرد کیا کرتے تھے اُس وقت تمثیل میں اصلیت کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ ایکٹر لوگ مصنوعی چہرے لگایا کرتے تھے تاکہ وہ دیوتا کی طرح معلوم ہوں اور وہ جوتے بھی اونچے پہنتے تھے تاکہ کام کرتے وقت بلند بالا نظر آئیں۔

ایک قسم کا ڈرامہ ایسا بھی ہوتا تھا جس میں عورتیں پارٹ کیا کرتی تھیں اس میں وہ حد درجہ شہوت انگیز ناچ ناچتی تھیں اور عُریاں یا نیم عُریاں حالت میں جو عُریانی سے بھی زیادہ ہیجان انگیز ہے، ترت کرکے فنِ عیاشی کے تمام رازہائے سربستہ کھول دیا کرتی تھیں اور پھر ناچ رنگ کے بعد وہ مردوں کے لیے وقف ہوتی تھیں۔

اُس عہد کے حمام بھی چکلہ ہی کا کام دیتے تھے اور ایتھنز اور دیگر یونانی شہروں کے حماموں میں بھی تھیٹروں کی طرح ناچ رنگ کا انتظام ہوتا تھا یہی سبب تھا کہ چکلوں کی طرح حمام بھی شہر سے باہر بنائے جاتے تھے۔

یونان کے قحبہ خانے نہ صرف عام اور کھُلے ہوئے بازارِ حُسن فروشی

ہوتے تھے بلکہ وہاں جانا معیوب بھی نہ تھا۔ وہ ایک قسم کے سرکاری مکانات تھے جن کا انتظام حکومت کے سپرد تھا۔ بعض قحبہ خانے ہوٹل کا بھی کام دیتے تھے جہاں سامان اکل وشرب بھی عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ان قحبہ خانوں سے باہر اعلیٰ طبقہ کی کسبیاں اپنے ذاتی چھوٹے چھوٹے آراستہ و پیراستہ کمروں میں رہا کرتی تھیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی ایک مرد کی پابند ہو کر رہتی تھیں اور ان میں وہ کسبی بہت زیادہ مرکز توجہ ہوتی تھی جو نہ صرف بلحاظ حسن وجمال، بلکہ بلحاظ علم مجلسی کوئی خصوصیت رکھتی ہو۔

ہیرودوطوس نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مشہور کسبی رہوڈوپی کو سیفو (Sappho) کے بھائی چاراکسس نے آزاد کر دیا تھا لیکن وہ پھر مصر جا کر اپنا پیشہ بدستور کرتی رہی۔ کہتے ہیں کہ وہ اس قدر دولتمند ہو گئی کہ اہرام مصری میں سے ایک ہرم خود اس کے خرچ سے تعمیر ہوا تھا۔

پلوٹارک نے (Pericles) پریکلیز کی سوانحعمری میں لکھا ہے کہ اس نے محض ایک کسبی اسپاسیا (Asfiasia) کو خوش کرنے کے لیے شہر ایتھنز کو جنگ میں جھونک دیا تھا۔ بعض مصنفین لکھتے ہیں کہ پیریکلیز، اسپاسیا کو محض اس کی عقلمندی اور سیاسی قابلیتوں کے باعث چاہتا تھا۔ سقراط اور اس کے احباب بھی اس عورت کی صحبت میں بیٹھتے تھے اور جو لوگ اس کی باتیں سن لیتے تھے وہ اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی لے آتے تھے تاکہ وہ بھی اس کی باتوں سے مستفید ہوں۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ پیریکلیز نے اپنی بیوی کو نکال دیا تھا اور خود اسپاسیا کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

ڈاکٹر ایوان بلاخ نے قدیم زمانہ کی کسبیوں کے بہت سے حالات لکھے ہیں جن میں ایک آرچیپے (Archippe) تھی جسے سوفوکلیس مشہور ڈرامہ نگار اپنی تمام دولت دے گیا تھا۔ ایک اور لیونتیون (Leontion) تھی جو اپی کیورسس اور اس کے شاگردوں کی معشوقہ تھی اور خود بھی ایک اچھی مصنفہ اور فلسفی تھی۔ ایک اور تھی جس کا نام فرائین (Phryne) تھا یہ تمام یونان میں اپنے حسن و جمال کے لیے مشہور تھی اس کا ایک طلائی بت بمقام ڈلفانی (Delphi) نصب تھا۔ ایتھنز کی ایک اور مشہور کسبی تھائیس (Thais) تھی جو سکندر اعظم کی معشوقہ بن گئی تھی اور اس کے بعد بطلیموس اول شاہ مصر کے ساتھ اس کے تخت پر بیٹھتی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس بطلیموس شاہ مصر کی ماں کسی زمانہ میں سکندر اعظم کے باپ فیلقوس شاہ مقدونیہ کی معشوقہ تھی۔

اپیلس (Appeles) یونانی مصوروں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف شخص تھا (جو چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا اور سکندر اعظم کا ہمعصر تھا) اس نے بھی کسبیوں کی تصویریں کھینچنے سے انکار نہیں کیا۔ اس کی سب سے زیادہ کامیاب تصویر وہ ہے جس کا عنوان ہے "زہرہ سمندر سے نکل رہی ہے" حالانکہ یہ تصویر فی الحقیقت فرائن (Phryne) کسبی کی تھی جو (Posedan) دیوتا کے ایک تہوار کے موقع پر برہنہ ہو کر سمندر میں کودی تھی کہتے ہیں کہ پراکساٹلیس مصور (Praxitiles) نے جو اپنی مشہور و معروف تصویر افرودیتہ دیوی کی کھینچی تھی اس کے لیے بھی اسی عورت

نے نمونہ کا کام دیا تھا۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے بنے ہوئے جو یونانی گلدان ہیں اُن میں بہت سے ظروف پر قحبہ خانوں کے مناظر اور ننگے آسن بنے ہوئے ہیں جنھیں بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور معزز شہری اُن کو اپنے گھروں میں سجاتے تھے۔ چنانچہ ارسطو نے اپنی کتاب سیاسیات (Politics) میں اور اصطلاحات کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ فحش تصاویر منظر عام پر ممنوع قرار دی جائیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدیم یونان کی کسبیاں ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے ایسی ہی تھیں جیسی کہ اس زمانہ کی ہیں؟ ڈاکٹر بلاخ کا خیال ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ لومبروسو نے اس زمانہ کی کسبیوں کا حال بیان کیا ہے۔ اسی طرح تمام زمانہ کی کسبیوں کے اوصاف میں ان کی پاکیزگی و صفائی، ان کی توہم پرستی، ان کا مکر و فریب، ان کا رشک و حسد اور ان کی بے غیرتی و بے حیائی داخل تھیں۔ لیکن ایک نازک خیال فلسفی یہ کہہ سکتا ہے کہ موخرالذکر بات کے سوا کون سی بات ایسی ہے جو تمام عورتوں میں نہیں پائی جاتی۔

ان عالم گیر خصوصیات قحبگی کو قدیم زمانہ کی کسبیوں پر عائد کرتے ہوئے ہمارے خیال میں ڈاکٹر بلاخ ایک بات بھول گئے ہیں اور وہ یہ کہ قدیم زمانہ کی اکثر کسبیاں اپنی مرضی کے خلاف قحبہ خانوں میں داخل ہوتی تھیں اور جب ایک مرتبہ وہ قحبہ خانہ میں داخل ہو جاتی تھیں تو وہ اس پیشہ کے

تمام ہتھکنڈے اور چالاکیاں سیکھ لیتی تھیں اور بعض وہی طریقے اختیار کر لیتی تھیں جو پہلی کسبیوں کے ہوتے تھے۔ لومبروسو کا نظریہ جس سے ڈاکٹر بلاخ پوری طرح متفق نہیں ہیں یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی کسبی اپنی فطری خصوصیات کی وجہ سے ایسی بن گئی ہے اور حالات سے مجبور ہو کر اس نے ایسا نہیں کیا۔

بہت سی چھوٹی چھوٹی تفصیلات جو قدیم یونان کی کسبیوں میں پائی جاتی تھیں اور وہ اس زمانہ میں بھی یورپ اور امریکہ کی کسبیوں میں موجود ہیں۔ یونان و روم کی کسبیاں اپنے چہرہ پر غازہ ملا کرتی تھیں اور بعض اوقات معزز عورتیں بھی ان کی تقلید کرتی تھیں۔ جو طرز رفتار آج کل کی کسبیوں کا ہے وہی قدیم زمانہ کی کسبیوں کا تھا یعنی وہ بھی مٹک مٹک کر شہوت انگیز چال چلا کرتی تھیں۔ یونانیوں کا لباس بیشک سادہ تھا۔ پھر بھی اعلیٰ طبقہ کی یونانی کسبیوں کو نئے نئے فیشن جاری کرنے کا موقعہ ملتا رہتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں بھی فن مشاطہ گری اتنا ہی ترقی یافتہ تھا جتنا آج کل ہے یعنی رسیدہ اور بدصورت عورتوں کو بنا سنوار کر دلفریب اور خوبصورت بنانے کا علم ایک مستقل فن تھا جسے بہت محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔

قدیم زمانہ کی کسبیاں مصنوعی دانت بھی استعمال کرتی تھیں جو غالباً موم یا کسی مسالہ کے بنائے جاتے تھے اور ان کا مقصد کھانا پینا نہیں بلکہ محض نمائش ہوتا تھا۔ قدیم زمانہ کے لوگ مختلف قسم کے منجن اور مسیاں بھی جانتے تھے جن سے دانت خوبصورت بنائے جاتے تھے۔

خضاب کے ذریعہ سے بالوں کو رنگنا۔ مصنوعی بالوں کو کام میں لانا۔ جسم پر سے بال اُڑانا۔ یہ تمام باتیں قدیم یونانی کسبیاں کیا کرتی تھیں۔ الغرض اُس زمانہ کے اسباب آرائش و زیبائش جہاں تک ہم کو معلوم ہے موجودہ زمانہ کے سامان زیب و زینت سے ہرگز کم نہ تھے۔

قدیم زمانہ کی کسبیاں موجودہ زمانہ کی ہر عورت کی طرح جانتی تھیں کہ فن دلربائی میں عریانی اس قدر کامیاب چیز نہیں ہے جس قدر نیم عریانی اور یہ کہ غمزہ و عشوہ کا برمحل استعمال کتنا مؤثر حربہ عورت کا ہے۔

الغرض قدیم یونان کی کسبیاں موجودہ یورپین اور امریکی کسبیوں کی طرح تھیں۔ اور اگر کچھ فرق تھا بھی تو اس کی توجیہہ صرف اقتصادی یا فلسفیانہ ہو سکتی ہے۔ اس امر کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فطرتِ انسانی یا خواہشاتِ نفسانی میں گزشتہ پانچ چھ ہزار سال کے اندر کسی قسم کا تغیر واقع ہو گیا ہے یہ بات باوجود زمانۂ حال کے بے شمار آئین و قوانین، جلسوں، کانفرنسوں، الہامات اور پیشین گوئیوں کے بدستور موجود ہے، قحبہ خانے بھی تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے پہلے زمانہ میں تھے۔ آج کل کی کسبی اگر سیکڑوں اور درجنوں بوتلیں شراب کی پی جاتی ہے تو قدیم یونان کی کسبی بھی مسکرات کا استعمال کیا کرتی تھی۔

اناطول فرانس نے اپنے ناول "تھائیس" (Thais) میں نہایت دُور بینی سے کام لے کر ایک خوبصورت اور ہر دل عزیز یونانی کسبی کا حال لکھا ہے۔ یہ کسبی قدیم یونان میں نہیں بلکہ مصر میں رہتی تھی۔ اُس زمانہ میں

مصر کے بڑے بڑے شہروں پر یونان کا اثر تھا۔ اس قصہ میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک راہب ایک پیشہ ور عورت پر اثر ڈالتا ہے مگر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ایک مرد اکرتا ہوا جاتا تھا اور فصل بھر کے لیے قحبہ خانہ کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ وہ اُن لوگوں کی طرح مکّارانہ صورت نہیں بناتا تھا جو آج کل اوپیرا میں ایک بڑا کمرہ کرایہ پر لے لیتے ہیں اور پھر بھی زاہدانِ خشک کی سی صورت بنائے رہتے ہیں۔

عملی طور پر نوجوان طبقہ کا ہر فرد کسبی کا گھر جھانکتا تھا، کیونکہ وہاں ہر شخص بآسانی آجا سکتا تھا۔ فیس بہت کم تھی اور وہاں آنا جانا رائے عامہ کے نزدیک قابلِ شرم بات نہ تھی۔

سولن کے زمانہ میں چند سکّوں کی مدد سے ہر شخص ایک معمولی کسبی کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ جو کسبیاں زیادہ پسندیدہ ہوتی تھیں وہ اتنی ہی زیادہ گراں بھی تھیں۔ اُس وقت کسبیوں کے دلّال بھی موجود تھے جو یا تو سرکاری ملازم ہوتے تھے یا غلام کسبیوں کے مالک یا آزاد رنڈیوں کے مقرر کیے ہوئے لوگ۔ بعض صورتوں میں یہ لوگ کسبیوں کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ ماں اپنی بیٹی اور شوہر اپنی بیوی سے ملا دیتا تھا۔ زمانہ قدیم میں کسبیوں کا کاروبار وہ لوگ بھی کرتے تھے جو اس ذریعہ سے تجارتی نفع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بازار بردہ فروشاں میں دیگر غلاموں کی طرح کسبیاں بھی فروخت ہوتی تھیں اور خرید و فروخت میں ان کے جذبات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا

تھا۔جو لوگ خریدنے والے ہوتے وہ ان کو پوری طرح دیکھ لیا کرتے تھے۔

قدیم زمانہ کے لٹریچر میں لوطیوں کا بھی ذکر آتا ہے جن کے لیے قحبہ خانوں میں خاص انتظام کیا جاتا تھا۔تقریباً تمام خواہشیں جو آج کل ہم کو خلاف فطرت اور خلاف اخلاق نظر آتی ہیں وہ قدیم زمانہ میں معقول اور فطری خیال کی جاتی تھیں۔چنانچہ لواطت ایک نہایت اہم بات تھی جو کھلم کھلا ہوتی تھی اور جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔

بہت سی کتابیں جو آج کل مخرب اخلاق سمجھی جاتی ہیں، قدیم زمانہ میں پوری طرح اشاعت پذیر تھیں۔مثلاً بہت سی کتابیں "زہرہ کی تصویر" پر لکھی گئی تھیں جن میں مجامعت کرنے کے مختلف طریقے تحریر تھے۔

یہودیوں میں غسل جنابت فریضۂ مذہبی تھا۔اسی لیے حمام اور قحبہ خانے پاس پاس ہوتے تھے اور بعض اوقات حمام اور قحبہ خانہ میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔جسمانی ورزش سے پہلے یہ لوگ اپنے جسم پر تیل مل لیا کرتے تھے۔ اور غالباً اسی عمل کی بدولت وہ بسا اوقات گندی بیماریوں سے محفوظ رہتے۔قدیم زمانہ کے لوگ خود اپنے فائدہ کی غرض سے کسبیوں کی جسمانی صفائی اور پاکیزگی کا بے حد خیال رکھا کرتے تھے۔وہ ان کے نزدیک ایک مفید بلکہ مذہبی چیز تھی جس کی وجہ سے گھر کی عصمت و عفت محفوظ رہتی تھی۔

یونان قدیم میں کسبیوں کی باگ حکومت کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو اس کی کمائی کا بڑا حصّہ لے لیتی تھی۔ٹیکس وصول کرنے والوں کا ایک خاص عملہ ہوتا تھا اور جو عورت حکومت کی ملکیت سے باہر ہوتی تھی وہ ماہانہ ٹیکس ادا کرتی تھی

جو اس کی مقررہ خرچی کے برابر ہوتا تھا۔

قدیم ہندوستان، یونان اور روم میں ہرچند کسبیوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا لیکن جائز بیوی کے مقابلہ میں انھیں بہت زیادہ آزادی اور اہمیت حاصل تھی بیوی کا کام گھر میں رہنا، کھانے پینے کا انتظام کرنا اور بال بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ لیکن کسبی آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملتی تھی۔ اگر وہ ہوشیار ہوتی تھی تو اس قدر اثر اور طاقت حاصل کر لیتی تھی کہ سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ بہر حال اس کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا میدان بہت وسیع ہوتا تھا۔ اگر اس میں اتنی قابلیت اور خواہش ہوتی تھی کہ وہ علمی مجلسوں میں شرکت کر سکے تو اسے اجازت مل جاتی تھی۔ ہر شخص اس کا مدّاح ہو سکتا تھا اور ہر شخص اس کا جامِ صحبت پی سکتا تھا۔ ہر شخص اس کے ساتھ بعزت و اکرام پیش آتا اور تحائف نذر کرتا تھا۔

جن حضرات نے ملکہ الیزبتھ کے ڈرامے پڑھے ہوں گے وہ واقف ہوں گے کہ ان کا منظر عام طور پر کوئی قحبہ خانہ یا مشہور بارونق شراب خانہ رکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ منجملہ دیگر خصوصیات کے لاطینی تماثیل سے لیا گیا تھا اور لاطینی تماثیل میں یونان کی تقلید کی گئی تھی۔ قدیم زمانہ کے لوگ اسٹیج پر قحبہ خانہ دیکھ کر ناراض نہیں ہوتے تھے اور بہت سی یونانی تماثیل میں کوئی اعلیٰ پایہ کی کسبی ہیروئن ہوتی تھی۔

سلطنت روم کے زمانہ میں یونان کی کسبیوں کا جو کچھ حال تھا وہ لیوسن (Lucian) کے طنزیہ مکالموں اور اس کے ہمعصر السیفرون (Alciphron)

کے فرضی خطوط سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ قدیم زمانہ کے تمام چھوٹے بڑے مصنفین معاملات جنسی پر آزادانہ قلم فرسائی کرتے تھے اور بہت سی کتابوں کا مقصد یہی تھا کہ وہ "کوک شاستر" کا کام دیں۔ اس مقصد کی طرف قدیم طبی کتب میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

یہی بات قدیم فنونِ لطیفہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آج بھی "لنگ" کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں لیکن انھیں دیکھ کر وہی لوگ پہچان سکتے ہیں جو ان کے راز سے واقف ہیں۔ قدیم زمانہ میں جب یہ "لنگم" اور بھی زیادہ بکثرت تھے تو ہر شخص ان کا مطلب و مفہوم سمجھتا تھا۔

قدیم زمانہ سے یہ بات چلی آتی ہے کہ جب کوئی مصور یا سنگ تراش کسی مقدس مجسمے یا تصویر کے لیے کسی عورت کا نمونہ تلاش کرتا ہے تو عموماً وہ صاحب عصمت و عفت نہیں ہوتی۔ یونان میں آفرودیتہ (Aphrodite) دیوی کے بہت سے بُت مشہور و معروف کسبیوں کے نمونہ پر بنائے گئے تھے چونکہ وہ عشق و محبت کی دیوی تھی اس کے لیے کچھ ضرورت نہ تھی کہ کوئی پاکی کا رنگ اس میں پیدا کیا جائے۔ ہومر (Homer) شاعر اور یونانی ڈرامہ نویس کی دیویاں اور دیوتا چونکہ بشریت سے جُدا نہ تھے اس لیے وہ بھی طبعی تقاضائے فطرت کے ماتحت کام کرتے تھے۔

فحاشی قدیم رومیوں میں

قدیم رومی تہذیب تمدن کی بنیاد زیادہ تر یونانی تہذیب و تمدن ہی پر قائم ہوئی تھی۔ بہت سی باتیں جو جزیرہ نمائے یونان کی جنسی زندگی کے متعلق کہی جا چکی ہیں ان کا اطلاق اطالوی اور سلطنت روم

کی قحبگی پر بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ حالات بدل گئے تھے مگر غلامی کا سلسلہ بدستور جاری تھا اور اخلاق جنسی کا معیار بھی وہی قائم رہا۔

اہل روما زمانۂ قدیم سے نسلاً بعد نسل لنگ کی پوجا کرتے چلے آتے تھے، قدیم یونانیوں اور اہلِ مشرق سے انھوں نے عشق و محبت کی دیوی کی پوجا کرنا سیکھا، چنانچہ رومی دیوی وینس کی وہی خصوصیات ہیں جو یونانی دیوی آفرودیتہ کی تھیں۔ بعض کا قیاس ہے کہ لفظ "وینس" (VENUS) عبرانی لفظ "بنات" سے نکلا ہے جس کے معنی "بیٹیاں" یا "لڑکیاں" ہیں۔ اس لغوی معنی سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مشرق میں "کنیاں کی کٹی" (Maiden's Hut) اور مذہبی مباشرت میں باہم کیا تعلق تھا۔ بائبل کی بہت سی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب بنات اسرائیل اجنبی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگتی تھیں تو وہ حد درجہ بدمستیوں اور سیہ کاریوں میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔

یونان کی طرح روم میں بھی قحبہ خانہ کا دروازہ ہر اُس شخص کے لیے کھلا رہتا تھا جس کے پاس روپیہ ہوتا اور سلطنت روم کے زمانے میں تقریباً ہر شراب خانہ حسن فروشی کا بازار بنا ہوا تھا۔

ہوریس کا خانساماں گاؤں کی زندگی سے گھبرا گیا تو ہوریس نے اپنے خط میں اُسے اس طرح ڈانٹا تھا:۔

"ہم دونوں ایک ہی چیز کو یکساں نظر سے نہیں دیکھتے.......... میں دیکھتا ہوں کہ قحبہ خانے اور شراب خانے تمہارا دل شہر کی طرف کھینچتے ہیں....

یہاں شراب خانے کہاں جو تمہیں شرابیں بہم پہنچائیں۔ نہ یہاں کوئی گانے بجانے والی جس کے ساتھ طبلہ کی تھاپ پر تم کو ناچنا ہو۔"

رومی قحبائیں عموماً وہ عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں اسیر ہو کر آتی تھیں اور ملک شام کی رقاصہ اور مغنیہ عورتیں بھی دریائے ٹائبر کے ساحل سے جہاں رومہ آباد تھا بخوبی واقف تھیں ان میں جملہ اقوام وملل کی عورتیں شامل تھیں اور یہ ہر معاشرتی اور مجلسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس زمانے کے پر تکلف شراب خانوں میں عمدہ کھانے، عمدہ شرابیں، راگ ورنگ اور بھینی بھینی خوشبوئیں جذبات نفسانی کو ہیجان میں لاتی تھیں۔ شرم وحیا کی دیوی "پودی سیتا" (*Podicita*) کے رومہ میں دو مندر تھے لیکن اس مندر میں بھی کثرت سے شہوت رانیاں ہوتی تھیں۔

جب سلطنت روم میں عورتوں اور مردوں کے لیے مشترکہ حماموں کا رواج جاری اور پبلک حماموں میں پیشہ ور عورتیں داخل ہونے لگیں تو بعض لوگ برافروختہ ہوئے۔ اس لیے ان کا عام داخلہ بند کر دیا گیا۔ اگر کوئی جاتی بھی تھی تو خاص اجازت نامہ لے کر جاتی تھی کیونکہ ان کو عام شہریوں جیسے حقوق حاصل نہ تھے۔

قدیم یونان کی طرح روم میں بھی قحبہ خانے کو اہلی زندگی کی پاکیزگی کا معاون سمجھا جاتا تھا۔ زنا سب سے بڑا جرم تھا۔ زانیہ کے شوہر کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنی سیہ کار بیوی کو قتل کر ڈالے۔ اور اس کے بہکانے والے سے جس طرح جی چاہے انتقام لے۔ آخری شہنشاہ روم کے زمانہ میں زنا کے لیے

حکومت کی طرف سے بھی سزائے قتل مقرر کر دی گئی تھی۔

جب کوئی زبردست فتح حاصل ہوتی تھی تو ہزارہا نوجوان لونڈیاں قید ہو کر بازار میں آجاتی تھیں اور جب رومی سپاہی بعض اوقات کسی غیر ملک میں عرصہ تک رہتا تھا تو اس کو تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لیے یا تو کسی پیشہ ور عورت سے ملتفت ہونا پڑتا تھا یا وہ کسی عورت کو اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔

اس زمانہ میں بھی جزائر شرق الہند میں جو ولندیزی فوجیں متعین ہیں ان کے سپاہیوں کو اجازت ہے کہ وہ جزائر کی سانولی عورتوں کو اپنے پاس رکھیں۔

روم کے تمام سرکس، تھیٹر، مذہبی میلے ٹھیلے اور پبلک جلسے مقاصد قحبگی کو پورا کرتے تھے۔ ہر جگہ عورتیں آزادی کے ساتھ بہار حسن دکھاتی تھیں چنانچہ ہوریس (Horace) نے کسبی اور بیوی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرد سوائے چہرے کے اپنی بیوی کا کوئی حصہ جسم نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن کسبی اس کی پروا نہیں کرتی۔ اپنے باریک ریشمی لباس میں وہ مرد کو ایسی ہی نظر آتی ہے گویا عریاں ہے اور اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

روم کے پر بارونق بازار میں پیشہ ور عورتیں لوگوں پر ڈورے ڈالتی نظر آتی تھیں۔ جب شہر روما عروج پر تھا تو اس کی آبادی ۱۵ لاکھ تھی۔ آزاد شہریوں، کاروباری لوگوں، آزاد غیر ملکیوں اور غلاموں کے اجتماع سے شہر میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ بعض محلے ایسے تھے جن میں کسبیوں کی خاص طور پر کثرت تھی۔ یہ مندروں کے آس پاس بھی اسی کثرت سے رہتی تھیں جیسے دیگر مقامات

میں لیکن نیچے درجہ کی ارزاں کسبیاں عموماً شہر کے گردو نواح میں رہا کرتی تھیں سہ پہر کے وقت قحبہ خانے کھلتے تھے اور رات بھر کھلے رہتے تھے۔ رات کے وقت کسبیاں شراب خانوں کی زندگی میں بھی حصہ لیتی تھیں، پرائیویٹ مکانات کے جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور لوگ موسیقی کے مدرسوں میں بھی اسی نیت سے جاتے تھے کہ شاید ان کی نظر انتخاب کسی پر پڑ جائے۔

شہنشاہی کے زمانہ میں شہر روم عیش و عشرت اور بدکاریوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بہت سے مؤرخین کا قول ہے کہ زوال سلطنت کا باعث یہی عیش پرستیاں اور بدمستیاں ہوئیں۔ مانٹسکیو (Montesque) نے لکھا ہے کہ:۔

"روم کے عوام بدترین شہنشاہوں سے … نہیں کرتے تھے۔ جب رومیوں کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی اور ان کے لیے جنگ و جدال کا کوئی مشغلہ نہ رہا تو رومی بدترین قوم بن گئے۔ وہ تجارت و فنون کو غلاموں کا کام سمجھتے تھے۔ حکومت کی طرف سے جو انھیں مفت غلہ ملتا تھا اس کی وجہ سے انھوں نے فن زراعت سے لاپروائی کی اور کھیل تماشوں کے عادی ہو گئے۔ جب شاہ نیرو (Nero) کموڈوس (Coomodos) کالیگولا (Coligolas) (شاہان روم) کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے ان کا ماتم کیا کیونکہ وہ ان کی عیش پرستیوں میں حتی الامکان ہر طریقے سے مدد کرتے تھے اور تمام سلطنت کی دولت ان کے لیے خرچ کر دیتے تھے۔"

وہ بھی کیا وقت تھا جب رومہ کے باشندوں کی اکثریت سرکاری وظائف اور وثیقوں پر زندگی بسر کرتی تھی، کام کرنے کو ان کا دل نہ چاہتا تھا کسبیاں بہت سستی تھیں۔ ذرائع نقل و حمل کی کمی کے باعث تمام آبادی حدود شہر میں گھٹی پڑی تھی۔ گرد و نواح میں جاکر لوگ نہیں بستے تھے۔ غریب نادار لیکن مغرور شہری رومہ کے اندر ہی رہنا پسند کرتے تھے۔

عالمِ تصور میں نقشہ کھینچیے کہ قدیم اطالیہ کی ایک کسبی بھرے بازار میں جہاں خوب چہل پہل ہے، اٹھلاتی ہوئی گزر رہی ہے۔ کسی سے آنکھ لڑائی، کسی کا منھ چڑھایا "کہیں گر گئی، کہیں مر گئی"۔ الغرض چوروں سے، غلاموں سے کاہل شہریوں سے چھیڑ کرتی چلی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ انسان کے قوائے عمل کس درجہ مضمحل ہو جائیں گے۔

بعض اوقات گاؤں یا قصبہ کے کسی معزز آدمی کی لڑکی شہر کی شان و شوکت اور رنگ رلیوں کا حال سن کر گھر سے نکل کھڑی ہوتی تھی اور رفتہ رفتہ صحبت بد کے اثر سے وہ بھی کمانے لگتی تھی۔ الغرض بمقابلہ یونان کے رومہ میں آزاد کسبیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اعلیٰ طبقہ کی رومی کسبیاں یا تو آزاد شدہ کنیزیں ہوتی تھیں یا ان کی اولاد۔ رومہ کی اکثر مشہور کسبیاں ایشیائی نژاد تھیں۔ ان میں بعض ایسی تھیں جو لونڈی کی حیثیت سے لائی گئی تھیں اور بہت سی ایسی تھیں جو بطیب خاطر شہر رومہ یا سلطنت روم کے اور بڑے شہروں میں آبسی تھیں اور اپنا پیشہ کرتی تھیں۔ یونان کی طرح روم میں بھی اعلیٰ طبقہ کی بعض کسبیاں تاریخی کسبیاں بن گئی تھیں۔

ہوریس (Horace) کی کتاب میں ایسی عورتوں کی ایک لمبی سی فہرست موجود ہے۔ ان ناموں میں سے سائنارا (Cynara) لالیجہ (Lalija) لیڈیا (Lydia) اور فلیس (Phyllis) ایسے نام ہیں جنھوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ہمارے خیال میں یہ ان کے اصلی نام نہیں تھے بلکہ لقب یا پیار کے نام تھے یا ایسے نام تھے جو محض پیشہ کی خاطر رکھ لیے گئے تھے۔ قدیم یونان میں بہت سی کسبیوں کا نام لالیجہ (Lalija) ہوا کرتا تھا جس کے معنی ہیں "بچوں کی طرح بھولی بھالی باتیں کرنے والی"۔

لیکن واضح ہو کہ بہت سی کسبیوں کو صرف بھولی بھالی باتیں ہی کرنا نہیں آتا تھا بلکہ وہ بعض اوقات اعلیٰ درجہ کی گویا اور اعلیٰ پیمانہ کی شاعرہ بھی ہوتی تھیں۔ ایسی عورتوں کے لیے ایسے امکانات تھے جو گھر کی بیبیوں اور بیٹیوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتے تھے۔

اس آزادی کے شوق میں رومہ کی بہت سی کتخدا عورتوں نے بھی خود کو خفیہ طور پر آزاد کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض شہنشاہوں کی بیویاں بھی قحبہ خانوں میں جا کر مصروف نشاط ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شہنشاہ کلادیوس (Cladius) کی ملکہ مسالینہ (Messalina) کا نام کافی مشہور ہے۔ اس عورت کو ۴۸ء میں اس الزام پر قتل کر دیا گیا کہ اس نے ایسی حالت میں جب کہ اس کا شوہر شہنشاہ کسی دوسری جگہ مصروف تھا ایک خوبصورت رومی نوجوان سے شادی کر لی تھی۔ جووینل (Juvenal) نے اس شہنشاہ بیگم کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک قحبہ خانہ میں اپنے لیے ہمیشہ

ایک کمرہ مخصوص رکھتی تھی اور ہر رات سر پر سنہری بالوں کی ٹوپی پہن کر لائسکا (Lysisca) کے نام سے قحبہ خانہ میں جاتی تھی۔

رومی قحبہ خانے عبارت تھے کوٹھریوں کی ایک قطار سے جن کے دروازے ایک ہی غلام گردش میں کھلتے تھے۔ ایک ہی قحبہ خانہ میں مرد و عورت دونوں قسم کے عصمت فروش مل جاتے تھے۔ بڑے کمرہ میں بہت سی کسبیاں اور نوعمر لڑکے جمع رہتے تھے جن میں سے ہر شخص کو انتخاب کر لینے کی اجازت تھی۔ ان میں نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں اور ادھیڑ عورتیں بھی جنھیں اس شرم انگیز پیشہ میں مدتیں گزر گئی تھیں لیکن قدیم زمانہ کی مشہور کسبیوں کو اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ قحبہ خانہ میں جا کر عصمت فروشی کریں یا سڑکوں پر کھڑے ہو کر مردوں کو ترغیب دیں۔ ان کی بات چیت نوکروں کے ذریعہ سے ٹھہر جاتی تھی اور گھر بیٹھے دولت پہنچ جاتی تھی۔

بعض قحبہ خانوں کے دروازوں پر کسبیوں اور نوعمر لڑکوں کی فہرست آویزاں ہوتی تھی جس میں ہر ایک کا مختصر حال اور اس کی خصوصیات درج ہوتی تھیں۔ ہر ایک کی خرچی بھی اس فہرست میں درج ہوتی تھی۔ بعض کی خرچی اتنی بڑی ہوتی تھی کہ اسے ایک امیر زادہ ہی ادا کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ علاوہ ازیں جو لوگ آتے جاتے تھے وہ فرمائشیں بھی پوری کرتے تھے۔ تحائف بھی لاتے تھے۔

رومی حماموں میں بعض ایسی بھی تھیں جن میں کسبی لونڈیوں کو فروخت کیا گیا یا کسی مدت معینہ کے لیے ٹھیکہ پر دے دیا گیا۔ بعض مرتبہ اس قسم کے معاملات عدالتوں تک پہنچتے تھے۔

قدیم یونان میں آزاد کسبیوں پر جو ٹیکس لگایا جاتا اس کا حال ہم اوپر لکھ

چکے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں بزمانہ شاہ اسکندر سیویروس (Severus) یہ ٹیکس روم میں بھی جاری کر دیا گیا تھا اور اس طرح جو آمدنی ہوتی تھی وہ سرکس، تھیٹروں اور عام جلسوں پر خرچ کی جاتی تھی۔ گویا عیش پرست کسبیوں سے روپیہ جمع کر کے مزید اہتمام عیش رانی کیا جاتا تھا۔ قدیم زمانہ کی کسبیاں بعض احکام مجسٹریٹ کے ماتحت ہوتی تھیں۔ یہ ایڈائل مجسٹریٹ ہوتے تھے جو لوگوں کے اخلاق کے نگراں رہتے تھے۔ روم کے ایسے مجسٹریٹ جو کسبیوں کے لیے قواعد و ضوابط مرتب کیا کرتے تھے۔ بازاروں اور پبلک حماموں کے بھی انچارج ہوتے تھے۔ روما میں کسبیوں کو ایک خاص امتیازی لباس پہننا پڑتا تھا۔ یہ نہایت زرق برق اور شوخ رنگ ہوتا تھا معزز بیبیاں زیادہ تر سادہ لباس پہنا کرتی تھیں خصوصاً زمانۂ جمہوریت میں سیاہ قبا کسبیوں کا خاص نشان تھا۔ گھر کی معزز بیبیاں ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتی تھیں جس سے ان کے بدن کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ پاؤں تک ڈھکے ہوتے تھے لیکن کسبیاں تنگ چست لباس استعمال کرتی تھیں۔

کسبیوں کو رومی مجسٹریٹوں سے اپنا پیشہ کرنے کے لیے لائسنس لینے پڑتے تھے اور ان کے نام درج رجسٹر کر لیے جاتے تھے۔

شہنشاہی زمانہ میں بہت سے قوانین ایسے تھے جن کی رو سے کوئی خاوند اپنی بیوی سے پیشہ نہیں کرا سکتا تھا اور رومی عورتوں کو بدکاری سے باز رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ ٹیسی ٹس (Tacitus) نے کوشش کی کہ روم کے تمام قحبہ خانے توڑ دیے جائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ واقعہ تیسری صدی عیسوی کا ہے۔ تھیوڈوسیس اعظم (Theodosius The Great) اور ویلنٹینین اول

(Valentinian) نے چوتھی صدی میں سلطنت روم کے اندر قحبگی کا پیشہ قطعی بند کردیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں بھی سلطنت مشرقیہ روم کے شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) نے انسداد قحبگی کا سلسلہ جاری رکھا۔

بت پرست رومیوں میں یہ خیال پہلے ہی سرایت کرچکا تھا کہ بدکاری ایک ناپاک اور شرمناک فعل ہے۔ اگر کوئی کسبی آزاد طبقہ کی ہوتی تھی تو اسے دوسرے شہریوں کے سے حقوق حاصل نہ تھے۔ عدالت میں اس کی گواہی مستند نہ ہوتی تھی اور نہ وہ خرچی کے بارے میں کسی پر نالش کرسکتی تھی۔

روم کے شہنشاہی زمانہ میں رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کسی قحبہ خانہ میں آنا جانا اچھی بات نہیں بلکہ باعث ننگ و عار ہے۔ شریف خاندان کے لوگ یہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ قحبہ خانے میں گھستے ہوئے کوئی انھیں دیکھے اور پہچان لے۔ وہ اگر جاتے تو رات کو جاتے اور چوری چھپے جاتے۔

شہنشاہ آغسطس (Augustus) کے زمانہ میں ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے کوئی رومی کسی کسبی سے شادی نہیں کرسکتا تھا حتی کہ ارکان و اراعیان کے زمرہ کے لوگوں کے لیے تو اس بات کی بھی اجازت نہ تھی کہ کسی کسبی کی لڑکی سے شادی کرسکیں لیکن اراعیان کا کوئی رکن اگر کسی کسبی کو بطور داشتہ گھر میں ڈالنا چاہے تو لیبا کرسکتا تھا۔ بہت کم صورتیں ایسی تھیں جن میں کسی اعلیٰ مرتبہ کے شخص نے کسی کسبی سے نکاح کیا ہو۔ بطلیموس شاہ مصر سے تھائیس کسبی کی شادی کا ذکر ہم کرچکے ہیں۔ شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) نے خود ایک عورت تھیوڈورا (Theodora) سے شادی کی تھی جو بچپن میں سوانگوں اور نقلوں کے اندر ایکٹریس کا کام کیا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ

عورت اپنے فن کی بڑی ماہر تھی اور اس نے تجبہ خانہ کی دوسری لڑکیوں کو بھی تجبگی کے گر اور کرتب سکھا دیے تھے اور پھر اسی تھیوڈورا نے شہنشاہ کے ساتھ مل کر انسداد قحبگی کی کوشش کی۔ لیکن جسٹی نین نے اس عورت سے نکاح کرنے کے قبل قسطنطین کا وہ قانون منسوخ کر دیا تھا جس کی رو سے کسی بلند مرتبہ شخص کو سوانگ بھرنے والیوں اور نقلیں کرنے والیوں سے نکاح کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تھیوڈورا کو حکمراں ملکہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس نے نظم و نسق سلطنت میں بہت اہم حصہ لیا۔

فحاشی اور ہندوستان قدیم

قدیم روم، یونان، فینیقیہ، آشوریہ، بابل، فلسطین اور مصر کی بے سروپا روایات یا خرافیات سے ناظرین کرام کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ فحش کی ابتداء مذہب کی آڑ میں ہوئی تھی۔ اسی طرح ہندوستان قدیم کی دیو مالا (Mythology) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی فحاشی کی ابتداء اسی نوع کی مذہبی روایات سے ہوتی ہے۔ اگر ان روایات کا مطالعہ منظور ہے تو دیانند سرسوتی کی "ستیارتھ پرکاش" ملاحظہ کیجیے۔ جس میں بہت سے اسی نوع کے قصے درج ہیں اور جن کو پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ان روایتوں کو کیوں کر ہندو قوم نے اس وقت تک گوارا کیا اور ان کے ہوتے ہوئے ایک شخص ان کے مذہب، معاشرت اور تہذیب و اخلاق کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتا ہے۔

فحاشی قرونِ وسطیٰ میں!

قرونِ وسطیٰ سے مراد وہ زمانہ ہے جو سلطنت روما کے زوال سے شروع ہو کر کولمبس کی دریافت امریکہ پر ختم ہوتا ہے اور اس دور میں موضوع زیر بحث کے لحاظ سے تین باتیں قابل اعتبار ہیں۔ ایک تو یورپ کا دین مسیح قبول کرنا۔ دوسرے آتشک یا "آبلۂ فرنگ" کا ظہور۔ تیسرے علوم و فنون کا احیاء اور کلیسائے مسیحی میں افتراق و انشقاق۔

تاریخ یورپ کو تین علیحدہ علیحدہ نمایاں حصوں میں تقسیم کرنا تو یقیناً مشکل ہے کیونکہ بہت سی باتیں جو قدیم روما میں پائی جاتی تھیں ان کا اثر قرونِ وسطیٰ میں بھی بدستور قائم رہا اور بہت سے اوارے جو قرونِ وسطیٰ کی ابتداء میں ظہور میں آئے تھے وہ بعد کو احیاء علوم و فنون اور اصلاحات مذہبی کے زمانہ میں بھی باقی رہے۔

رمیولس آگسٹولس (Romulus Augustols) کے معزول ہونے یعنی ۴۷۶ء کے بعد سے امریکہ کی دریافت تک (۱۴۹۲ء) دس صدی کا زمانہ ایسا گذرا ہے جب حالات بہت تغیر پذیر تھے اور بعض مورخین اس زمانہ کی پہلی چھ صدیوں کو "دورِ تاریکی" سے تعبیر کرتے ہیں اور پچھلی چار صدی کے زمانہ کو "قرونِ وسطیٰ" سے درآنحالیکہ اس وقت بھی فن تعمیر و مصوری، ادب

فلسفہ میں جو جو ترقیاں ہوئیں وہ بہت کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔

فحاشی اور اثراتِ مسیحیت

جس طرح آج کل کے یوروپین بچے بلحاظ قومیت انگریز، فرانسیسی یا جرمن پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرون وسطیٰ میں زن و مرد رومن کیتھولک پیدا ہوتے تھے یعنی جس طرح آج کل کوئی "دلدادۂ نوضویت" Anarkists اپنے سیاسی خیال کی وجہ سے خود کو حکومت کے ٹیکسوں سے مستثنےٰ نہیں سمجھ سکتا اسی طرح وہ لوگ بھی مذہبی پابندیوں سے نہیں بچ سکتے تھے خواہ ان کے دل میں مذہب کی کوئی وقعت ہو یا نہ ہو۔ عیسائی ممالک میں جو معدودے چند غیر مسیحی خصوصاً یہودی اور مسلمان رہتے تھے، انھیں کامل حقوق شہریت حاصل نہیں تھے۔ عموماً ان لوگوں سے اُس وقت تک رواداری برتی جاتی تھی جب تک جذبۂ حرص و آز یا مذہبی تعصب ان لوگوں کو قتل یا ملک سے خارج نہ کرا دیتا تھا۔

بایں ہمہ عہد نامہ جدید (مجموعۂ اناجیل) کے پڑھنے سے ہم کو اس بارے میں بہت ہی کم معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی فی الحقیقت کس قسم کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سینگر نے نہایت صحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ:-

"تعلیم مسیحیت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پاکدامنی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ حواریین مسیح پارسائی کو ایک اخلاقی اور مذہبی فرض کہتے تھے اور جس جوش و خروش کے ساتھ وہ بت پرستی کے خلاف وعظ کہا کرتے تھے اسی طرح وہ فحاشی کی بھی برائیاں کیا کرتے تھے۔"

لیکن بایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی مذہبی جماعت قحبہ خانوں کی بھی سرپرستی کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بعض بڑے بڑے مقدس و متبرک مقامات میں بھی قحبہ خانے پائے جاتے تھے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اول اول مسیحیت پر "ایشینی" یہودیوں (Essenes) کی تعلیمات اور رسم و رواج کا بڑا اثر پڑا تھا۔ یہ جماعت اشتراکیت پسند تھی۔ سب لوگ مل جل کر رہتے تھے اور اپنی زندگی ہاتھ پاؤں کی محنت سے بسر کرتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا یہ لوگ لذاتِ نفسانی سے محترز رہتے تھے حتیٰ کہ اپنی یہودیوں سے بھی صحبت نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کی پارسائی سے ان پر اسرار آسمانی منکشف ہو جائیں گے اور اس طرح بہت جلد نزولِ مسیحا ظہور میں آئے گا۔ درحقیقت یہ لوگ اکثر سن رسیدہ اور معمّر ہوتے تھے جن میں جذباتِ نفسانی کی طاقت زائل ہو چکی ہوتی تھی۔ لیکن یہودیوں کی عام تعلیم یہ تھی کہ شریعت موسوی کے مطابق شادی بیاہ کر کے نسل بڑھاؤ۔

اس شوق میں کہ یسوع مسیح کی آمد ثانی جلد از جلد ظہور میں آجائے۔ ابتدائے زمانہ کے عیسائیوں کے دل ترک ازدواج پر مائل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یسوع نے اپنے معتقدین کو تنبیہ کی تھی کہ "جب تک تمہارا زہد و اتقاء فقیہوں اور فریسیوں سے فائق نہ ہوگا تم ہرگز بہشت کی سلطنت میں داخل نہیں ہو سکو گے"۔ یہ ایشینی (Essenes) یہودی بھی فریسیوں (Pharisus) کی ایک شاخ تھے جو تمام عوائد و رسوم کے نہایت سختی کے ساتھ پابند تھے۔ یسوع

نے جو وعظ پہاڑی پر کہا تھا اس میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ:-

"تم نے سُنا ہو گا کہ پُرانے زمانے کے لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ
تو زِنا نہ کر۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جو شخص کسی عورت کی طرف بُری نگاہ سے
دیکھے گا وہ اپنے دل میں اس عورت سے زِنا کر چکا۔"

بایں ہمہ عہد نامہ جدید (یعنی مجموعۂ اناجیل) سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع قوانین کی سختی کے خلاف تھے اور اس صورت میں وہ گویا "ایسینوں" کے حلقہ سے باہر تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے بعض ادارات کے لیے یسوع کی وہ تعلیم جس میں گنہگاروں کو مزید گناہ سے بچانے کے لیے ہدایت کی گئی ہے نہایت اہمیت رکھتی ہے:-

"تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ اگر کسی شخص کے پاس سو بھیڑیں ہیں اور
اُن میں سے ایک کہیں بھٹک جائے تو کیا وہ بقیہ ننانوے بھیڑوں کو چھوڑ کر
پہاڑوں میں نہیں جاتا اور وہاں گم شدہ بھیڑ کو تلاش نہیں کرتا۔ اور
اگر وہ بھیڑ اُسے مل جاتی ہے تو یقیناً میں تم سے کہتا ہوں کہ اُسے
اِس بھیڑ کی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ اِن ننانوے بھیڑوں کی نہیں
ہوتی جو گُم نہیں ہوئی تھیں۔"

ہر چند اوّل اوّل جو لوگ عیسائی ہوئے تھے ان میں اکثر اسی یہودی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور انھیں لوگوں نے مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کو نمایاں طور پر رُہبانیت کے رنگ میں رنگا تھا۔ تاہم یہ بات کہ یسوع انھیں ایسینی یہودیوں میں سے تھے یا نہیں ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ بہرحال اس میں

کلام نہیں کہ یسوع بدکاری اور فحاشی کے خلاف تھے اور وہ فحبہ خاتون کے قیام کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور جس طرح قدیم زمانہ کے یہودی کسی فاحشہ کا نام سنتے ہی کانپ جاتے تھے اسی طرح یسوع لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔

یسوع نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ خداوند کی خاطر لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ بیٹھیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"جو کوئی شخص اپنی بیوی کو حرام کاری کی سوا اور کسی وجہ سے چھوڑ دے اور کسی دوسری عورت سے شادی کر لے تو وہ زنا کرتا ہے اور جو شخص اس چھوٹی ہوئی عورت سے شادی کرے گا وہ بھی زنا کرے گا۔"

یہ عبارت یقینی ذو معنی ہے کیونکہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے مگر اس لیے نہیں کہ دوسری عورت سے شادی کرے بلکہ بقیہ عمر مذہبی تجرد میں بسر کرنے کے لیے۔ مگر اس قسم کا نتیجہ نکالنے کے لیے ہمارے پاس کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ یسوع نے یہودی مفکرین کی ایک جماعت کا یہ قول قبول کر لیا تھا کہ جب مرد و عورت باہم مل کر یک جسم ہو جائیں تو انھیں ہرگز علیحدہ نہ کیا جائے تاکہ ان سے زنا نہ صادر ہو۔

یادریوں نے اپنی رہبانیت اور تجرد کے لیے حسب ذیل قول بھی نقل کیا ہے جو یسوع سے منسوب کیا جاتا ہے:۔

"سب مرد اس قول کو قبول نہیں کر سکتے سوائے ان کے جن سے یہ بات کہی جاتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں بعض لوگ مخنث ہیں جو ماں کے پیٹ سے

اسی طرح پیدا ہوئے تھے اور بعض مخنث ایسے ہیں جنہیں لوگوں نے ایسا بنا
دیا ہے اور ایسے بھی مخنث ہوں گے جنہوں نے بہشت کی بادشاہت
کی خاطر خود کو خصی کر لیا ہے۔ اب جو اس قول کو مان سکتا ہو وہ مان لے۔"

چونکہ قرونِ وسطیٰ کے عیسائی پادریوں نے، بعض خاص صورتوں سے قطع نظر خود کو جسمانی طور پر کبھی خصی نہیں کیا تھا اس لیے یہ الفاظ ہمارے موضوع کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ رومن کیتھولک کلیسا نے ابتداء ہی سے یہ بات منظور کر لی تھی کہ کوئی مذہبی آدمی بیوی نہ کرے اور جائز بچے نہ جنوائے لیکن اس حکمِ امتناعی کو صدیوں تک پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ اس "پادریانہ پارسائی" کا خیال از اخیرہ قرونِ وسطیٰ میں بالکل فراموش ہو گیا تھا اور کبھی کبھی کسی جدید پیر یا ولی کی پیروی کے جوش میں ضرور ابھر آتا تھا۔ لیکن جب کلیسائے رومن کیتھولک کی طرف سے اصلاحاتِ مذہبی کا جواب دیا جانے لگا تو اس خیال نے پھر اہمیت حاصل کر لی اور اس کا سلسلہ ابھی تک اُن لوگوں میں جاری ہے۔

یسوع سے سوال کیا گیا کہ اگر عورت زنا کرتی ہوئی پکڑی جائے تو اس سے کیا سلوک کیا جائے تو یسوع نے جواب دیا کہ:-

"وہ شخص جو تم میں معصوم ہے وہ سب سے پہلے اس عورت کو پتھر مارے"

یہ سنتے ہی تمام الزام لگانے والے وہاں سے باہر نکل گئے۔ ایک بھی باقی نہ رہا جو اس گنہگار عورت کے خلاف گواہی دے۔ کیا اس زمانہ میں سلطنت یہودیہ کی اصلی حالت یہی تھی؟ کیا ان کے تمام مرد قانونِ اخلاق

کی خلاف ورزی کرنے کے مجرم تھے؟ یا وہ یہ خیال کرتے تھے کہ بڑے سے بڑا نیک پارسا آدمی بھی کسی نہ کسی طرح گناہ سے ملوث ہو جاتا ہے؟ چونکہ یوحنا کا بیان بالکل روایتی معلوم ہوتا ہے اس لیے زیادہ قابل توجہ نہیں۔ تاہم قرون وسطیٰ کے نیک عیسائیوں کے نزدیک یہ تمام باتیں سچی اور تاریخی تھیں۔

پولوس کی تعلیم یسوع کی تعلیم سے بہت مختلف معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً وہ خیال کرتا تھا کہ تمام بنی نوع انسان ذلیل ہیں، اس کے نزدیک گناہ اور شریعت موسوی دونوں ایک چیز تھیں۔ اس نے تمام "قوانین مروجہ کی تعمیل کرنے کی کوشش کی لیکن سب میں خامیاں پائیں۔ اسی باعث وہ آخر میں یہ خیال کرنے لگا کہ قانون شیطان کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ وہ صرف ایمان پر زور دیتا تھا اور کہتا تھا کہ ایمان نکوکاری سے بھی افضل ہے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اگر لوگ یسوع پر ایمان لے آئیں تو ان کی روح میں جدید زندگی پیدا ہو جائے گی اور اس طرح ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

پولوس کے نزدیک اگرچہ یہ تعلیم گناہ کے لیے فتوائے جواز نہیں تھی لیکن بعد کو بہت سے عیسائی اس کے یہی معنی لینے لگے۔

عیسائیوں کے مذہبی اجتماعات میں عورتوں کا رجحان طبیعت کسی قدر یہ ہوتا تھا کہ وہ مردوں کے برابر درجہ حاصل کریں لیکن اس معاملہ میں پولوس کی رائے کچھ اور تھی۔ وہ کہتا ہے:۔

"میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر عورت کا سر مرد ہے اور ہر مرد کا سر مسیح ہے اور مسیح کا سر خدا ہے۔ جو مرد اپنا سر ڈھانک کر عبادت کرتا

ہے وہ اپنے سر کو بے عزت اور ذلیل کرتا ہے اور ہر عورت جو ننگے سر
ڈھکے بغیر عبادت کرتی ہے وہ اپنے سر کو ذلیل کرتی ہے۔"

پولوس نے مردوں کو یہ بھی سکھایا کہ وہ عورتوں کو ہاتھ نہ لگائیں اور بچے نہ پیدا کریں کیونکہ گوشت پوست کی تمام چیزیں جلد فنا ہو جائیں گی۔ صرف روحانی چیزیں باقی رہ جائیں گی۔ شادی بیاہ محض اس خیال سے جائز قرار دیا گیا تھا کہ فحاشی بند ہو جائے۔ چنانچہ پولوس کہتا ہے کہ:-

"دوزخ میں جانے سے یہی بہتر ہے کہ انسان نکاح کرلے۔"

حالانکہ اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ سب لوگ ناکتخدا اور پارسا بنے رہیں۔

عہد نامہ جدید درحقیقت مختلف مصنفین کی آراء کا مجموعہ ہے جو مطمحِ نظر اور تجربہ میں بہت کچھ فرق رکھتے تھے۔ اور اسی لیے اس میں بہت سی عبارتیں ایسی ہیں جن کے کئی کئی معنی ہو سکتے ہیں اور ہر قسم کی تعلیم کی تائید و حمایت میں بائبل کے اسناد مل جاتے ہیں۔ چنانچہ پولوس کے ایک خط میں لکھا ہے کہ:-

"میں نے تم کو ایک خط اس ہدایت کے ساتھ لکھا تھا کہ تم بدکاری کی
صحبت میں نہ رہو۔ یہی نہیں کہ تم اس دنیا کے بدکاروں کے ساتھ نہ رہو۔ بلکہ
بندگانِ حرص و آز، بت پرستوں اور استحصال بالجبر کرنے والوں کی صحبت میں
بھی نہ رہو۔ ورنہ تم کو اس دنیا سے نکل جانا ہوگا۔"

مگر سینٹ اگسٹائن کہتا ہے کہ:-

"کسبیوں کے پیشہ کو نہ روکو ورنہ شہوت رلیاں تمام سوسائٹی کو تہ و بالا کر دیں گی۔"

سنہ ۵۸۵ء میں کلیسائے مسیحی کی ایک مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک عیسائی کیلئے

یہ بات مناسب ہے کہ وہ کسی ایک عورت کے ساتھ رہے، خواہ وہ عورت اس کی بیوی ہو یا نہ ہو۔ آگسٹائین کا خیال یہ تھا کہ مسیحی گرجا میں کسبی کو نہ آنے دیا جائے تاوقتیکہ وہ اپنا پیشہ ترک نہ کر دے لیکن اس معاملہ میں قرونِ وسطی کے بہت سے علمائے دینیات نے اس کا تتبع نہیں کیا۔ پھر بھی سولھویں صدی میں ٹرنٹ کی مجلس نے اسی قسم کا حکم دیا۔

پانچویں صدی میں ایلویرہ (Elvira) کی مجلس نے کسبیوں اور قرم ساقوں کو خارج از دین کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس مجلس نے یہ حکم بھی دیا کہ جو کسبیاں کسی عیسائی سے نکاح کر لیں انھیں عشاء ربانی میں شامل ہونے دیا جائے۔ اس کے بعد بہت سی مجلسوں نے ان کے وجود کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ ۱۴۳۱ء میں بمقام باسلے ایک مقتدائے دین مسیحی نے ایک مضمون پڑھا جس میں یہ بحث پیش کی کہ یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے لوگوں کے اخلاقِ حسنہ قائم رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کی صدی یعنی دورِ جدید کے آغاز میں میلان کی مجلس نے ان کو حکم دیا کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنا کریں جس پر سنہری یا روپہلی کلابتوں یا ریشم کی کوئی کشیدہ کاری نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ ایک محلے میں رہا کریں۔ گرجاؤں کے قریب بود و باش اختیار نہ کریں اور ہوٹلوں اور سراؤں میں بھی نہ آئیں۔

عیسائیوں میں بعض ایسے فرقے پائے جاتے تھے جن پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مذہب کے نام سے سیہ کاریاں کرتے ہیں۔ چنانچہ نکولائی فرقہ کے عیسائی کہتے تھے کہ جو لوگ بخشش کے طلبگار ہوں ان کے لیے گناہ کرنا لازم ہے

پیروانِ آدم (Adamite) اور مریدانِ قابیل (Coinites) کی طرح یہ بھی مذہبی اغراض کے لیے اشتراک فی النسواں کے قائل تھے بہت سے فرقے اِس امر پر اصرار کرتے تھے کہ جب کسی مرد یا عورت کو عوام کے سامنے بپتسمہ دیا جائے یا جب کوئی مرد یا عورت عبادت میں مصروف ہو تو اُسے لازم ہے کہ کپڑے اُتار ڈالے۔ شرم وحیا کی بعیت چڑھانے کا عقیدہ جو بہت سے مشرقی مذاہب میں اس قدر اہم تھا وہ بھی وقتاً فوقتاً بندگانِ مسیح میں پیدا ہو جاتا تھا۔

جب یورپ میں دینِ مسیحی پھیلا تو زمانۂ بُت پرستی کے بعض عیاشی دیوتاؤں کو بھی فراموش نہیں کیا گیا اور ان میں سے بعض کو اولیا اللہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ جو دن ان کی پوجا کے لیے مقرر تھے ان میں "لنگوں" کے جلوس نکالے جاتے تھے سینٹ ویلنٹائن (St. Velentine) عشق ومحبت کا سرپرست سمجھ کر اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں تمام یورپ کے اندر پرایپس (Priapus) دیوتا کے بُت موجود تھے جس کا حال اس سے قبل کسی جگہ لکھا جا چکا ہے۔ ان تقریبوں میں نہایت فحش ناچ گانے "مقدس کنواری" (مریم صدیقہ) کے نام سے ہوتے رہتے تھے۔ بعض عیسائی قومیں ایسی بھی تھیں جن میں ایامِ بُت پرستی کے دیوتاؤں کی اُن کے اصلی ناموں کے ساتھ پوجا کی جاتی تھی چنانچہ وینس، "بن دیویاں" اور "جل دیویاں" نہ صرف عیسائی شعراء کی نظموں بلکہ عوام کے خیالات میں بھی بدستور موجود تھیں۔

قرونِ وسطیٰ کی کسبیاں عام طور پر "مریم کنواری" کی پرستش کرکے

دُعا مانگا کرتی تھیں کہ رات کو ان کی خوب کمائی ہو۔ یہ اس غرض کے لیے مذہبی تعویذ گنڈے بھی استعمال کرتی تھیں۔

قرونِ وسطیٰ میں اس امر کی بھی کوشش کی گئی کہ ان عورتوں سے توبہ کرائی جائے۔ چنانچہ تیرھویں صدی میں ایک جماعت ان کی جرمنی میں ایسی قائم ہوگئی تھی اور اُس کا نام "تائبات سینٹ مریم میگڈلینی" تھا۔ اس طبقہ کی بے شمار "خواہروں" کے لیے تمام جرمن ریاستوں میں بہت سی "زنانہ خانقاہیں" تعمیر کی گئی تھیں جن کا خرچ کچھ ان عورتوں کی بھیک سے اور کچھ مختلف اسقفوں کے عطیات سے چلتا تھا۔

ان توبہ خانوں میں کام کرنے پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا کہ ان "بہنوں" کی طبیعت لذاتِ نفسانی کی طرف مائل نہ ہو۔ جہاں ایک مرتبہ کوئی کسبی تائب ہوکر داخلِ خانقاہ ہوجاتی تھی تو پھر اُسے بعد اختتام سال یا بعد مدت مقررہ ابتدائی خانقاہ سے باہر نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس طبقہ میں دوشیزہ لڑکیاں اور دیگر عورتیں بھی جنھوں نے یہ پیشہ کبھی نہیں کیا تھا داخل کی جانے لگیں اور ان عورتوں کو بجائے "تائبات یا خواہران میگڈیلینی" کے "سفید بہنیں" کہنے لگے۔

تیرھویں صدی میں ملک فرانس میں بھی "تبات اللہ" (Daughters of God) کا ایک طبقہ قائم کیا گیا۔ اس کے اغراض و مقاصد بھی یہی تھے کہ کسبیوں کو مذہبی زندگی میں لایا جائے۔ تمام یورپ جگہ جگہ ایسے

راہبہ نما نے تعمیر ہو گئے تھے جن میں وہ گنہگار عورتیں داخل ہوتی تھیں جو تارک الدنیا ہونا چاہتی تھیں۔

بہت سی کسبیاں ایسی پناہ گاہوں یا مکانوں میں داخل ہو جاتی تھیں جو خصوصیت کے ساتھ مذہبی نوعیت نہیں رکھتے تھے۔ ان مکانوں میں قدرتاً ایسی عورتیں آ کر داخل ہوتی تھیں جن کے لیے سن رسیدگی کے باعث کام چلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ میکڈیلینی خانوں کا خرچ وہ عیسائی اُٹھاتے تھے جو خود کو یسوع مسیح کے اُسوۂ حسنہ کا پابند سمجھتے تھے۔ بعض اوقات مذہبی جوش میں مبتلا ہو کر ان گھروں میں کسبیاں بھی داخل ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب وہ اس زندگی کی یکسانیت سے گھبرا جاتی تھیں تو پھر باہر نکل کر اپنا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں۔ ان باتوں کی وجہ سے بعض ادارے ایسی کسبیوں کو اپنے ہاں جگہ نہیں دیتے تھے جو پہلے داخل ہو کر نکل گئی تھیں۔ بہت سی عورتیں ایسی بھی پھرتی تھیں جو یہ کہہ کر بھیک مانگتی تھیں کہ وہ اپنی گناہ گارانہ زندگی ترک کر دینا چاہتی ہیں اسی کے ساتھ فحاشی سے بھی اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیتی تھیں۔

قحبہ خانوں کے سب سے اچھے سرپرست عموماً پادری اور راہب خیال کیے جاتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں شہروں اور قصبوں کے اندر ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور غالباً ان میں بہت کم ایسے تھے جو حقیقی طور پر راہبانہ زندگی بسر کرنے پر مائل تھے۔ چونکہ یہ لوگ جائز طور پر شادی کر کے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو پورا نہیں کر سکتے تھے اس لیے

یا تو وہ گھر میں کوئی عورت ڈال لیتے تھے یا فحاشی کرتے تھے۔ بہت سے مقامات میں ایسے قانون رائج تھے جن کی بنا پر کوئی مذہبی آدمی قحبہ خانوں میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ لوگ بجائے وہاں جانے کے خود وہاں کی عورتوں کو اپنے پاس بُلا لیتے تھے۔

گناہوں سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت سمجھی جاتی تھی کہ گنہگار اپنے بدن پر کوڑے کھائے۔ اس رسم سے پادری صاحبان کو کافی موقع مطلب برآری کا مل جاتا تھا۔ جو پادری اقرار معصیت سنتا تھا وہ اس بات پر ہمیشہ زور دیتا تھا کہ خفیف سے خفیف گناہ کے لیے بھی جسم پر تازیانے کھائے جائیں۔ عورتوں کا جسم چونکہ نازک ہوتا ہے اس لیے یہی عموماً تازیانے چلا کر کے پُر گوشت حصّہ پر لگائی جاتی تھی اور چونکہ سزائے تازیانہ سے گنہگار کی تذلیل مقصود ہوتی تھی اس لیے بعض اوقات جسم سے کپڑا دور کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔

خانقاہوں اور راہبہ خانوں میں راہبوں اور "کنواریوں" پر دستر بدکاری کی وجہ سے کوڑے پڑتے تھے بلکہ محض "جلال ربانی" ظاہر کرنے کے لیے بھی کوڑے برساتے تھے ــــــــ گیارھویں صدی میں ایک راہب ڈامیانی (Damiani) نے تازیانہ زنی کے لیے ایک خاص مذہبی طبقہ قائم کیا تھا جس میں ہر طبقہ کے آدمی شامل ہو کر اپنے جسموں پر کوڑے مارتے ہوئے بصورت جلوس نکلتے تھے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی مصیبت مثلاً قحط یا وبا

نازل ہوتی تھی تو ہزاروں آدمی ان مظاہروں میں شریک ہو جاتے تھے اور بڑی بیدردی سے ایک دوسرے پر کوڑے برساتے تھے۔ یہ لوگ کوڑے کھاتے کھاتے کچھ ایسے مشتاق ہو جاتے تھے کہ وہ اپنے جسموں پر ہر قسم کی سزا برداشت کر لیا کرتے تھے اور جب ان لوگوں کا مذہبی جوش بھڑک اٹھتا تھا تو وہ یہودیوں اور مفروضہ ملحدوں کو مار ڈالتے تھے۔

اسی سلسلہ میں فرقۂ مریمیہ بھی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے بہت سے متفکرین ایسے گزرے ہیں جو عورتوں سے سخت نفرت کرتے تھے وہ پولوس کے ہمخیال تھے کہ عورت مرد سے کم درجہ پر ہے اور اس کی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ابتدائی گناہ کی ذمہ دار حوا تھیں۔ اس وقت عورتوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک ملکوتی اور دوسری شیطانی یعنی عورتیں یا تو شیطان کا آلۂ کار ہیں یا مریم کی کنیزیں ہیں کسبیاں قسم اول میں اور راہبہ عورتیں قسم دوم سے تعلق رکھتی تھیں جو عورت کسی کی معشوقہ ہوتی تھی وہ تو گویا کنیز مریم تھی مگر گھر کی غریب بیوی بے چاری شیطانی قوتوں کی مالک ٹھہرائی جاتی تھی۔ الغرض ان خیالات میں خوب مضحکہ انگیز ترقی ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ عشق و محبت ایک روحانی اور آسمانی جذبہ ہے اور نکاح ایک مقدس معاہدہ ہے۔ لہذا اس کا تعلق کسی ناپاک شہوت نفسانی یا کسی ایسے جذبہ سے نہ ہونا چاہیے جس کی بنیاد خواہشات جسمانی پر ہو۔

بہت سے شعراء کا خیال یہ تھا کہ عورت کو اگر کوئی چاہے تو فقط دو

سے چاہیے۔ لہٰذا کسی دوسرے مرد کی بیوی پر عاشق ہونا اور عاجزانہ طور پر اُس کی خدمت کرنا مناسب اور اچھا سمجھا جاتا تھا۔ جرمنی اور فرانس کے شعراء اس بات کی تصویر نہایت نفاست اور عمدگی سے کھینچتے تھے کہ کوئی بھلا آدمی کسی حسینہ کے سامنے دست بستہ دو زانو بیٹھا ہے۔ اس کی محبت قطعی بے لوث ہے اور وہ اس مہ جبیں کی خدمت غلاموں کی طرح بجا لاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ایک کھیل تھا اور اصلی مقصد یہ تھا کہ عورت کا شوہر جب تک کوئی ناشائستہ حرکت نہ دیکھے اُس وقت تک اس قسم کی عشق بازی پر معترض نہ ہو لہٰذا اس طریقہ پر عورت کی پرستاری قطعی بے لوث اور صحیح سمجھی جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی "عشق بازی" طبقۂ امراء میں زناکاری بن گئی۔

ہر چند یہ "عشق بازی" "بڑے لوگوں" کا کھیل تھا۔ لیکن اس کا اثر طبقۂ اوسط اور کسانوں پر بھی ہوا۔ یعنی مرد اپنی عورتوں کو بخیال ادب آموزی زد و کوب کرتے تھے اور پھر خود ہی "مقدس کنواری" یا "وینس" (عشق و محبت کی دیوی) کے نام سے اپنی معشوقۂ دلنواز کے ہاتھوں جوتیاں کھاتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں رفتہ رفتہ یہ خاص فن بن گیا تھا اور تکلیف و تذلیل ہمیشہ تازیانہ ہی کے ذریعہ سے نہ ہوتی تھی بلکہ اظہارِ عشق و محبت کا ایک معمولی طریقہ یہ بھی تھا کہ مرد اپنی محبوبہ کا ایک پھٹا ہوا کثیف کرتہ خود پہن لیتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کی سحر و ساحری میں بھی مختلف قسم کے جنسی یا شہوانی عناصر شامل تھے۔ اوّل ہر وہ عورت جسے دیکھ کر جذباتِ نفسانی مشتعل ہو جاتے تھے۔ اس میں شیطانی قوتیں سمجھی جاتی تھیں۔ عام خیال یہ تھا کہ انسان کا جسم

ناپاک اور اس کی روح پاک ہے۔ لہٰذا جس عورت کو دیکھ کر شہوت بھڑکے وہ ضرور بالضرور شیطان کا آلۂ کار ہے۔ جب کوئی مقدس راہب کسی عورت کو دیکھ لیتا تھا تو فوراً بھاگ جاتا تھا تاکہ شیطان کے مکر و فریب میں نہ پھنس جائے اس زمانہ میں بھی یونان کے ایک جزیرہ میں راہبوں کا ایک صومعہ ہے جہاں عورت کو اندر جانے نہیں دیا جاتا اور کچھ دن پیشتر تو یہ حالت تھی کہ بلیاں اور دوسرے مادہ جانور اس جزیرہ سے باہر نکال دیے جاتے تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں جن سحر پیشہ لوگوں پر مقدمات چلا کر انھیں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ ان میں مرد جادوگر بہت کم تھے۔ ایسی بڑھیا عورتوں سے جو مکروہ صورت ہوں لوگ بہت ڈرتے تھے۔ کیونکہ ان کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ دور ہی سے لوگوں کو زہر دے دیتی ہیں، چھری مار دیتی ہیں اور لوگوں پر موہنی کر کے انھیں دامِ محبت میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ ایسی عورتیں سوسائٹی کے اس طرزِ عمل سے واقعی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھنے لگتی تھیں اور رات کو جنگلوں میں جمع ہو کر جلسہ کرتیں اور مختلف قسم کی خلاف وضع فطری حرکتیں کرتیں۔ اس زمانہ میں بہت سی عورتوں کو جادوگرنی سمجھ کر جو قطعی بے ضرر تھیں زندہ جلا دیا گیا۔

اگرچہ یہ بتانا دشوار ہے کہ سحر و ساحری اور حرام کاری میں اصلی تعلق کیا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی تعلق ہوگا وہ نہایت اہم ہوگا۔ ڈاکٹر ڈسینجر کا خیال ہے کہ پادری اور راہب اکثر ہفتہ میں ایک دن ناشائستہ حرکات کے لیے وقف کر دیتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ ان محافل میں جادوگرنیاں بھی شہوت رانی کے مختلف طریقے سیکھتی تھیں اور دوسروں کو سکھاتی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے اندر کیولوں اور عفریتوں کا

جو عقیدہ تھا بسا اوقات اِس سے بھی خوب مقصد براری ہوتی تھی۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ رات کے وقت لوگوں کے گھروں میں عفریت آتے ہیں اور اکثر دوشیزہ لڑکیوں سے ملتفت ہو کر انھیں حاملہ کر دیتے۔ درآنحالیکہ یہ عفریت انسانوں کے علاوہ اور کوئی نہ ہو سکتے تھے۔

مجلسی و معاشرتی حالات

یورپ میں قرونِ وسطیٰ کی زندگانی کا مدار زیادہ تر زراعت و فلاحت پر تھا۔ اگرچہ بعض مصنوعات میں بھی کافی ترقی ہو گئی تھی لیکن یہ چیزیں عموماً چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں بنتی تھیں لوگ گاؤں ہی میں زیادہ تر بود و باش رکھتے تھے اور عموماً ایک ہی مزرعہ میں ضرورت کی تمام چیزیں پیدا کر لی جاتی تھیں۔

کسان لوگ تعلقہ دار یا زمیندار کو اپنا محافظ و نگہبان خیال کرتے تھے اور اس حفاظت کے معاوضہ میں ہر ہفتہ دو تین دن تعلقدار کی خدمت مفت کیا کرتے تھے اِس خدمت کے سلسلہ میں ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ جب وہ اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے تھے تو تعلقہ دار کو ایک خاص رقم ادا کرتے تھے۔ یہ رقم غالباً زمیندار کے اس حق کا معاوضہ تھا جو عروس کی شبِ اوّلین پر اس کو حاصل تھا۔ رفتہ رفتہ زمیندار کی قوت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ غریب کسان کی لڑکی سے بھی لطف حاصل کرتے اور رقم بھی وصول کرتے۔

چونکہ اُس وقت فنِ زراعت نہایت ہی ابتدائی حالت میں تھا اس لیے ان بے چارے زرعی غلاموں کے پاس شاذ و نادر ہی اتنی دولت جمع ہوتی تھی کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ علاوہ ازیں ان کی اراضی کا کچھ حصہ

(خصوصاً جنگل اور چراگاہ) مشترک ہوتا تھا اور ان کا بہت سا وقت میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں لگ جاتا تھا۔

یہ اپنی غربت کی وجہ سے نہ سامانِ تعیش پر کچھ صرف کر سکتے تھے نہ کہیں باہر سیر و سیاحت کے لیے نکلتے تھے لیکن اِس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ ان کی اخلاقی حالت شہری لوگوں سے بہتر ہوتی تھی۔

قرونِ وسطیٰ کے اوائل میں یورپ کے اندر صرف چند شہر تھے اور جو تھے بھی تو ان میں اکثر رومیوں کے بسائے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ جب کاروبار اور تجارت کو ترقی ہوئی تو بہت سے مقامات نے بڑھتے بڑھتے اہمیت حاصل کر لی۔ ورنہ پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ بھر میں ایک درجن سے بھی کم ایسے شہر موجود تھے جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زائد ہوگی اُس وقت لندن کی آبادی ۳۵ ہزار۔ وائنا کی ۵۰ ہزار خیال کی جاتی تھی پیرس اور اطالیہ کے بعض شہر کسی قدر بڑے تھے اور مشرق میں قسطنطنیہ اور بعض دیگر شہر واقعی بڑے شہر تھے جن کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ لہٰذا اِن بڑے شہروں کی معاشری حالت اُن شہروں سے قطعی مختلف تھی جن سے اس وقت ہمارا خاص تعلق ہے۔

مغربی یورپ کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں سوداگروں اور اہلِ حرفہ کی پنچائتیں خاص اختیارات رکھتی تھیں اور جن لوگوں کی شہر کے اندر جائدادیں ہوتی تھیں وہ ان میں سے کسی نہ کسی جماعت سے ضرور تعلق رکھتے تھے سوداگروں کی پنچائتیں مذہبی و معاشری فرائض انجام دیتی تھیں اور

بازار کا اہتمام بھی انھیں کے سپرد تھا۔

تقریباً ہر پیشہ اور حرفہ میں یہ دستور تھا کہ چند سال کے لیے لڑکوں کو معاہدہ پر رکھ لیا جاتا تھا اور اُن کو کوئی اُجرت نہیں دی جاتی تھی۔ میعاد شاگردی اُمیدواری گزرنے کے بعد وہ لڑکا روزانہ کچھ اُجرت پانے لگتا تھا۔

پھر چونکہ عموماً اُجرتی کاری گر کو اس قدر آمدنی نہ ہوتی تھی کہ بے چارہ شادی کر کے بال بچوں کی پرورش کر سکے اس لیے ان میں سے اکثر تمام عمر ناکتخدا رہتے تھے اور یہی وہ لوگ تھے جن سے قحبہ خانوں کی رونق قائم تھی۔ یہ لوگ صفائی پسند اور پاکیزہ طبع نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ کیچڑ میں لوٹنے اور ہر قسم کی بدبو اور عفونت میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ بجز اس کے کہ جو شراب خانوں یا عام قحبہ خانوں میں حاصل ہو سکے ان کے لیے عیش و تفریح کا کوئی سامان نہ تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں طویل العمری کے لیے جسمانی طور پر طاقتور ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں نے حفظانِ صحت کا نام تک نہ سُنا تھا۔ ملکوں میں وبائیں پھیل جاتی تھیں اور لوگ باقاعدہ جنگوں یا آپس کے جھگڑوں میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ اسی لیے عموماً مردوں سے عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور چونکہ مذہبی عقائد کی بنا پر یا اقتصادی مشکلات کے خیال سے اکثر مرد مجرد رہتے تھے اس لیے عورتوں کی بھی بڑی تعداد کو مجبوراً ناکتخدا رہنا پڑتا تھا۔ پھر بعض عورتیں یا تو ترک دنیا کر کے کسی خانقاہ میں داخل ہو جاتی تھیں یا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے کارخانوں یا شرابخانوں

میں عورتوں کو اُجرتیں بھی کم ملتی تھیں۔ ادنیٰ درجہ کی عورتوں کی عصمت و عفت کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تھی اور ہر چند زنا سب سے بڑا گناہ خیال کیا جاتا تھا، لیکن یہی گناہ عام تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے قحبہ خانوں کو جن لوگوں سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی وہ تین جماعتوں سے متعلق ہوتے تھے۔ راہبوں کی جماعت۔ کاری گروں کا طبقہ اور طلباء۔ ہر چند کوشش کی جاتی تھی کہ طلباء بچے رہیں اور اوقاتِ مقررہ پر ان کو اپنی اقامت گاہوں میں موجود رہنا پڑتا تھا۔ مگر یہ تمام احتیاطیں انھیں فحاشیوں سے باز نہ رکھ سکتی تھیں۔

قرونِ وسطیٰ کے لوگوں میں بعض قحبہ خانوں کے خلاف تھے اور بعض ان کو اخلاقی لحاظ سے ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن پیشہ ور عورتوں کو عام طور پر ذلیل سمجھنے کے باوجود اتنی اجازت تھی کہ وہ تقریبوں میں شریک ہو کر اپنے تحائف پیش کریں۔ کبھی کبھی بادشاہ اور امرا بھی قحبہ خانوں کو عزت بخشتے تھے اور جب کوئی معزز مہمان آجاتا تھا تو اُس کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ جس قحبہ خانے میں چاہے بغیر روک ٹوک کے چلا جائے۔ شہنشاہ سجسمنڈ Sigismund پندرھویں صدی میں گزرا ہے اس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جس شہر میں گیا وہاں کے قحبہ خانہ کی ضرور سیر کی۔

پیشہ ور عورتوں کو دوسری شریف عورتوں سے ممیز کرنے کے لیے یہ قاعدہ مقرر تھا کہ پیشہ ور عورتیں زیور اور قیمتی لباس پہن کر پبلک میں نہ نکلا کریں ان کے لیے حکم تھا کہ وہ نقاب، ٹوپی کسی مخصوص وضع قطع کی عبا یا کوئی

مقررہ نشان استعمال کریں۔ یہودیوں، بدعتی عیسائیوں، جذامیوں اور دیگر ذلیل قوموں کے افراد کو بھی عام گزرگاہوں یا بازار میں ایک خاص قسم کا نشان استعمال کرنا پڑتا تھا۔

ملکی قوانین کی رُو سے اِس طبقہ کے لوگوں کو چوروں اور آوارہ لوگوں کی قسم میں رکھا جاتا تھا اور جو سرکاری ملازم قحبہ خانوں کی حفاظت کیا کرتے تھے وہ اجنبی عورتوں کی طرف اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ بعض اوقات ان کو پکڑ کر منہ کالا کرتے اور کوڑے مار کر نکال دیتے تھے۔

قرونِ وسطیٰ کی مذہبی خانقاہیں چونکہ فحاشی میں بہت بدنام ہوگئی تھیں اور وہاں کسی پارسا لڑکی کا پہنچ جانا گویا بے آبرو ہو کر نکلنا تھا اس لیے کلیسا کی طرف سے ان کے خلاف احکامِ امتناعی جاری کیے گئے لیکن یہ سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔

مذہبی تہواروں میں بھی کسبیاں بڑا حصہ لیتی تھیں۔ بعض اوقات مقامی حکام اپنے مہمانوں کے سامنے ان کا رقص دیکھتے تھے اور اس کے عوض انھیں کھانا شراب اور پھولوں کے ہار دیے جاتے تھے۔ یہی حال قدیم روما میں تھا۔ بعض اوقات قرونِ وسطیٰ کے لوگ شادی بیاہ کی تقریب میں مہمانوں کی تفریح کے لیے کسبیاں بھی اُجرت پر بُلا لیا کرتے تھے۔

جب کوئی بادشاہ یا اسقف اپنی قلمرو میں دورہ کرتا تھا تو اس کے ہمراہ متعدد کسبیاں بھی ہوتی تھیں اور مقدس سلطنت روما کے زمانہ میں جب امرا جمع ہوتے تھے تو کسبیاں ان سے پہلے ہی موقع پر پہنچ جاتی تھیں۔

مذہبی مجاہدین اور سپاہیوں کے گرد بہت سی کسبیاں جمع ہو جاتی

تھیں اور کوئی فتح حاصل ہوتی تھی تو فوجیوں کو شراب اور عورت بطور مالِ غنیمت مفت دی جاتی تھی۔

قرونِ وسطیٰ کی آخری دو تین صدیوں میں پبلک حماموں نے بھی قحبہ خانوں کا درجہ اختیار کر لیا تھا۔ انگلستان میں تو بہت پہلے سے حماموں کے اندر کسبیاں رکھی جاتی تھیں اور غالباً یہ رواج رومیوں نے جاری کیا تھا۔ لیکن برِ اعظم یورپ میں یہ رواج اُس وقت جاری ہوا جب صلیبی جنگوں کے بعد یہ لوگ بازنطینی اور عربی تمدن دیکھ کر واپس آئے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ یورپین کسبیوں کو مشرقی سلطنت روم، عرب، اور شمالی افریقہ میں فروخت کر دیا جاتا تھا اور وہاں سے عربی کنیزیں یورپ کے قحبہ خانوں کے لیے خرید کر لائی جاتی تھیں۔ مغربی شہروں میں بردہ فروشی نے اس قدر اہمیت کہیں اختیار نہیں کی تھی جس قدر قسطنطنیہ، قاہرہ اور بغداد میں۔

اُس عہد کی تقریباً تمام کسبیاں جاہل ہوتی تھیں اور بعض اوقات ایسے ملکوں میں بھیج دی جاتی تھیں جہاں کی زبان وہ بہت کم سمجھتی تھیں۔ یہاں ان کو پورے قانونی حقوق حاصل ہوتے تھے اور ان کا مالک ان سے جو چاہے کام لے سکتا تھا۔

فحاشی سے شراب کا تعلق ہمیشہ رہا ہے۔ اسی لیے قرونِ وسطیٰ کی کسبیاں پہلے شراب خانوں ہی میں جمع ہوا کرتی تھیں۔ لیکن جب قحبہ خانے جداگانہ قائم ہو گئے تو شراب خانوں سے ان کا تعلق کم ہو گیا۔ قدیم زمانہ کی طرح اوائل قرونِ وسطیٰ میں بھی قحبہ خانے اکثر بازاروں ہی میں ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ

ان کو وہاں سے ہٹا کر نواح شہر میں جگہ دی گئی۔ رات کے وقت ان کے مکان کے دروازے پر ایک سرخ لالٹین لٹکا دی جاتی تھی اور دن میں کوئی خاص نشان نصب کر دیا جاتا تھا۔ ان علامتوں کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں وہ بھی دیکھ کر پہچان لیں کہ یہ بازار کس قسم کا ہے۔

بعض اوقات یہودیوں کے محلہ میں قحبہ خانے بنا دیے جاتے تھے جس سے یہ لوگ سخت جلتے تھے۔ یہودیوں کو ان قحبہ خانوں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بہت سے اضلاع میں کسی یہودی کا عیسائی عورت سے یا عیسائی کا یہودی عورت سے ملتفت ہونا اس قدر سخت جرم قرار دیا گیا تھا کہ مرتکبین کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اسی وجہ سے یہودیوں کو حکم تھا کہ وہ کوئی امتیازی نشان استعمال کریں تاکہ شناخت ہو سکے۔ قرونِ وسطیٰ میں یہودیوں کی شادیاں اوائل عمر میں ہو جایا کرتی تھیں۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ بہت کم یہودی ایسے ہوتے ہوں گے جو اپنی بیویوں کے سوا کسی غیر عورت سے واسطہ رکھتے ہوں گے۔

قرونِ وسطیٰ کے اخیر میں پبلک قحبہ خانوں کے نظام میں تغیر و تبدل پیدا کرنے کا میلان شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اطالیہ اور جنوبی فرانس میں چند قحبہ خانے نہایت پُر تکلف تیار کیے گئے جن میں خوبصورت اور شاندار حمام بھی تھے۔

میونسپلٹیوں نے بہت سے قحبہ خانے اپنے ہاتھ میں لے لیے جن کا انتظام وہ اپنے تنخواہ دار ملازموں سے کرتے یا ٹھیکہ پر دیدیتے۔ بہت سے شہروں میں قحبہ خانوں سے باہر جو پرائیویٹ ٹھکانے ہوتے تھے ان پر سخت ٹیکس لگائے جاتے تھے تاکہ سرکاری قحبہ خانوں کو ان سے نقصان نہ پہنچے۔

چونکہ قحبہ خانوں میں رہنے والی عورتیں سرکاری ملازم ہوتی تھیں اور حکومت کو اُن کی کمائی کا ایک حصّہ ملتا تھا، اِس لیے ان کو بعض رعایتیں بھی حاصل تھیں اور پولیس اُن کی پوری حفاظت کرتی تھی۔ قحبہ خانوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات بھی مقرر تھے اور احکام میں یہ صراحت بھی ہوتی تھی کہ کِن کِن لوگوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ حکومت کی طرف سے ایسے قواعد وضوابط بھی رائج تھے جن کے ڈر سے کوئی شخص نہ تو کاٹ کر کسبیوں کی اُجرت مار نہیں سکتا تھا اور نہ مالک قحبہ خانہ کے نامعقول مطالبات کی وجہ سے کسبیوں کے کپڑے قرق کیے جا سکتے تھے! اربابِ حکومت اس کی بھی نگرانی کرتے تھے کہ ان کو دونوں وقت کھانا معقول دیا جاتا ہے یا نہیں۔

بہت سی میونسپلٹیوں نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا کہ شہر کی کوئی دوشیزہ لڑکی قحبہ خانوں میں داخل نہ کی جائے، لیکن قحبہ خانوں کے مالک کسی دوسرے شہر سے خوبصورت لڑکیاں لا سکتے تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں چالیس برس کی عمر والوں کو سال خوردہ سمجھا جاتا تھا اس لیے قحبہ خانوں میں کوئی عورت اِس عمر کی نہیں رہ سکتی تھی۔

اگرچہ ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن گرجاؤں میں آنے کی اجازت ان کو مل جاتی تھی اور گرجا کے لیے موم بتیاں خریدنے اور عشاءِ ربانی کے مصارف کے لیے ان سے اکثر چندہ بھی لیا جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے لوگ اِس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ وہ گندگی اور توہمات میں مبتلا ہیں۔ جب کام ہوتا تھا تو وہ کر لیتے تھے لیکن فرصت کے وقت

وہ نہایت بدتمیزی سے لہو ولعب اور عیش وعشرت میں مشغول ہوجاتے تھے اور جانوروں سے زیادہ ان کی حیثیت نہ رہتی تھی۔

اگرچہ علماء وفضلاء کسبیوں کو ادنیٰ مخلوق قرار دیتے تھے لیکن پھر بھی گرجاؤں میں ان کی نشست مقرر تھی اور تہواروں میں پارسا لوگوں کے ساتھ شامل ہوجاتی تھیں۔

ایک بات پبلک قحبہ خانوں میں یہ بھی ہوتی تھی کہ کسبیوں کو دن بھر میں کوئی نہ کوئی مقرر کام ضرور کرنا پڑتا تھا مثلاً سینا پرونا یا کاتنا۔

ہر چند اس امر کی بہت کوشش ہوتی تھی کہ فحاشی صرف قحبہ خانوں تک محدود رہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور خانگی طور پر بھی فحش برابر جاری رہا۔ اس جماعت میں ہر قسم کی عورتیں ہوتی تھیں لیکن خصوصیت کے ساتھ مشاطہ گری کرنے والیاں، حمام میں نہلانے والیاں اور سلائی کا کام کرنے والیاں اس سے زیادہ مبتلا تھیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض عورتیں بازاروں کی سڑکوں پر حسن فروشی کرتی پھرتی تھیں اور اُن کی وجہ سے نہ صرف سرکاری قحبہ خانوں کو نقصان پہنچ جاتا تھا بلکہ شہر میں جرائم کی تعداد بھی بڑھ جاتی تھی اور قتل وغیرہ کی واردات بھی نسبتاً زیادہ ہونے لگتی تھیں۔

بعض اوقات شہروں میں سرکاری قحبہ خانوں کے آس پاس لوگ اپنے ذاتی قحبہ خانے بھی خفیہ طور پر قائم کرلیتے تھے اور ہر چند حکومت ان کو قائم نہ رہنے دیتی، لیکن فحاشی کو صرف سرکاری قحبہ خانوں تک محدود رکھنے

میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی اور نہ فحاشی کا سدباب اس طرح کبھی ممکن ہے۔

ناچ گھر جہاں عموماً شراب فروخت ہوتی تھی کھلے قحبہ خانہ کی صورت رکھتے تھے لیکن پندرھویں صدی تک ان ناچ گھروں کو چنداں اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی کیونکہ اُس وقت نہ بڑے بڑے شہر پائے جاتے تھے اور نہ لطف و تفریح کا شائستہ نظام قائم ہوا تھا۔ البتہ مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں قدیم یونان و روم کی طرز کے میخانے پیدا ہو گئے تھے جن میں "تعلیم یافتہ" کنیزیں بزم نشاط گرم کیا کرتی تھیں۔

حماموں میں اکثر و بیشتر عورتیں ہی ملازم ہوتی تھیں۔ جو حجاموں اور پیش خدمتوں کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ اواخر قرونِ مظلمہ میں بھی ایسے ادارات فحاشی بہت آراستہ و پُرتکلف ہوا کرتے تھے اور عورتیں بھی حسن و جمال دیکھ کر ملازم رکھی جاتی تھیں لیکن قرونِ وسطیٰ کی فحاشی کی خصوصیت خاصہ اس کی ارزانی تھی۔

قرونِ وسطیٰ میں حرمیں بھی بکثرت تھیں اور ان میں بہت ایسی تھیں جو درحقیقت اصلی بیبیوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ جب پادریوں کے لیے یہ بات ناممکن ہو گئی کہ وہ عورتوں سے جائز طور پر نکاح کر سکیں تو وہ کنیزوں اور ماماؤں سے تعلق رکھنے لگے اور ان سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اس کی نگہداشت بالکل جائز اولاد کی طرح ہوتی تھی اور بعض اوقات تو انھوں نے ترقی کرکے حکومتیں تک کی ہیں۔

جو احکام قحبہ خانوں کے متعلق جاری ہوتے تھے ان میں اس امر کی بھی صراحت ہوتی تھی کہ کسی مرد کو آستین پکڑ کر قحبہ خانہ میں نہ کھینچا جائے اور

نہ کسی کی ٹوپی اُتاری جائے۔ الغرض حکومت کے احکام ہر قسم کی تفصیلات پر حاوی تھے اور جس طرح سرکاری بازاروں اور منڈیوں کی نگرانی ہوتی تھی اسی طرح اُس زمانہ میں قحبہ خانوں کی نگرانی ہوتی تھی۔

احکام کی خلاف ورزی کرنے والی کسبیوں کو جو سزائیں دی جاتی تھیں ان میں ایک سزا یہ بھی تھی کہ اس کو پکڑ کر شکنجہ کے اندر کس دیتے تھے، یا کسی چھکڑے میں لاد کر باجہ کے ساتھ تشہیر کرتے تھے اور لوگ ساتھ ساتھ شور و غل مچاتے اور آوازے کستے جاتے تھے۔ بعض مقامات میں اس طریقۂ تشہیر میں کسی قدر تفاوت ہو جاتا تھا یعنی چھکڑے میں لادنے کے بجائے اس کو دم کی طرف منہ کر کے گدھے پر سوار کر کے شہر میں گھماتے تھے اور اُس پر سڑی گلی ترکاریاں اور کیچڑ تک پھینکتے تھے۔

اگر کوئی بدمعاش کسی باعصمت عورت کو اڑاتا تھا تو اُسے بعض جگہ تو پھانسی دیدی جاتی تھی یا زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔ مختلف جرائم پر کسبیوں اور اُن کے ساتھیوں کو سزائے تازیانہ دی جاتی تھی۔ یا اُن کا کوئی عضو کاٹ دیا جاتا تھا یا کچھ دنوں کے لیے جیل خانہ میں ڈال دیے جاتے تھے۔ یا اُن پر جرمانہ کر دیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات گرم لوہے سے داغنے کی بھی سزا دی جاتی تھی۔

قحبہ خانوں میں حفظانِ صحت کا خیال تو رکھا جاتا تھا لیکن ناپاک بیماریوں کا کوئی لحاظ نہ ہوتا تھا۔ البتہ اگر کسی عورت کی نسبت کسی بیماری کا شبہ ہوتا تھا تو اُسے شفاخانہ بھیج دیتے تھے اور جن کی گود میں بچے ہوتے تھے اُنھیں بھی شفاخانہ بھجوا دیا جاتا تھا۔ کسی جذامی عورت کو

قحبہ خانہ میں داخل نہ کیا جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے انگلستان میں فحاشی

جب رومیوں نے برطانیہ کو فتح کر لیا تو انھوں نے دیکھا کہ ملک میں جماعتی شادیوں اور دیگر قسم کے تعلقات زناشوئی کا رواج تو موجود ہے لیکن کوئی قحبہ خانہ نہیں پایا جاتا۔ ڈاکٹر سیلنجر (Selanger) کا قول ہے کہ اس وقت اہل برطانیہ کے اوضاع و اطوار بہت ناشائستہ تھے۔ یہ لوگ بالکل گنوار تھے اور ان کے یہاں یہ عام دستور تھا کہ شادی کے روز تمام دلھنیں قطعی برہنہ رہتی تھیں۔

البتہ اینگلوسیکسن قوم کا قانون اخلاق زیادہ سخت تھا اور اگرچہ ان لوگوں میں بھی نکاح کا کوئی خاص قانون مقرر نہ تھا۔ لیکن وہ زناکاری پر نہایت سخت سزا دیتے تھے۔ جب یہ لوگ انگلستان آئے تو ان کے بعض سرداروں میں کثرت ازدواج کا رواج تھا۔ لیکن اس عورت کو جو عصمت کی ناقدری کرتی تھی یا اس مرد کو جو کسی غیر عورت کے ساتھ ملتفت ہوتا تھا سخت سزا دی جاتی تھی۔ بدچلن بیوی کو بعض اوقات خودکشی کر لینے کا موقع دیا جاتا تھا جس کے بعد اس کی لاش پھونک دی جاتی تھی۔ لیکن اگر وہ عورت خودکشی نہیں کرتی تھی تو اُسے سخت عقوبت دی جاتی تھی بلکہ عورتوں کا ایک مجمع کثیر جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھُرے ہوتے تھے اس عورت پر حملہ کر کے تکا بوٹی کر دیتی تھیں اور اس کے چاہنے والے کو بھی قتل کر دیا جاتا تھا۔

جو لوگ شادی کرنا چاہتے تھے وہ عورتوں کے والدین سے اپنی بیویاں خرید لیا کرتے تھے۔ شادی شدہ عورت کے بال تراش دئے جاتے تھے،

تاکہ صورت میں کشش کم ہو جائے۔

شاہ کینوٹ کے ایک قانون کی رو سے زانیہ کے ناک کان کاٹ ڈالے جاتے تھے لیکن بعد میں ایک رقم معاوضہ مقرر کر دی گئی تھی جو زانیہ کے شوہر کو دلائی جاتی تھی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فحاشی بڑھنے لگی اور تعزیر کا طریقہ پھر جاری کرنا پڑا، گو تعزیر کی صورت بدلی ہوئی تھی یعنی مجرم کو بادشاہ کا غلام بننا پڑتا تھا محنت و مشقت کرنی پڑتی تھی، بادشاہی فوج میں خدمت کرنے پر اسے مجبور کیا جاتا تھا۔ شاہ ایڈگر نے ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے زانی و زانیہ دونوں کو ہفتہ میں تین دن صرف روٹی اور سادہ پانی پر گزر کرنا پڑتا تھا اور یہ سلسلہ سات برس تک جاری رہتا تھا۔

رومیوں نے لندن اور انگلستان کے بعض دیگر شہروں میں قحبہ خانے قائم کر دیے تھے اور ان میں سے غالباً ایک، دو قرونِ وسطیٰ تک جاری رہے۔

انگلستان کے حماموں کے اندر قحبہ خانے قائم کرنے کا فخر بھی رومیوں ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ انگریزی کا لفظ "اسٹوز" (stews) جو وسطی زمانہ کے لفظ "اسٹودین" (stewen) سے بنا ہے "غسل" ہی کے معنی رکھتا ہے اور قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کے اندر سرکاری حمام سب سے بڑے قحبہ خانے ہوتے تھے۔

بارھویں صدی میں بعہد ہنری دوم قحبہ خانوں کے انتظام کے متعلق ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے تعطیلات کے ایام میں کوئی عورت حماموں کے اندر رہنے نہیں دی جاتی تھی اور نہ حمام میں سامان اکل و شرب فراہم کرنے

کی اجازت تھی۔ بہت سے قواعد اسی قسم کے تھے جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے یعنی کسی مرد کو جبراً گھسیٹ کر قحبہ خانہ میں نہیں لے جا سکتے تھے۔ کوئی راہبہ یا کتخدا عورت قحبہ خانوں کے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی جس عورت کو سوزاک کی تکلیف ہوتی تھی اُسے قحبہ خانہ میں نہ رہنے دیا جاتا تھا۔ ہنری دوم کے اس قانون کی توثیق چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہوئی۔

نویں صدی میں بہت سے مسیحی علماء اس بات پر مُصر تھے کہ ملک کی کسبیوں سے جس قدر آمدنی ہو اس کا دسواں حصّہ کلیسا کو ملنا چاہیئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد کلیسا والوں نے اس کا مطالبہ ترک کر دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ بعض فقہا گناہ گاری سے جلب منفعت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے لیکن آئندہ زمانہ کے اسقفوں نے جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں۔ قحبہ خانوں سے آمدنی حاصل کرنا بُرا نہیں سمجھا۔ سموئیل پیپیز (Samuel Papys) کے زمانہ میں دو قحبہ خانوں کی آمدنی ڈیوک آف یارک کو ملا کرتی تھی۔

جب ڈین (Danes) قوم نے انگلستان پر حملہ کیا تو وہ بھی انگریزی اخلاقیاتِ جنسی کو کوئی ترقی نہ دے سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ڈین لوگ روزمرہ اپنے بالوں میں شانہ کیا کرتے اور دیگر طریقوں سے اس قدر اپنے آپ کو سنوارتے کہ اینگلو سیکسن قوم کی عورتوں کے لیے دل کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اُس زمانہ میں ایک قانون یہ تھا کہ جو کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی بیوی سے زنا کرے اُسے ایک مقررہ رقم تاوان "شوہر مظلوم" کو دینی پڑتی۔ علاوہ ازیں اس شوہر کے لیے دوسری عورت بھی بہم پہنچانی پڑے گی۔ اس سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں کسبیاں ضرور موجود تھیں اور فحاشی کوئی بڑا جرم خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اگر کسی کسان کی بیوی کی عصمت دری کر دی جاتی تھی تو اس کے شوہر کو بیس روپیہ کے قریب تاوان دلایا جاتا تھا اور اگر کسی شریف یا امیر کی بیوی سے زنا کیا جاتا تھا تو اس کا تاوان زیادہ سے زیادہ دو تین سو روپیہ تک ہوتا تھا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اس قانون کے باعث زنا میں ترقی نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ معاوضہ وغیرہ کی الجھنوں میں پھنسنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ آدمی کسی پبلک قحبہ خانہ میں چلا جائے۔

نارمن (Norman) حملہ آور ڈین قوم سے بھی زیادہ شائستہ تھے چنانچہ نارمن لوگوں کی فتح کے بعد انگلستان میں نظام جاگیرداری کو بے حد زور ہو گیا اور اسی کے ساتھ ملک کو تجارتی و حرفتی اہمیت بہت حاصل ہو گئی۔ چونکہ اس عہد میں براعظم یورپ کا انگلستان سے بہت کچھ تعلق ہو گیا تھا اس لیے اِس دَور کا اثر بہت سی صورتوں میں فحاشی پر بھی ہوا۔

قانون جاگیرداری کی رُو سے اگر کوئی شخص رعایا میں سے کسی تعلقدار کی بیوی سے ناجائز تعلق پیدا کرتا تھا تو ضبطی زمین کی سزا دی جاتی تھی۔ لیکن اگر خود تعلقدار اپنے سے کم درجہ شخص کی بیوی کی آبروریزی کرتے تھے تو اس کو کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ بعض اوقات مقتدایانِ دین قانون جاگیرداری کے خلاف عدل و انصاف اور درستی اخلاق کا تقاضہ کرتے تھے لیکن چونکہ کلیسا والوں کے خیالات چنداں بلند نہ تھے اور وہ خود بھی مبتلائے معصیت رہتے تھے اس لیے

ان کا اثر عیاش تعلقداروں اور نوابوں پر بہت کم پڑتا تھا۔ ولیم فیدس

(William Rufus) کے عہد میں اس مسئلہ پر بہت بڑا جھگڑا پیدا ہوا کہ کلیسائے مسیحی کے اُسقف کسی شخص کو زنا کے جُرم میں بلا اجازت بادشاہ سزا دے سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن آخرکار بہت سے مقتدایانِ دین نے یہی پسند کیا کہ بادشاہ کے خلاف جھگڑا کرنا مناسب نہیں۔

انگلستان میں بعہد ہنری سوم یہ مسئلہ پیش ہوا کہ جو بچے شادی سے قبل پیدا ہوں لیکن بعد میں ان کے والدین شادی کرلیں تو وہ بچے جائز شمار ہوں گے یا ناجائز۔ اس کے متعلق مذہبی اور ملکی قوانین میں اختلاف تھا۔ ملکی قانون کی رُو سے ایسے بچے ناجائز تھے لیکن اسقفوں کا فتویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کے جائز وارث ہیں اور ان کو جائز اولاد کے دیگر حقوق بھی حاصل ہیں اور چونکہ جائز و ناجائز اولاد کا جھگڑا مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتا تھا، اس لیے اسقفوں کی رائے غالب رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ "آزمائشی ازدواج" کے طور پر اپنے گھروں میں بلا نکاح عورتیں رکھنے لگے۔

قرونِ وسطیٰ کی جرمنی میں فحاشی

قوم لوط مغاربہ کے قانون کی رُو سے اگر کوئی آزاد لڑکی یا کتخدا عورت شہر کے اندر مبتلائے فحاشی ہوتی تھی تو اُس کو پکڑ کر تین سو کوڑے مارتے تھے اور اگر کسی لڑکی کے والدین اس کی فحاشی پر راضی ہوتے تھے تو ان کو بھی سزائے تازیانہ دی جاتی تھی۔ یہی قانون ان کنیزوں اور ملازم عورتوں پر عائد ہوتا تھا جو پیشہ کرتی تھیں۔

لیکن قرونِ وسطیٰ میں جرمنی نے اس باب میں بہت رواداری سے کام لیا کیونکہ دیگر بلادِ یورپ کی طرح یہاں کے اُمراء اور اسقف بھی قحبہ خانوں سے

طلب منفعت کرنے تھے۔ چنانچہ شہر مینز (Mainz) میں پندرھویں صدی کے اندر تمام قحبہ خانوں کے مہتمم ارباب کلیسا ہی ہوا کرتے تھے۔

پندرھویں صدی میں شہر اولم (Ulm) کی میونسپلٹی نے اپنے قحبہ خانے لوگوں کو ٹھیکہ پر دیدئے اور ٹھیکہ داروں نے وعدہ کیا کہ وفاداری سے شہر کی خدمت انجام دیں گے۔ کوئی مال مسروقہ اپنے گھروں میں نہ رکھیں گے ہنگامے اور بلوے بھی نہ ہونے دیں گے اور ہر قحبہ خانہ میں ہمیشہ صاف ستھری اور تندرست عورتیں رکھا کریں گے۔ ان کو حکم تھا کہ کسبیوں کو مقررہ قیمت کی خوراک دی جائے۔ جو دن گوشت کے مقرر تھے اُس روز اُن کو گوشت کی دو چیزیں دیجاتی تھیں۔ جمعہ کے دن اور ایام صیام کے زمانہ میں گوشت یا بھنے ہوئے کبابوں کی جگہ انڈے اور مچھلی دی جاتی تھی۔ اگر کوئی کسبی باہر سے کھانا منگانا پسند کرتی تھی تو مہتمم قحبہ خانہ اسے تقریباً چھ آنہ ادا کرتا تھا جو عموماً گھر کے کھانے کی قیمت ہوتی تھی مہتمم کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ وہ قحبہ خانہ کی کسبیوں کے ہاتھ بشرط طلب فروخت کریں۔

شہر اولم کے ہر قحبہ خانہ میں نقدی کا ایک صندوقچہ ہوتا تھا جس کی ایک کنجی مہتمم کے پاس، دوسری ایک کسبی کے پاس اور تیسری خزانچی کے پاس رہتی تھی۔ ہر روز کی آمدنی تمام کسبیاں اسی صندوقچہ میں داخل کرتی تھیں جس کا ایک تہائی حصہ قحبہ خانہ کے مالک کو ملتا تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص زیور وغیرہ دے جاتا تھا تو وہ عورت ہی کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔

پندرھویں صدی کے آخر میں شہر ہیمبرگ میں تمام قحبہ خانے ایک

خاص محلّے میں محدود کر دیے گئے تھے اور ہر چند اُس وقت یہ قحبہ خانے میونسپلٹی کی ملکیت نہیں تھے لیکن میونسپلٹی کی طرف سے اُن پر ایک خاص ٹیکس ضرور عائد کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں کارخانوں وغیرہ میں بھی بغیر لائسنس بہت فحاشی ہوتی رہتی تھی۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں جرمنی کے اندر یہ میلان پیدا ہوا کہ اخلاقی نا مہذب کلیسا کی نگرانی موقوف کر دی جائے اور نہایت سخت قوانین اس باب میں نافذ کیے گئے، چنانچہ زانیہ اور زانی دونوں کو کبھی کبھی سزائے موت بھی دی گئی۔ مگر عام سزا یہی تھی کہ سر مونڈ کر تمام عمر چہرہ پر ایک نقاب پہننے پر اُسے مجبور کیا جاتا تھا۔

لیکن چونکہ گھر کی بیویوں کی عصمت و عفت کی بہت کچھ قدر کی جاتی تھی اس لیے فحش کا رواج بڑھا اور اس حد تک اسے ضروریاتِ زندگی میں داخل کرلیا گیا کہ اگر کسی قرض خواہ کو اس بات کی ضرورت پڑتی تھی کہ وہ قرضدار پر نالش کرنے کے لیے گھر سے باہر کسی سرائے میں قیام کرے تو اُسے حق حاصل تھا کہ وہ اپنی رقم مطلوبہ میں قیام سرائے کے مصارف فحاشی بھی شامل کر لے برلن وائنا اور دیگر بلاد جرمن کے سرکاری حساب کتاب میں ایسی رقمیں بھی پائی جاتی ہیں جو سفراء اور دیگر معزز مہمانوں کی تفریح طبع کے لیے عورتوں کو اُجرت میں دی گئی تھیں۔ اگرچہ فحاشی صرف ناکتخدا لوگوں کے لیے جائز خیال کی جاتی تھی لیکن ان معزز مہمانوں میں جن کی اس طرح عزت افزائی اور خاطر مدارات کی جاتی تھی بہت کم ایسے ہوتے تھے جن کی بیویاں موجود نہ ہوں۔

قرونِ وسطیٰ کی جرمن معاشرت میں سفری رقاصائیں بھی بہت کچھ اہمیت رکھتی تھیں۔ اکثر صورتوں میں یہ عورتیں اپنے پیشہ کے علاوہ یوں بھی کمائی کرتی تھیں۔ حروب صلیبیہ کے بعد ممالک مشرق سے بہت سی ناچنے والیاں جرمنی اور یورپ کے دیگر مغربی ممالک میں آئیں جن کے ناچ سخت ہیجان انگیز ہوتے تھے اور زراعت پیشہ طبقہ کی عورتوں نے بھی بہت جلد ناچ سیکھ لیے اور پھر یہ رقص ان اضلاع میں بھی پھیل گیا جہاں وہ مشرقی رقاصائیں نہیں پہنچی تھیں۔

قرونِ وسطیٰ کے فرانس میں فحاشی

گال (۱) اور فرینک (۲) اقوام میں فاحشہ عورتوں کے لیے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ یہاں تک کہ سنگ ساری کی بھی سزا موجود تھی لیکن ان سزاؤں کا موقع شاذ و نادر ہی کبھی پیدا ہوتا تھا کیونکہ ان قوموں میں کوئی باقاعدہ شہری زندگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اگرچہ رُومی فتوحات تک ان ممالک میں کوئی باقاعدہ ادارہ فحاشی کا نہ تھا، لیکن بلانکاح تعلقات جنسی کے واقعات اکثر دیکھے جاتے تھے۔ خصوصاً اُس وقت جب کوئی زبردست فتح حاصل ہوتی تھی، یا جب کوئی سالانہ جشن منایا جاتا تھا۔

---

(۱) گال قدیم ملک گال کی باشندہ تھی اور ملک گال (Goal) میں وہ ملک شامل تھے جنھیں آج کل فرانس و بلجیم کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس ملک میں کچھ حصّہ ہالینڈ، سوئزرلینڈ اور جرمنی کا بھی شامل تھا۔

(۲) فرینک (Frank) ایک جرمن نژاد قوم تھی جس نے چھٹی صدی میں ملک فرانس کو فتح کیا

رومیوں کے عہد میں شہر مشالیا موجودہ مارسیل (Marseilles) بہت کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ فروغ تجارت کی وجہ سے وہاں کے فحبہ خانوں میں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ علاوہ ازیں رومی فوجی بھی اپنے ساتھ ہزاروں عورتیں لے آئے تھے جو پیشہ ور تھیں۔

فرینک قوم کے سردار اکثر ایک سے زیادہ عورتیں پاس رکھتے تھے۔ ان میں ایک تو اصلی بیوی ہوتی تھی اور باقی اس کی مدخولہ یا حرمین ہوتی تھیں۔ الغرض دسویں اور گیارھویں صدی تک پیشۂ فحاشی کم جاری ہوا تھا۔

شہنشاہ شارلمین (Charlemagne) کے قوانین میں فحاشی قطعی ممنوع تھی۔ راہبوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بدچلنی کی زندگی چھوڑ دیں اور راہبہ عورتوں کو یہ تنبیہ تھی کہ وہ "کسبی، چور اور قاتلہ" ہونا چھوڑ دیں۔ تمام کسبیوں اور قرمساقوں کو کوڑے مارے جانے کا حکم تھا۔

لیکن اُمراء اور پادریوں کو مدخولہ عورتیں رکھنے کی اجازت تھی۔ پادریوں کو نکاح کرنے کی بھی اجازت تھی۔ لیکن شہنشاہی قوانین عبارت اور زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نکاح کے جھگڑے کو خود پسند نہیں کرتے تھے۔

قرونِ مظلمہ میں اعلیٰ طبقوں کے اندر ازدواجی وفاداری روز بروز مفقود ہوتی جاتی تھی، جس کی ابتداء بادشاہوں کی طرف سے ہوئی اور پھر طبقۂ امراء اور مقتدایانِ دین نے بادشاہوں کی تقلید کی، چنانچہ بڑے بڑے گرجاؤں پر سنگتراشی کے ذریعہ سے اکثر ایسے مناظر کندہ کئے جانے لگے تھے جنہیں فی زماننا ہرگز پبلک میں نہیں لایا جا سکتا۔

تیرھویں صدی میں لوئی سیزدہم نے انسداد فحاشی کی بے سود کوشش کی ۱۲۲۵ء میں لوئی نہم (سینٹ لوئی) نے جو زیادہ متقی و پرہیزگار بادشاہ تھا ایک فرمان جاری کر کے تمام کسبیوں اور چکلہ داروں کو ملک سے نکال دیا اور جو لوگ پھر پیرس واپس آگئے تھے انھیں سخت سزائیں دی گئیں۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کیونکہ دوسری عورتوں نے بہت جلد ان کی جگہ لے لی اور شراب خانوں میں فحاشی کا چرچا بڑھ گیا۔ علاوہ ازیں ہر طرف سے شکایتیں ہونے لگیں کہ لوگوں سے بیویوں اور بیٹیوں کی عزت آبرو بچانا ناممکن ہو گیا ہے۔

مجبوراً یہ فرمان دو سال بعد منسوخ کرنا پڑا اور کسبیوں کا اہتمام ایک سرکاری عہدیدار کے سپرد کر دیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ جو عورتیں قواعدِ مقررہ کی خلاف ورزی کریں انھیں گرفتار کر کے سزا دے۔ اس کے ساتھ شہر پیرس کے ایک خاص محلہ میں کسبیوں کو محدود کر دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ بیش قیمت لباس اور زیور نہ پہنیں۔

بڑھاپے میں شاہ سینٹ لوئی نے اپنے بیٹے کو جو بعد میں فلپ سوم کے نام سے بادشاہ ہوا طلب کر کے حکم دیا کہ وہ ۱۲۵۴ء کا فرمان پھر جاری کر دے لیکن اس کے نفاذ کی کوشش نہیں کی گئی۔

قرون وسطیٰ کے فرانسیسی لٹریچر میں بہت سے حوالے ایسے ملتے ہیں کہ میزبان نے اپنی بیوی مہمان کے نذر کر دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے فرانس میں عورت کی حالت کس قدر ذلیل تھی۔ چونکہ ابتداء میں نکاح کے لیے عورتیں خریدی جایا کرتی تھیں۔ اس لیے بطور مہمان نوازی کسی مہمان کو ایک دو

رات کے لیے اپنی بیوی دیدینے کا خیال عجیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے بعض مشہور واعظین بدکاریوں کے خلاف بہت کچھ وعظ کہا کرتے تھے اور ان لوگوں کے وعظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں گرجاگھر بھی قحبہ خانوں کا کام دیتے تھے۔ ان وعظوں میں راہبوں، گرجاؤں کے پادریوں اور اسقفوں کو جو پارسائی کے عہد و پیمان پر قائم نہیں رہتے تھے سخت فہمائش کی گئی ہے۔ بقول ان واعظین کے بہت سے راہبہ خانے درحقیقت حرم سرائیں تھے جن میں ہر قسم کی خلافِ فطرت حرکتیں ہوا کرتی تھیں۔

قدیم مورخین کے قول کے مطابق قرونِ وسطیٰ کی بہت سی رسمیں عام قانونِ اخلاق سے متجاوز تھیں۔ مثلاً ۲۸ دسمبر کو جب یوم معصومین (Innocents Day) منایا جاتا تھا تو مردوں کو بہت سویرے لڑکیوں کی خوابگاہوں میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ اگر اُس وقت بھی لڑکیاں سوتی تھیں تو مردوں کو اجازت تھی کہ وہ انھیں گدگدائیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر کھلا ہوا گندہ مذاق ہوتا تھا۔ بلکہ یہ بات پُرلطف خیال کی جاتی تھی کہ جب دولہا اور دلھن تنہا ہوں تو انھیں روزن دیوار سے جھانکا جائے۔ ہندوستان میں بھی یہ دستور کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔

شہنشاہ شارلیمین کے قوانین میں بعض ان مسیحی فرقوں کے لیے بھی سزائیں مقرر تھیں جو عیاشی کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد کی صدیوں میں سحر و ساحری اور مذہبی تازیانہ زنی کا بھی لوگوں کے اخلاق پر بہت کچھ اثر پڑا۔ مذہبی شہسواروں کے فرقہ ٹمپلر (Templars) کا فرانس کے بادشاہ فلپ چہارم

نے استعمال کر دیا تھا اور اس فرقہ کے بہت سے آدمیوں کو اس الزام میں سزائے قتل دی گئی تھی کہ وہ خلاف فطرت حرکتوں میں مبتلا تھے اس میں شک نہیں کہ بادشاہ نے یہ عمل رعایا کی درستی اخلاق کے خیال سے نہیں بلکہ حرص و آز سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ تاہم اس امر کا ثبوت واقعی موجود تھا کہ اس فرقہ کے لوگ خلاف فطرت جرائم کے مُرتکب ہوا کرتے تھے۔

اس زمانہ میں کسبیوں سے زیادہ تعرض نہ کیا جاتا تھا لیکن اُن کو یہ حکم ضرور تھا کہ وہ اپنے لباسوں پر نشانات مقررہ لگائیں تاکہ اُن کے پیشہ کی شناخت ہو سکے شہر اویجنان میں تمام کسبیاں سیاہی مائل لباس میں بائیں بازو پر ایک سفید قوس یا کمان لگا لیا کرتی تھیں اور اگر لباس کا رنگ ہلکا ہوتا تھا تو اُس قوس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا تھا۔ پیرس میں بھی اس کی پابندی ہوتی تھی۔ علاوہ اس کے ان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ بازاروں میں باریک لباس، ریشمی پوشاک اور زیور وغیرہ پہن کر نہ نکلیں۔ اگر کوئی عورت ممنوعہ لباس پہن کر نکلتی تھی تو اُس کا لباس وہیں پشت کی طرف سے چاک کر دیا جاتا تھا اور نیلام کر کے اُس کا روپیہ سرکاری خزانہ میں داخل ہو جاتا تھا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں پیرس کے اندر بعض کٹنیوں کو زندہ جلا دیا گیا اور بعض کو شہر میں تمام دن برہنہ گشت کرانے کے بعد شام کو اُن کے بال جھلس دیے گئے۔ سر عام تازیانہ زنی اور گوش تراشی بھی کبھی کبھی ہوتی تھی۔

فرانس کے بہت سے صوبجات میں تعلقداروں نے کسبیوں پر ٹیکس لگانا شروع کر دیا تھا اور شہر تولوز میں ایک یونیورسٹی اور ایک بہت بڑا

قحبہ خانہ قائم کیا گیا جسے لوگ (Great Abbey) کہتے تھے تمام پیشہ ور عورتیں جو اپنا کام جاری رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ قحبہ خانہ کے اندر رہنے پر مجبور تھیں، اُن کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں اور ان کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ میونسپلٹی اور یونیورسٹی میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

جب شاہ چارلس ششم شہر تولوز میں گیا تو تمام سرکاری کسبیاں اس کا خیر مقدم اور سلام کرنے حاضر ہوئیں۔ اُس وقت اُنھوں نے درخواست کی کہ انھیں اپنے بازو پر سفید فیتہ پہننے سے معاف کیا جائے کیونکہ اس سے ان کا پیشہ ظاہر ہو جاتا ہے اور لوگ ان کی بے عزتی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے اُن کی خواہش کے مطابق فرمان جاری کر دیا۔ لیکن اس سے تولوز کے لوگ ناخوش ہوئے اور اگر کوئی کسبی امتیازی نشان کے بغیر باہر پھرتی تھی تو اسے غضبناک مجمع کے ہاتھوں پٹنے کا خطرہ ہوتا تھا۔ اس سے عاجز آکر انھوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ وہ قحبہ خانہ کے اندر ہی رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی اور بلدیہ کی آمدنی بے حد گر گئی۔ مجبور ہو کر انھوں نے بادشاہ سے اپیل کی۔ اب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ لوگوں نے فرمان شاہی کو ٹھکرا دیا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا خاص تکونیہ نشان قحبہ خانے کے دروازے پر لگوا دیا۔ مگر اس پر بھی اہل تولوز مُصر رہے کہ کسبیاں امتیازی نشان ضرور استعمال کریں۔

آخرکار کسبیاں اِس قحبہ خانہ سے چلی گئیں اور شہر کے دوسرے حصّہ میں جا کر رہنے لگیں جہاں انھوں نے بدمعاشوں کی ایک جماعت کو اپنی

حفاظت کے لیئے رکھ لیا۔ ایک صدی بعد شہر تولوز نے کسبیوں کے لیے ایک "ہریاول گھر" (Green House) تعمیر کردیا جو بہت عرصہ تک قائم رہا۔

قرون وسطیٰ کے فرانس میں بعض ساہوکاروں نے بھی چکلے قائم کر لیے تھے۔ چنانچہ اہل لومبارڈی کو کئی پروانے قحبہ خانہ رکھنے کے حاصل تھے۔ جس میں دل کشس حمام بھی موجود تھے۔ یہ قحبہ خانے کئی پشت تک جاری رہے۔

فرانس کے جنوبی صوبجات میں انسداد فواحشس کی بہت کچھ کوششیں کی گئیں لیکن ناکام رہیں۔ بعض اوقات کسبیوں اور ان کے چاہنے والوں کو برہنہ تن بازاروں میں نکالا گیا کٹنیوں کو آہنی قفس میں بند کرکے دریا میں غرق کردیا گیا لیکن یہ مشغلہ بند نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

عہد جدید اور فحاشی

تمہید اکثر مورخین سولھویں صدی کو قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں جو دماغی اور معاشرتی ترقیاں ہوئیں وہ اس قدر اہم نہیں تھیں جتنی سترھویں اور اٹھارویں صدی کی ترقیاں ثابت ہوئیں سنہ ۱۶۰۰ء کے یورپ کے تمدن میں جس قدر باتیں قرون وسطیٰ کی موجود تھیں وہ ہمارے زمانہ میں نہیں ہیں۔

بہر حال موضوع زیر بحث کے لحاظ سے وہ دس برس جو سنہ ۱۵۰۰ء سے پہلے گزرے اور بیس سال اس کے بعد کے خاص اہمیت رکھتے ہیں سنہ ۱۴۹۲ء میں کولمبس (Colombus) نے جزائر غرب الہند دریافت کیے اور منجملہ دیگر چیزوں کے دنیائے جدید نے یورپ کو آتشک بھی عطا فرمائی۔ سنہ ۱۵۱۷ء میں لوتھر (Luther) نے شہر وٹنبرگ کے ایک گرجا کے دروازہ پر اپنے پچانوے دعاوے چسپاں کیے اور سنہ ۱۵۲۹ء میں جون کالون" ایمان لایا۔ سنہ ۱۵۰۰ء تک فن طباعت کافی ترقی کر چکا تھا، جس کے ذریعہ سے تمام یورپ میں یونانی زبان پھیل گئی۔ جب سنہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا تو بائزنطینی علماء و فضلا، تمام مغربی یورپ میں منتشر ہو کر پھیل گئے۔

احیاء علوم و فنون (Renaissance) اصلاحات مذہبی (Reformation) اور اکتشافات امریکہ نے تمام یورپ کے عوام کی معاشرت میں تغیر تو ضرور پیدا کیا لیکن یہ تغیرات بہت دھیمی رفتار سے ہوئے۔ اور عام طور پر قرونِ وسطیٰ کی طرزِ معاشرت ۱۵۰۰ء سے بھی آگے بہت عرصہ تک قائم رہی یعنی جو حالت کسبیوں کی ۱۳۰۰ء میں تھی تقریباً وہی حالت ۱۷۰۰ء میں بھی رہی اور سچ پوچھئے تو ان کی یہی حالت غالباً ۱۳۰۰ء ق۔م میں بھی تھی۔ ۱۵۰۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان جو زمانہ گزرا اُس میں لوگوں کی قدامت پرستی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور اٹھارویں صدی کے اواخر میں فرانس کے اندر ایک زبردست بیداری کا امکان پیدا ہو گیا جس نے انیسویں صدی میں ایک عظیم انقلاب صنعت و حرفت میں پیدا کر کے اس کے اثرات کو بہت زیادہ مستحکم کر دیا۔

آتشک محققین کے نزدیک ابھی تک یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا کہ آتشک کی ابتداء کہاں اور کیونکر ہوئی۔ بعض شہادتیں اس نظریہ کی موید ہیں کہ جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اس وقت تک مرض آتشک اہل یورپ کو معلوم نہیں تھا اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ کولمبس کے ساتھ گئے تھے ان میں سے بعض ۱۴۹۳ء اور ۱۴۹۴ء میں یہ بیماری جزیرہ ہائٹی (Haeti) سے لائے۔

پندرھویں صدی کے آخر میں تمام یورپ میں آتشک کی بیماری وبا کی طرح پھیل گئی۔ جب چارلس ہشتم شہر نیپلز میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا

کہ لوگ ایک بیماری میں مبتلا ہیں جسے وہ "مرض الافرنج French Malady" یعنی فرانسیسی بیماری کہتے ہیں اور ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بیماری فرانسیسی سپاہیوں کی لائی ہے۔ لیکن درحقیقت اس مرض کے ذمہ دار وہ ہسپانوی سپاہی تھے جو چارلس کی فوج میں ملازم تھے۔

بلاد اطالیہ کی یہ "فرانسیسی بیماری" بہت جلد سواحل شمالی افریقہ اور انگلستان میں پہونچی اور وہاں "ہسپانوی بیماری" کے نام سے مشہور ہوئی۔ پرتگال میں اس کا نام "مرض قسطانہ" تھا اور سواحل شام و فلسطین پر اس کا نام "آبلہ فرنگ" یا مسیحی بیماری مشہور ہوا اور جب یہ ناپاک بیماری اقصائے مشرق میں پہونچی تو وہاں "مرض پرتگیزی" کہلانے لگی۔ یہ بات بہت جلد ظاہر ہو گئی تھی کہ یہ خوفناک بیماری مجامعت سے پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً جب کسبیوں سے واسطہ رکھا جائے چنانچہ سنہ ۱۵۰۰ء سے قبل ہی اس انکشاف کی بناء پر بعض مقامات میں قحبہ خانے بند کر دیئے گئے اور بہت سے شہروں میں احکام جاری ہو گئے کہ جو کسبیاں مبتلائے آتشک ہوں وہ اپنا کام بند کر دیں۔

اس جدید مرض متعدی کا علاج کرنے پر اطباء عام طور سے راضی نہ ہوتے تھے اور جن اطباء نے اپنے پیشہ کی عزت و شان کا خیال نہ رکھ کر آتشک زدہ مریضوں کا علاج بھی کیا تو وہ مرض کو شفا دینا تو کجا اس کی رفتار کو بھی نہ روک سکے۔ اس مرض کے معالجہ میں عموماً چوب چینی استعمال کی جاتی تھی۔ سنہ ۱۴۹۶ء میں بمقام وینس اور سنہ ۱۴۹۷ء میں بمقام پیرس بہت جلد "آتشک خانے" تعمیر کر دیئے گئے۔

اگرچہ آتشک زدہ کسبیوں کے خلاف احکام جاری کرنا بہت اچھی بات تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اربابِ حل وعقد کو معلوم بھی نہ ہونے پاتا تھا کہ کون آتشک زدہ ہے اور کون نہیں۔ اس کے بعد ضرورت ہوئی کہ قحبہ خانوں کی کسبیوں کا معائنہ کرایا جائے اور جن پر آتشک زدہ ہونے کا شبہ ہو انھیں شہر بدر کر دیا جائے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شہر سے باہر جا کر اپنا پیشہ کرنے لگتی تھیں اور بیماری کو پھیلاتی تھیں۔

سن ۱۵۱۰ء تک ہسپانیہ کے شہر ویلنشیا (Valencia) میں طبی معائنہ کا ایک نظام قائم ہو گیا تھا۔ ہر عورت کو جو قحبہ خانہ میں داخل ہونا چاہتی طبیب سے ایک سند حاصل کرنا پڑتی تھی اور میونسپلٹی کے اسپتال میں ایسی گندی بیماریوں کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا۔ جب سرکاری طبیب کسی کو آتشک زدہ خیال کرتا تھا تو اس کا علاج اسی جگہ ہوتا تھا قحبہ خانے کے مہتموں کو حکم تھا کہ اگر کسی پر آتشک کا شبہ ہو جائے تو فوراً رپورٹ کریں۔ لیکن فی الحقیقت یہ طبی قیود بے سود ثابت ہوئیں۔

پیرس کے اربابِ حل وعقد نے سنہ ۱۶۱۴ء تک کوئی اسپتال ایسا نہیں کھولا تھا جو آتشک زدہ مریضوں کے علاج کے لیے موزوں ہو۔ اس سے پہلے آتشک زدہ کسبیوں کو بغرض معالجہ ہر جگہ داخل کر لیا جاتا تھا اور آتشک زدہ مردوں کو بھی بڑے اور چھوٹے شفاخانوں میں داخل کر لیتے تھے۔

اٹھارھویں صدی تک بھی پیرس کی کسبیاں سرکاری طور پر علاج کرانے سے گریز کرتی تھیں۔ کیونکہ شفاخانوں میں ایک تو کھانا اچھا نہیں ملتا تھا۔

دوسرے طرز بود و ماند بھی سخت ناپسندیدہ تھا اور ایک ہی کمرہ میں آٹھ آتشک زدہ عورتیں سویا کرتی تھیں۔ علاوہ اس کے علاج بھی داخل ہونے سے مہینوں بعد تک شروع نہ ہوتا تھا۔ ان کو علاج کے لیئے نمبروار انتظار کرنا پڑتا تھا اور جب تک کسی کا نمبر آتا تھا۔ اُس وقت تک بیماری ناقابلِ علاج ہو جاتی تھی۔ نہانے دھونے کے لیئے کوئی سہولت نہ تھی۔ پلنگ کی چادریں بھی بہت کم تھیں اور جو تھیں بھی وہ برسوں دھوبی کا منھ نہ دیکھتی تھیں۔

عہد جمہوریت میں بہت سی اصلاحات جاری ہوئیں یعنی ایک نیا شفاخانہ ایسے مریضوں کے لیے تعمیر کیا گیا جس میں چمن اور غسل خانے بھی تھے اور علاج میں بھی کافی سہولتیں تھیں۔ مردوں کے لیے علیحدہ شفاخانہ بنا دیا گیا عورتوں کے لیے علیحدہ

۱۸۰۳ء تک پیرس کی کسبیاں باقاعدہ طبی معائنہ کے لیے مجبور نہ کی جاتی تھیں وہ معائنہ کنندہ کو ایک خاص فیس ادا کیا کرتی تھیں اور یہ حضرت معائنہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے تھے اس لیے بعد میں طبی معائنہ میں سختی کی گئی اور اچھے اچھے اطبا کی خدمات اس کام کے لیے حاصل کی گئیں۔

جب آتشک کی بیماری تمام یورپ میں وبا کی طرح پھیل گئی تو اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ انفرادی حیثیت سے اس ناپاک مرض کی رفتار کو کیونکر روکا جائے بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کر کے نوجوانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ

تجبہ خانوں سے پرہیز کریں - لیکن اس کا اثر کچھ نہ ہوا۔

الغرض سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک انسداد آتشک کی جو کوششیں بھی ہوئیں وہ اکثر ناکام رہیں اور اس سلسلہ میں نہ تجبہ خانوں کا کوئی معقول انتظام ہو سکا نہ فحاشی کو دنیا سے مٹایا جا سکا۔

اصلاحات فرقۂ پروٹسٹنٹ

جب سنہ ۱۵۱۱ء میں مارٹن لوتھر شہر روما گیا تو وہ پکا رومن کیتھولک تھا، لیکن جو کچھ اُس نے وہاں دیکھا اُسی نے اُس کو پروٹسٹنٹ بنا دیا۔ اُس زمانہ میں دو باتیں خاص طور پر دنیا میں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ بڑے بڑے مذہبی عہدے فروخت کیے جاتے ہیں۔ دوسرے جو لوگ پاپائے اعظم کے عزیز یا رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ان کا خاص لحاظ کیا جاتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں سے زیادہ جس چیز نے اس کی طبیعت پر اثر کیا وہ یہ تھی کہ پاپائے اعظم کے مقدس دربار میں حد درجہ فحاشی ہوتی تھی۔ اُس وقت شہر روما کسبیوں سے اور عہدیداران کلیسا کی آشناؤں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا اور مذہبی جوش و خروش قطعی مفقود تھا۔ اس نوجوان پادری نے دفعتاً کوئی جدید مسلک جاری نہیں کیا بلکہ سب سے پہلے اس نے وہ اسباب پیش کیے جن کی بنا پر وہ کلیسا سے باغی ہوا تھا، اِس نے سنہ ۱۵۱۷ء تک جبکہ ٹزیل (Tetzel) (ایک اعلیٰ عہدیدار کلیسا) نے پادریوں کے حقوق فروخت کرنے شروع کیے اپنا یہ عقیدہ علی الاعلان ظاہر نہیں کیا کہ "نجات صرف دین سے حاصل ہو سکتی ہے"۔ اس کے دو سال بعد اس مصلح نے اعلان کر دیا کہ پاپائے اعظم اور اُس کی کونسل

معصوم نہیں ہیں۔ ۱۵۲۵ء میں (اور یہی بات ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے) لیوتھر نے کیتھرینا فان بورا سے نکاح کر لیا جو راہبہ تھی اور لیوتھر کی طرح ہمیشہ تنہا رہنے کا عہد و پیمان کر چکی تھی۔

وہ کہتا تھا کہ جس طرح کھانا پینا اور سونا فطری باتیں ہیں اسی طرح عورت مانند مرد کا ملنا بھی حسب تقاضائے فطرت ہے۔ ایک روز اس نے بیان کیا کہ:-

"اصول ازدواج تمام مخلوقات میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ جانور تو درکنار پیپل تک نر و مادہ سے خالی نہیں ہیں۔"

لہٰذا پادریوں کا تجرد سخت لغو بات ہے۔

لیوتھر کا عقیدہ تھا کہ مرد عورتوں سے افضل ہیں۔ وہ نہایت شد و مد کے ساتھ کہتا تھا کہ عورت کو لازم ہے کہ اپنے شوہر کی مرضی کے تابع رہے۔ ریاست ہیسی (Hesse) کے بادشاہ فلپ کا قول یہ تھا کہ طلاق دے کر عورتیں چھوڑنے سے یہ بہتر ہے کہ مرد کثرت سے عورتیں رکھے۔ جو شادی شدہ عورتیں لاولد رہتی تھیں وہ ان کو یہ صلاح دیا کرتا تھا کہ وہ بچہ جننے کے لیے خفیہ طور پر کوئی دوسرا خاوند رکھ لیں۔ لیوتھر کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک عورت کے اولاد نہ ہو وہ مکمل نہیں ہوتی۔ قرونِ وسطیٰ کے اِس عقیدہ کی لیوتھر سخت مخالفت کرتا تھا کہ عورتیں قابل نفرت ہیں اور ناپاک اور گنہگار ہیں مگر اسے اس خیال سے ہرگز اتفاق نہ تھا کہ فحاشی ایک ناگزیر معصیت ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب جانتا تھا کہ ایک جوان آدمی بالطبع خواہ کتنا ہی شہوت پرست کیوں نہ ہو لیکن وہ اگر چاہے تو مجرد رہ سکتا ہے۔ اسی لیے وہ قحبہ خانوں کے خلاف کھلم کھلا وعظ

کہا کرتا تھا۔ ۱۵۶۲ء میں جب بلدیۂ نورمبرگ کے ارباب حل وعقد نے شہر کا قحبہ خانہ بند کیا تو انھوں نے ایک وجہ یہ بتائی کہ اس کے سبب سے آتشک پھیلتی ہے اور دوسری وجہ یہ ظاہر کی کہ بعض پروٹسٹنٹ پادریوں کے وعظ ونصیحت نے انھیں ایسا کرنے پر مائل کیا۔ اسی طرح جب قحبہ خانوں کے خلاف لگاتار وعظ ہوئے تو ۱۵۴۳ء میں شہر اُلم کا قحبہ خانہ بند کر دیا گیا اور فرینکفرٹ اور دیگر بلاد میں بھی اس کا تتبع کیا گیا۔ مگر یہ امتناعی احکام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔

لیوتھر راہبوں اور ننوں کو نصیحت کرتا تھا کہ وہ نکاح کرلیں جس کا سبب یہ تھا کہ تجرد کی زندگی میں وہ بہت زیادہ گناہ کے مرتکب ہوتے تھے ورنہ یوں تو اس کے نزدیک میاں بیوی کے تعلقات بھی ناجائز تھے اگر ان میں لذت نفسانی شامل ہو جائے۔

پروٹسٹنٹ فرقہ کی بعض انتہا پسند جماعتیں جو لیوتھر کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں وہ بلا قید نکاح عورتوں سے جنسی تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک اُن کا معیار اخلاق بمقابلہ کیتھولک یا پیروان لیوتھر زیادہ بلند تھا۔ وہ کہتے تھے کہ انفرادی حیثیت سے کسی قسم کی ملکیت یا جائداد رکھنا فرمان یسوع کے قطعی خلاف ہے۔ فرقۂ موراویہ (Moravians) میں جنھیں "اخوان متحد" (United Brothers) بھی کہتے تھے عام رواج تھا کہ عورت مرد کا جوڑا قرعہ اندازی سے ملاتے تھے کیونکہ ان کے یہاں یہ تعلیم تھی کہ انسان کو ہرگز حصول انفرادیت کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔

لیوتھر کے علاوہ ایک اور شخص کالوین فرانس میں پیدا ہوا۔ اوّل اوّل اُسے مذہبی تعلیم دلائی گئی تھی لیکن بعد کو اس کے والد نے اس پر زور دیا کہ وہ پیشۂ وکالت اختیار کرے۔ چونکہ اس زمانہ میں اہل کلیسا سخت بدچلن تھے اس لیے کالوین اکیس[۲۱] سال کی عمر میں پیشۂ وکالت ترک کر کے اصلاحِ کلیسا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر جب اہل کلیسا نے اسے بہت پریشان کیا تو وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گیا۔ مگر جنیوا پہنچ کر اس کا اثر اور زیادہ بڑھ گیا اور سیاسی سرِ دار بھی بن گیا۔ کالوین ایک زاہد خشک آدمی تھا۔ اس کا سب سے پہلے خیال یہ تھا کہ فحاشی کا استیصال کیا جائے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ اس نے تھیٹر بند کرا دیے۔ بہت سے تہوار موقوف کر دیے اور ہر قسم کے جشن شادمانی کے خلاف فتویٰ دیدیا۔ جان ناکس (Knox) نے جو کالوین ہی جیسا خشک مزاج آدمی تھا، کالونیٹ کی تبلیغ اسکاٹ لینڈ میں کی جہاں اس کا نام (PresByTerianism) ہوا۔

لیکن یہ ناممکن تھا کہ کالوین اور ناکس جیسی طبیعت اُن کے تمام مریدوں کی بھی ہوتی۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ جب لوگوں کی رنگ رلیاں بند کر دی گئیں تو ملک میں دیگر قسم کے افعالِ شنیعہ کی وبا پھیل گئی اور فحاشی خفیہ طور پر ہونے لگی۔

دورِ احیاءِ علوم و فنون

قرونِ وسطیٰ کے فنونِ لطیفہ کا تعلق تمام تر کلیسا ہی سے تھا۔ بڑے بڑے گرجا۔ مقدس تصویریں۔ پادریوں کے مجسمے وغیرہ سب مشہور و معروف مصوروں اور ماہرینِ فنون

لطیفہ ہی کے رہین منت تھے۔ عریاں تصاویر اور بتوں کا تعلق بھی زیادہ تر کلیسا ہی سے تھا۔

اس دور کا آغاز اطالیہ سے ہوا اور تمام یورپ میں پھیل گیا۔ سولھویں صدی میں جو انگریز سیاح اطالیہ سے اپنے وطن کو واپس آتا تھا تو جدید تہذیب سے پوری آراستہ ہو کر آتا تھا، اسے لاطینی و یونانی ادبیات کا شوق ہوتا تھا، اسے فلورنیس۔ روما اور وینس کی تصاویر، بت تراشی اور فن شعر میں درک ہوتا تھا علم مجلس میں بھی طاق ہوتا تھا اور اپنے احباب میں اطالوی عیش پسند امراء کی رنگ رلیوں کے حالات بیان کرتا تھا، اس وقت اطالیہ کی آزادی و خوش عیشی کا یہ عالم تھا کہ دسترخوان پر جو ظروف نقرئی رکھے جاتے تھے ان پر بھی عریاں و فحش تصویریں منقوش ہوتی تھی۔

احیاء علوم و فنون کے زمانہ میں اطالیہ کے اندر بہت کم کسبیاں اچھی تعلیم یافتہ تھیں لیکن کسی قدر ادبیات اور موسیقی کی تعلیم ان کو ضرور دی جاتی تھی ان میں سے بعض اپنی حاضر جوابی اور شیوا بیانی کے لیے مشہور تھیں لیکن یہ باتیں انہی کے لیے مخصوص نہ تھیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں مصر کی عورتوں میں بھی بہت آزادی پیدا ہو گئی تھی اور بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی و خوش لباسی میں وہ کسبیوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔

اس وقت ایک دو کسبیاں شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی ممتاز تھیں، اور ایسی تو اکثر تھیں جو مصوروں اور بت سازوں کے سامنے بیٹھ کر اپنے خوبصورت جسم کا نمونہ پیش کیا کرتی تھیں۔

اعلیٰ طبقہ کی کسبیوں میں روزانہ غسل کرنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا اور وہ پانی میں قیمتی عطر اور خوشبوئیں ڈال کر نہایا کرتی تھیں۔ سولھویں صدی میں اطالوی کسبیاں سنہرے بال بے حد پسند کرنے لگیں اس لیے جن کے بال قدرتاً سنہرے نہیں ہوتے تھے وہ اپنے بالوں کا رنگ مختلف طریقوں سے اڑا کر سنہرا بنایا کرتی تھیں۔

زیادہ مشہور اور اونچے درجہ کی کسبیاں لباس اور زیور پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کیا کرتی تھیں اور جو زیادہ صاحب استطاعت تھیں وہ خواتین دربار کا سا بیش قیمت لباس پہنتی تھیں۔ مجموعاً یہ عورتیں غازہ، سفیدہ اور خضاب و رنگ استعمال کرتی تھیں جس کا مقصد زیب و زینت نہیں بلکہ اپنے معائب چھپانا ہوتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں کسبیوں کو جو امتیازی نشانات استعمال کرنا پڑتے تھے وہ رفتہ رفتہ غائب ہو گئے تھے اور لباس کی یک رنگی و یکسانی میں سب عورتیں برابر تھیں۔ قیمتی لباس، ریشمی کپڑے، نفیس زیور کا ہر جگہ ہر طبقہ میں رواج ہو گیا تھا اور آرائش زیبائش معاشرت کا ضروری جزو ہو کر رہ گئی تھی۔

واضح ہو کہ انگریزی لفظ "کورٹی زن" (Courtesan) (کورٹ + زن = درباری عورت) غالباً فرانسیسی لفظ "کورٹی زین" (Courtisane) (کورٹ + زین = زینت دربار) سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "دربار شاہی کی عورت"۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ بالواسطہ یا بلاواسطہ اطالوی لفظ "کورٹی انا" (Courtegiana) سے نکلا ہو جو سولھویں صدی میں اونچے درجہ

کی کسبیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ درباِ شاہی کی عورتیں کیسی اخلاق کی ہوتی تھیں۔ ان درباری عورتوں میں درباریوں کی بھی بیویاں ہوتی تھیں اور معمولی لوگوں کی بھی۔ یہ شائستہ فحاشی قدیم یونانی یا رومی فحاشی کا تتمہ نہ تھی بلکہ قرونِ وسطیٰ کی اُن ترقی یافتہ فحاشیوں کی ایک لفریب صورت تھی جس نے قرونِ وسطیٰ کی آخری صدیوں میں بادشاہ، پاپائے اعظم اور امراء و شہزادگان کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ دولت کے دریا بہتے ہوئے اطالیہ میں چلے آتے تھے "تکلفات" اور عیش پرستیوں کا سیلاب اُمنڈ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ متعدی بیماری طبقۂ اعلیٰ سے گزر کر طبقۂ اوسط و ادنیٰ میں بھی پھیل گئی اور اطالوی تہذیب فرانس۔ انگلستان۔ بلجیم۔ ولندیز اور جرمنی پر بھی مسلط ہو گئی۔

اگرچہ وقتاً فوقتاً تدابیر انسداد عمل میں لائی جاتی۔ لیکن بایں ہمہ استلذاذ بالمثل قرونِ وسطیٰ کے اطالیہ میں نہایت استحکام کے ساتھ جڑ پکڑتا جاتا تھا، حُسن پرستی زن و مرد دونوں کا مشغلہ تھا اور ابتدا ہی سے نوعمر لڑکے اطالوی کسبیوں کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔ آخرکار شہرِ وینس میں کسبیوں نے مجبور ہو کر مردوں کا لباس پہنا اور لڑکوں کی طرح بال بنانے شروع کر دیے، تاکہ لوگوں کے اِس ذوق کو بھی تسکین پہنچے۔

اطالیہ سے یہ علت فرانس میں پھیلی اور شاہ ہنری ہشتم اِس باب میں بہت مشہور ہو گیا۔ لوئس چہاردہم کے زمانہ میں دربار کے اندر ایک "کلب" ہی اس مقصد کے لیے قائم ہو گیا۔ انگلستان میں جب دورِ ملوکیت دوبارہ

قائم ہوا تو وہاں کے طبقۂ امراء میں بھی اس کا شوق پایا جاتا تھا۔

معاشری و صنعتی تغیرات

سولھویں صدی کے اوائل میں اہل یورپ کی اکثریت زراعت و فلاحت میں مصروف رہتی تھی، لوگ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ کبھی کبھی پھیری والے بساطی یا ناچنے گانے والوں کی ٹولیاں گاؤں میں آجاتی تھیں۔ گاؤں والوں کی دنیا ان کا وہی چھوٹا سا مزرعہ اور اس کے اردگرد کی قابل کاشت زمین تھی۔ ان کے خیال میں سب سے بڑی عظمت و جلال والی چیز قریب ترین قصبہ کا بڑا گرجا تھا۔ جسے غالباً انھوں نے کبھی دیکھا نہ تھا بلکہ صرف اس کا حال سن لیا تھا۔ لیکن قصبہ اور شہر کے باشندوں کا مطمح نظر اس قدر محدود نہ تھا۔ اُن کی ملاقات بڑے بڑے سیاح تاجروں سے ہوتی رہتی تھی۔ مذہبی زیارتوں اور حروب صلیبیہ کی وجہ سے مختلف اقوام وملل کے لوگوں سے ربط ضبط پیدا ہوگیا تھا لیکن اِن لوگوں میں سولھویں اور سترھویں صدی تک قومیت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ طلباء کی مشترکہ زبان ضرور لاطینی تھی اور ہر جگہ شریعت عیسوی کا زور شور تھا جس کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اخلاقیاتِ جنسی کو تارِ عنکبوت کی طرح توڑ دیا جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں جس قدر یکسانیت و ہم آہنگی نظر آتی تھی عہد جدید میں اُسی قدر اختلاف و تضاد دکھائی دیتا ہے۔ بعض مقامات بلحاظ تجارت وصنعت بہت جلد ترقی کر گئے اور بعض کی حالت وہی رہی جو قرونِ وسطیٰ میں تھی۔ اب لوگ ہر چیز کو وطنیت کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور تمام

مغربی اور وسطی یورپ میں پاپائیت کی جگہ مختلف مذہبی اور فرقہ وارانہ جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ باہر سے قہوہ اور چائے آنے لگی تھی اور ان کے آتے ہی ملک میں قہوہ خانے کھلنے شروع ہو گئے تھے جو بعد کو قحبہ خانوں کا کام دینے لگے وینس اور پیرس کی عورتوں کے لیے دُور دُور سے عطریات آنے لگے امریکہ سے تمباکو بھی آ پہنچا۔ جس کے آتے ہی تمام یورپ خصوصًا بلاد جرمن میں تمباکو کی دوکانیں کھل گئیں اور کسبیوں کو سگرٹ نوشی کا شوق ہو گیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اب تک تمباکو پینے والی عورتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں بھی نشی چیزوں کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن سولھویں صدی سے تو شراب کا استعمال نمایاں طور پر بہت بڑھ گیا، کیونکہ کاریگروں اور مزدوروں کے پاس بھی اسباب تعیش کے لیے روپیہ کافی موجود تھا۔

جس زمانہ کا ہم حال بیان کر رہے ہیں اُس زمانہ میں شراب خانوں اور شراب کے گوداموں کا فحاشی سے بیحد تعلق تھا اور اٹھارویں صدی میں ایسے میخانے جہاں لطف رقص و سرود بھی حاصل ہوتا بہت ترقی کر گئے تھے۔

تجارت و حرفت کی ترقی سے ملک میں بڑے بڑے شہر پیدا ہونے لگے۔ چودھویں صدی کے لندن کی آبادی صرف ۳۵ ہزار تھی۔ لیکن ۱۶۰۰ء میں ڈھائی لاکھ ہو گئی، ۱۷۰۰ء میں سات لاکھ اور ۱۸۰۰ء میں دس لاکھ کے قریب ہو گئی۔ پیرس میں، جو قرونِ وسطیٰ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا، اُس وقت اس کی آبادی ایک لاکھ تھی ہو ۱۷۰۰ء میں ۵ لاکھ ہو گئی اور انقلاب فرانس کے

وقت سات لاکھ۔ اسی طرح وانا کی آبادی جو ۵۰ ہزار تھی ۱۸۰۰ء تک چوگنی ہو گئی۔ شہر ہیمبرگ عہد وسطیٰ میں ایک اہم تجارتی شہر تھا اور اُس وقت اس کی آبادی تقریباً ۲۰ ہزار رہ گئی مگر یہی آبادی ۱۸۰۰ء تک ایک لاکھ ہو گئی۔ الغرض جو مقامات قرونِ وسطیٰ میں محض چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے وہ ۱۸۵۰ء تک بڑے بڑے شہر بن گئے تھے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ قوم کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا، بلکہ دراصل گاؤں کی آبادی شہروں میں آگئی تھی۔

دورِ جدید کی ابتدائی صدیوں میں جوں جوں صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت اور کاروبارِ تجارت کو ترقی ہوتی گئی۔ خوشحالی بھی بڑھتی رہی۔ کیونکہ انقلاب فرانس کے بعد بہت سے قیود رفع ہو گئے تھے اور قرونِ وسطیٰ کے آئین و قوانین اور حرفتی پنچایتیں بھی رو بہ زوال تھیں۔

سولھویں صدی میں اسپین کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ اسے نئے نئے ملک مل گئے تھے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی نصف آبادی کی بسر اوقات تجارت و حرفت خصوصاً اُونی و ریشمی کپڑوں کی صنعت پر تھی لیکن اسے بھی زوال ہو گیا کیونکہ مذہبی تعصبات سے مجبور ہو کر عیسائیوں نے ملک سے تمام مسلمانوں اور یہودیوں کو نابود کر دیا تھا اور یہ مشہور صنعت و حرفت انہی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔

عہد جدید کی ابتدائی صدیوں میں انگلستان اور یورپ کے نشیبی ممالک یعنی بلجیم اور ولندیز نے بہت جلد ترقی کی۔ بعد ازاں جرمنی خصوصاً ریاست پروشیا کو اہمیت حاصل ہوئی۔ جوں جوں قرونِ وسطیٰ کی بیڑیاں کٹتی گئیں سائنسداں

لوگ دل لگا کر کام کرنے لگے۔ ایجادات و اختراعات کا بازار گرم ہو گیا۔ میکانکی ترقیاں ہونے لگیں اور شہروں کی حالت بالکل بدل گئی۔

انگلستان میں جو حرفتی انقلاب واقع ہوا وہ اٹھارویں صدی کے آخری دس سال اور انیسویں صدی کے ابتدائی بیس سال کے اندر رونما ہوا۔ بعد ازاں یہ حرفتی انقلاب تمام یورپ، امریکا اور ایشیا تک وسعت پذیر ہو گیا۔ اس زمانہ میں مختلف قسم کی ترقی یافتہ مشینیں وجود میں آئیں۔ ذرائع نقل و حمل میں ترقی ہوئی اور بڑے بڑے کارخانے تعمیر ہو گئے۔ مشینوں کی ایجاد سے حرفت کی یہ حالت ہو گئی کہ گاؤں کا ایک کسان یا شہر کا ایک کاریگر بہت سے آدمیوں کا کام جو پرانی وضع کے بھدے اوزاروں سے کام کرتے تھے، تن تنہا کر لیتا تھا۔ اس سے نہ صرف کامیاب سرمایہ داروں کے گھروں میں دولت کے انبار لگ گئے بلکہ عوام بھی مالدار ہو گئے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قرونِ وسطیٰ کے بادشاہ کو بھی اتنا سامان راحت و آرام حاصل نہ تھا جس قدر عہد جدید کے ایک گدا کو حاصل ہو گیا۔ لیکن اس انقلاب کا ابتدائی زمانہ کاریگروں کے لیے نہایت سختی کا زمانہ تھا۔ کیونکہ مشینوں کی ایجاد نے ان کو بالکل نادار بنا دیا تھا اور ان کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔

مثلاً ایک جولاہے کو لیجیے کہ جب یہ خود کام کرتا تھا تو اس کے کارخانہ میں دو چار کاریگر بھی تھے۔ جن میں ہر شخص فی ہفتہ قمیص کے قابل دو تھان اتارتا تھا لیکن جب مشینیں چل گئیں جن کے ذریعہ سے ایک ناتجربہ کار بچہ بھی ایک ہفتہ میں ایسے تھان دس سے لے کر بیس تک اتارنے لگا تو قدرتی بات تھی کہ

قیمت کم ہو جائے لیکن اس منفعتِ عامہ سے اس غریب جُلاہے کی کمر ٹوٹ گئی جس کا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا اور جسے مجبور ہو کر اپنے لڑکوں کو دو چار آنے کی مزدوری پر کسی کارخانہ میں بھیجنا پڑا۔ رہ گئیں لڑکیاں سو جب تک باپ کا کام اچھا چلتا تھا دُنیا بھر کی نعمتیں حاصل تھیں لیکن اب بقدرِ کفاف بھی اُنھیں میسّر نہ تھا، اس لیے وہ نہایت آسانی سے مکّار کٹنیوں کے پھندے میں پھنس جاتی تھیں اگر وہ کسی کارخانہ میں جا کر کام کرتیں تو وہاں بھی کوئی عزّت نہیں کرتا تھا، سرمایہ داروں کو جن کے گھر دولت کے انبار لگ گئے تھے بہت بڑی سیاسی طاقت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ اس لیے انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جس کی رُو سے گداگروں کی اولاد کو کام کرنے پر مجبور کیا گیا اور پانچ پانچ چھ چھ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں سے روزمرہ تیرہ چودہ گھنٹے تک مشینوں پر کام لیا جانے لگا۔ مشینوں اور کارخانوں کے نگراں کار مزدوروں اور کاریگروں سے وہی برتاؤ کرنے لگے جو گرفتار شدہ غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کارخانے صبح چھ بجے کھلتے تھے اور اگر کسی جُلاہے کی لڑکی رات کو دیر تک سوتی رہی یا جاگے چھ بجے کے چھ بجکر پانچ منٹ پر پہونچی تو اُن کو چابک سے مارا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کے جدید انگلستان میں چونکہ کارخانوں کے مہتمموں کو مزدوروں کے علیحدہ کرنے کے اختیارات حاصل تھے اس لیے کام کرنے والوں کے لیے اور زیادہ دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے اور جو نتائج بھی پیدا ہوتے ہوں۔ لیکن ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جو لڑکیاں وہاں کام کرتی تھیں اُن کا

چال چلن خراب ہوگیا اور قحبہ خانے اُن سے آباد ہونے لگے۔

۱۸۴۸ء میں "لندن ٹائمز" کا ایک نامہ نگار شہر کے ایک محتاج خانہ کا معائنہ کرنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ تمام بچے تندرست اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ لیکن لڑکیاں وہاں موجود نہ تھیں، نامہ نگار نے مہتمم سے دریافت کیا کہ لڑکیاں کیا ہوئیں تو اُس نے جواب دیا کہ چودہ سال کی عمر تک لڑکیوں کو بطور خادمہ کام کرنے کے لیے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوّے فی صدی ان میں سے کوچہ گرد کسبیاں بن گئیں۔ کیونکہ اُس وقت یورپ کے اکثر ممالک میں قحبہ خانوں کی اہمیت بہت کچھ زائل ہوگئی تھی اور آزادانہ اِدھر اُدھر پھر کر فحاشی کرنے کے مواقع بہت حاصل تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کے اندر قحبہ خانوں کا کام حماموں سے بھی لیا گیا اور یہ سلسلہ اٹھارویں صدی تک جاری رہا۔ لیکن ۱۸۰۰ء میں بعض ممالک کے اندر ساحلی تفریح گاہیں بھی جو اِس مشغلہ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔

اسی طرح تھیٹر بھی بہت دنوں تک یہ خدمت انجام دیتے رہے چنانچہ شیکسپیر کے زمانہ میں بھی انگلستان کے بیشتر قحبہ خانوں کے قریب ہی ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تھیٹر کی زندگی معیوب سمجھی جاتی تھی اور اسٹیج پر کوئی عورت کام نہیں کرتی تھی۔ تماشائی بھی اکثر مصنوعی چہرے لگا کر آیا کرتے تھے اور اس طرح کسبیوں کو بھی مصنوعی چہرے لگا کر تھیٹر میں جانے کا موقع مِل جاتا تھا۔ جب انگلستان میں دوبارہ ملوکیت دوبارہ قائم ہوگیا تو تھیٹروں

نمور پیشہ ور عورتوں میں اور زیادہ تعلق پیدا ہو گیا۔ یعنی عورتیں بھی تھیٹروں میں زنانہ پارٹ کرنے لگیں، جن میں اکثر کا چال چلن اچھا نہیں ہوتا تھا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں فرانس کے اندر مشتبہ چلن کی ایکٹرسیں بہت مشہور تھیں اور تھیٹروں کی غلام گردشوں اور گیلریوں میں کسبیوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔

فرانس سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

فرانسیس اول کے عہد میں (سنہ ۱۵۱۵ء سے سنہ ۱۵۴۷ء تک) فرانس اور خصوصاً دربار شاہی پر اطالوی اثرات بہت زیادہ قائم تھے اور لوئی چہاردہم کا جانشین ہنری دوم تو حد درجہ رنگیلا فرمانروا تھا اور اس کے دربار میں عیش و نشاط کی غیر فطری صورتیں بھی ممنوع نہ تھیں۔

کیتھرائن ڈی میڈیا Catharine De Medici اپنے ساتھ اطالیہ سے سینکڑوں کسبیاں فرانس میں لے آئی تھی اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان عورتوں سے سیاسی کام لیا کرتی تھی یعنی اُن کو حکم تھا کہ وہ مدبرین دربار سے مل کر ان کے راز معلوم کرتی رہیں۔

چارلس نہم کے عہد میں ایک قانون پاس کیا گیا کہ پیرس کے تمام قحبہ خانے توڑ دیے جائیں اور خلاف ورزی قانون کے لیے سزائے چوب زنی یا گرم لوہے سے داغ دینا مقرر کیا گیا۔ اُس سے وہ قحبہ خانے تو بند ہو گئے جن میں کھلم کھلا فحاشی ہوتی تھی لیکن خفیہ طور پر یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ سنہ ۱۶۳۵ء میں اُن مردوں کے لیے جو کسبیوں کے ذریعہ سے کسب معاش کرتے تھے۔

تعزیری قانون وضع کیا گیا اور سترھویں صدی میں بعض فرامین ایسے جاری کیے گئے جن کی رُو سے اُن مردوں کو سزائے جرمانہ دی جاتی تھی جو قحبہ خانوں میں آتے جاتے تھے، لیکن سوائے ایک مرتبہ کے عملاً ان فرامین کا نفاذ کبھی نہیں ہوا۔

پولیس کو بہت وسیع اختیارات دیئے گئے تھے اور کئی بار پولیس نے اُن اختیارات سے کام لے کر پیرس کی پیشہ ور عورتوں کو گرفتار کر کے فرانس کی امریکانی نوآبادیات میں بھیج دیا۔ جن میں سے بعض نے تو خوش حال لوگوں سے نکاح کر لیا لیکن بعض نے اپنے پیشہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

لوئی چہاردہم کے زمانہ میں تقریباً بیس برس تک پیرس کے لوگوں کے اخلاق غنیمت رہے یعنی علانیہ فحاشی تقریباً مفقود ہو گئی اور تھیٹروں میں بھی بیہودہ مذاق قطعی بند ہو گیا لیکن لوئی پانزدہم کی کمسنی کے زمانہ میں جب ایجنسی برسر اقتدار تھی پھر زورِ فحاشی شروع ہوا اور جب لوئی پانزدہم بڑا ہو گیا تو اُس نے حد درجہ رنگین زندگی بسر کرنی شروع کی۔ چنانچہ اس بادشاہ نے اپنے لیے ایک خاص عیش خانہ تعمیر کرایا اور پوری دادِ عیش دی۔

اس کے بعد لوئی شانزدہم اور اس کی ملکہ نے درستیِ اخلاق میں سختی سے کام لیا لیکن بایں ہمہ بہت سے شہزادوں اور بڑے بڑے اُمراء نے لوئی چہاردہم اور لوئی پانزدہم کی جوانی کی روایات کو بدستور قائم رکھا اور پرائیوٹ عیش خانے جنھیں خورد محل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا منہدم نہ ہو سکے اور بعد کو یہ ایک فیشن ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے وسط میں جب ایک

جرمن سیاح پیرس کی سیر کرنے گیا تو یہ بات دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کتنی بڑی تعداد آدمیوں کی فحاشی کے ذریعہ سے بسر اوقات کرتی ہے۔

بہت سے والدین اپنی لڑکیوں کو فحاشی پر مجبور کرتے تھے۔ کیونکہ لوئی پانزدہم کے گماشتے حسین و جمیل دوشیزہ لڑکیوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے تھے اور اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ کسی لڑکی کا بادشاہ کی معشوقہ بننا کوئی موقت کی بات نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اسی زمانہ میں تعزیری قوانین بھی فحاشی کے خلاف جاری تھے۔ لیکن ان کا نفاذ صرف غرباء کے خلاف ہوتا تھا اور امراء اور رؤساء عملاً مستثنےٰ تھے۔

اٹھارویں صدی کے قحبہ خانوں میں فرانسیسی، ہسپانوی، ولندیزی اور جرمن تمام اقوام وملل کی لڑکیاں پائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ حبشی لڑکیاں بھی رکھی جاتی تھیں۔ قحبہ خانوں کی بعض لڑکیاں اوسط درجہ کے اچھے گھرانوں کی ہوتی تھیں اور بعض راہبہ خانوں سے بھگائی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان قحبہ خانوں کو خوب شہرت دی جاتی تھی اور ان کے ایجنٹ غیر ملکی یا اجنبی سیاح کے سامنے ایک کارڈ پیش کرتے تھے جس پر قحبہ خانہ کا پتہ اور وہاں کی خصوصیات درج ہوتی تھیں۔

قحبہ خانوں کے منیجر چونکہ سامان خورد ونوش اور شرابیں بھی فروخت کرتے تھے، اس لیے ان کو بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ قحبہ خانے قمار خانے بن جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ جس عیش خانہ کا نام پہلے رائل (Palais Royal) تھا

وہاں ہر شب ڈیڑھ ہزار عورتیں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ اس جگہ تھیٹر بھی سے تھے۔ قہوہ خانے بھی تھے، فیشن ایبل دوکانیں بھی تھیں، آراستہ کمرے بھی تھے جن میں عورتیں رہتی تھیں اور بہت سے خوش وضع لوگوں نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ کلب بنا رکھے تھے۔

استیصال ملوکیت کے بعد فرانس کے دورِ آزادی نے جس قدر آزادی اس پیشہ کو دی اتنی بادشاہوں نے بھی کبھی نہ دی تھی۔ چونکہ اُس زمانہ میں لوگوں کی زندگی ہر وقت خطرہ میں تھی۔ اس لیے لوگ یہ سمجھ کر کہ چند روزہ زندگی میں جس قدر مزے اُڑائے جا سکتے ہیں، اُڑا لیئے جائیں، بری طرح شہوت رانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ کسبیوں پر الزام عائد کیا گیا کہ یہ طرفدارانِ ملوکیت میں سے ہیں کیونکہ جو بڑی بڑی رقمیں انھیں بادشاہ یا امراء کے ہاتھوں ملتی تھیں، وہ دورِ جمہوریت میں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔ لیکن آخرکار فتح کسبیوں ہی کو حاصل ہوئی اور حکومت کی طرف سے اجازت ہو گئی کہ جہاں چاہیں پھریں اور جو چاہیں کریں لیکن ۱۷۹۸ء میں یہ طریقہ جاری ہوا کہ ان کے نام درج رجسٹر کیے جانے لگے اور اُن کا باقاعدہ معائنہ ہونے لگا۔ پھر بعد کو یہ قاعدہ بہت جلد تمام بلادِ یورپ میں جاری ہو گیا۔

بعض مورخین لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۰ء بمقام پیرس تقریباً بیس ہزار کسبیاں موجود تھیں۔ ۱۸۳۲ء میں شہر کے اندر ایسے قحبہ خانے جو سرکاری رجسٹروں میں درج تھے ۲۲۰ تھے اور ایسی عورتوں کو بازاروں، گرجاؤں، اسکولوں یا طلباء کی اقامت گاہوں کے قریب رہنے کا حکم نہیں تھا۔ ہر قحبہ خانہ ایک

عورت کے اہتمام میں ہوتا تھا جس کا نام پولیس میں درج رہنا تھا یہ عورت وہ ہوتی تھی جو کبھی خود بھی پیشہ ور رہ چکی تھی لیکن کسی جرم میں سزایاب نہیں ہوئی تھی۔ اس کو حکم تھا کہ وہ قحبہ خانہ کی ہر عورت کا رجسٹر رکھے اور منجملہ دیگر امور کے یہ بھی لکھا کرے کہ سرکاری طبیب نے اس کا معائنہ کن کن تاریخوں میں کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بھرتی کرنے کا ایک خاص میدان تھا جہاں امراض متعدیہ میں مبتلا ہونے والی عورتوں کا علاج ہوتا تھا، انیسویں صدی کے وسط میں کسبیوں کی بہت بڑی بین الاقوامی تجارت بھی پائی جاتی تھی جس کا تعلق لڑکیوں کی خرید و فروخت سے تھا۔

سنہ ۱۸۴۰ء اور سنہ ۱۸۵۰ء میں پیرس کی کسبیوں کو تنخواہ کچھ نہیں ملتی تھی، بلکہ صرف کھانا کپڑا اور رہنے کو مکان ملتا تھا۔ اگر انھیں کوئی چھوٹا موٹا زیور، یا کوئی اور سامان تعیش درکار ہوتا تھا تو وہ مہتمہ سے قرض لے لیا کرتی تھیں اور چونکہ یہ دین کبھی ادا نہ ہو سکتا تھا اس لیے وہ بے چاریاں غلام بنی ہوئی قحبہ خانہ میں پڑی رہتی تھیں۔ چھوٹی عمر کی لڑکیوں کو قحبہ خانہ میں داخل کرنے سے قبل ان کے والدین کی اجازت لینی پڑتی تھی۔

انگلستان سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

سولھویں صدی کے اندر انگلستان میں کئی بار انسداد فحاشی کی کوشش کی گئی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیکسپیر کے زمانہ میں عورتوں کو بجرم فحاشی تازیانے مارے جاتے تھے لیکن پھر بھی ان کی تعداد کافی تھی۔

عیسائیوں کے فرقۂ پیورٹن (Puritans) نے کسبیوں کے خلاف نہایت تشدد آمیز آئین و قوانین اختیار کیے یعنی سنہ ۱۶۵۰ء میں ایک قانون وضع ہوا جس کی رُو سے کسبیوں کو سرِ عام کوڑے مارے جاتے تھے یا انھیں شکنجہ میں کس دیا جاتا تھا، یا لوہا گرم کر کے ان کی پیشانی پر حرف B داغ دیا جاتا تھا، یا انھیں تین سال کی قید کر دی جاتی تھی اگر ایسا شخص دوبارہ ماخوذ ہوتا تھا تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

جب شاہ چارلس دوم آوارۂ دشتِ غربت ہو کر واپس آیا تو اس کے بانکے سرباز وں نے یہ تمام طریقے درہم برہم کر دیے اور پھر رنگ رلیاں شروع ہو گئیں لیکن طبقۂ متوسط پر اس کا بہت کم اثر پڑا۔

چارلس کے بعد جیمس دوم تخت نشین ہوا جو یقیناً پارسا تو نہ تھا، لیکن چارلس کی طرح عیش کوش بھی نہ تھا۔ اس کے بعد جارج سوم کا زمانہ آیا جو بہت محتاط تھا لیکن جارج چہارم ایسا نہ تھا۔ ملکۂ وکٹوریہ کے زمانہ میں عصمت و عفت کا بڑا لحاظ تھا اور وہ فحاشی کے رواج کو بہت ناپسند کرتی تھی۔

جرمنی سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک	یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب "لیوتھر" کے مذہب کو عروج ہوا تو سولھویں صدی کے اندر سلطنت روم کے بہت سے

کیتھولک اور پروٹسٹنٹ حلقوں میں انسداد فحاشی کے متعلق سخت قوانین جاری کیے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد خاص طور سے ازباب کلیسا کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ سنہ ۱۵۳۳ء میں چارلس پنجم نے ایک فرمان۔

جاری کیا کہ فحاشی کے رواج دینے والوں کو کوڑے مار کر یا کان کاٹ کر ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ جرمنی میں بھی اسی قسم کے احکام جاری ہوئے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

سترھویں صدی میں ہمبرگ اور دیگر بلادِ جرمنی میں ایسے کارخانے قائم کیے گئے، جن میں نقضِ امن کا باعث ہونے والی کسبیاں قید رکھی جاتی تھیں۔ اس سے پہلے ان عورتوں کو یا تو شہر سے نکال دیتے تھے، یا کوڑے مارے جاتے تھے، یا انھیں شکنجہ میں کس دیا جاتا تھا۔ قید خانوں میں ان سے سوت کتوایا جاتا تھا۔ یا کوئی دوسرا سخت کام لیا جاتا تھا۔ لیکن فحاشی موقوف نہ ہوئی۔

سترھویں صدی میں بعض بعض جگہ ان کو پنجروں میں بند کر دیا جاتا تھا یا لکڑی کے گھوڑے پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جاتا تھا۔ شہر دانسا میں بھی اس غرض کے لیے ایک قفس بنایا گیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سزائیں ان کو شرم و غیرت دلانے اور رسوا کرنے کے لیے دی جاتی تھیں ان کا اثر الٹا پڑتا تھا کیونکہ پھر ان کے لیے کوئی اور صورت زندگی کی باقی ہی نہ رہتی تھی۔

انقلاب فرانس کی وجہ سے جرمنی میں فحاشی کا اور بھی زیادہ زور ہو گیا کیونکہ فرانس سے جو امراء فرار ہو کر جرمنی میں پناہ گزیں ہوئے وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو اس طبقہ کے بڑے قدر دان تھے۔ کہتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے شہر کوبلنز (Coblenz) میں قدم رکھا تو شہر کا ہر دوراہ خانہ قحبہ خانہ بن گیا۔ اور چند روز میں وادی دریائے رہائن کے تمام شہروں میں آتشک

کی بیماری پھیل گئی جس کا نام "تارکانِ وطن کا تحفہ" رکھا گیا۔

چونکہ لوگ فرانس سے ہجرت کرتے وقت بہت کم روپیہ اپنے ساتھ لائے تھے یا خالی ہاتھ تھے ان سے محنت مزدوری نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے ان میں بہت سے دلال بن گئے۔ شہر ہیمبرگ میں فرانسیسیوں نے وہ شائستہ طریقے قحبہ خانوں میں جاری کیے جو اس سے پیشتر خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے اسی زمانہ کا ایک مصنف تحریر کرتا ہے کہ :۔

"شراب خانے محل سرا بن گئے اور ہماری لڑکیاں بیگمات بن گئیں، الغرض ان بدچلن پناہ گزینوں نے ہم سب کو "نستعلیق" کردیا۔ عیاشوں کے گروہ بلا روک ٹوک ہمارے دل پسند بازاروں میں تیز گامیاں دکھانے لگے شرم و حیا اور شرافت و نجابت منہ پھیر کر بھاگ گئیں اور جو چند بھلے آدمی رہ گئے تھے وہ دیکھ دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔"

۱۸۰۷ء میں شہر ہیمبرگ کے ارباب حل و عقد نے فحاشی کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا اور کسبیوں پر ٹیکس لگا کر ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے نام پولیس کے رجسٹر میں درج کرائیں اور بہ اوقاتِ مقررہ باقاعدہ معائنہ کرائیں۔ ٹیکس کے ذریعہ جو آمدنی ہوتی تھی وہ نفاذ احکام کے مصارف نکال کر میونسپل اسپتال میں خرچ ہوتی تھی ۱۸۳۴ء میں ہیمبرگ کے ڈائرکٹر سررشتۂ پولیس ڈاکٹر والکر نے "نیلی کتاب" کے نام سے ایک مجموعہ ضوابط جاری کیا جس کی رو سے ہر کسبی خواہ وہ علیحدہ کمرہ میں رہتی ہو یا قحبہ خانہ میں خود کو پولیس میں درج رجسٹر کراتی تھی اور ایسے گھر میں جہاں فحاشی ہوتی تھی کم از کم ایک عورت ضرور

رکھنی پڑتی تھی جو درج رجسٹر ہو اور پولیس کو پورا اختیار بھی حاصل تھا۔ جو عورتیں بطور مدخولہ یا حرم رکھی جاتی تھیں انھیں بھی رجسٹر میں درج کرانا پڑتا تھا لیکن وہ باقاعدہ طبی معائنہ کے لیے مجبور نہ تھیں۔ بیس برس سے کم عمر کی لڑکیوں کو جو پہلے سے پیشہ نہیں کرتی تھیں انھیں درج رجسٹر ہونے سے باز رکھا جاتا تھا۔ بشرطیکہ وہ پہلے سے آبرو باختہ نہ ہوں اور اس پیشہ کے سوا اور کوئی ذریعہ ان کی معاش کا نہ ہو۔ پچیس سال سے کم عمر کی کسی عورت کو بشرطیکہ وہ بحیثیت ایک کسبی کے درج رجسٹر نہ ہو کسی قحبہ خانہ میں خادمہ کی حیثیت سے نہیں رکھا جاتا تھا دس برس سے زیادہ عمر کے بچوں کو بھی قحبہ خانہ میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔ بازاروں یا سڑکوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بلانا ممنوع تھا اور کسی کسبی کو گیارہ بجے کے بعد کسی مرد کو ساتھ لے کر باہر شہر میں پھرنا ممنوع تھا۔ بیس برس سے کم عمر کے مردوں کو قحبہ خانہ میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ کسی قحبہ خانہ میں گانے بجانے یا جوا کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں اور شرابوں کی فروخت کے لیے خاص لائسنس لینا پڑتا تھا۔ تمام درج رجسٹر عورتیں ہفتہ میں ایک بار ضرور اپنا طبی معائنہ کراتی تھیں۔

۱۷۰۰ء کے بعد سے ریاست پروشیا میں "معصیت ناگزیر" سمجھ کر فحاشی کی طرف سے چشم پوشی کی جانے لگی۔ پھر ۱۷۹۲ء میں جدید قانون جاری کیا گیا جس کی رو سے کسبیوں کو چہرہ پر غازہ ملنا جاذبِ نظر لباس پہننا ممنوع قرار دیا گیا۔ جو عورتیں اول اول پیشہ اختیار کرنا چاہتی تھیں انھیں اپنا نام پولیس کے رجسٹر میں درج کرانا پڑتا تھا، اطبا، تمام ایسی عورتوں کو امراضِ خبیثہ کی علامت

بتا دیتے تھے تاکہ وہ خود اپنے اندر یا آنے جانے والوں میں ان کو پہچان سکیں، خلاف ورزی قانون کی صورت میں بڑی سے بڑی سزا تین سال کی قید تھی اور جیل خانہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے وقت کوڑے الگ مارے جاتے تھے۔ جو والدین یا اُستانیاں اپنی لڑکیوں یا شاگردوں سے پیشہ کراتی تھیں انھیں کار خانہ میں چھ سال کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ جو مرد امراض پیشہ میں مبتلا ہو کر پبلک قحبہ خانوں میں آتے تھے اور اُن سے کبھی کسی کو بیماری لگ جاتی تھی تو انھیں علاج کا تمام خرچ دینا پڑتا تھا علاوہ جرمانہ یا قید علٰحدہ دی جاتی تھی۔

سنہ ۱۸۰۴ء میں برلن کے اندر پچاس قحبہ خانے موجود تھے جن میں ۲۳۰ کسبیاں رہتی تھیں۔ علاوہ ازیں ۲۰۳ ایسی درج رجسٹر تھیں جو الگ مکانوں میں رہتی تھیں اس وقت شہر کی آبادی غالباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔

سنہ ۱۸۱۴ء میں جب برلن کے قحبہ خانے بند کر دیے گئے تو شہر میں بڑا جوش پھیلا کیونکہ پرائیوٹ طور پر فحاشی بہت بڑھ گئی تھی اور اسی کے ساتھ آتشک بھی۔ آخر کار فحاشی کو قانوناً پھر جائز تسلیم کر لیا گیا اور وہی پُرانا طریقہ پولیس کی نگرانی کا دوبارہ جاری ہو گیا۔

اخلاقِ جنسی

ماضی ــــ حال ــــ مستقبل

ماضی | شہوانیات یا جنسیات (Sexology) کے طالب علم پر یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ اخلاق کا مفہوم مختلف قوموں اور زمانوں میں ہمیشہ مختلف رہا ہے یعنی اگر کوئی بات کسی قوم میں کسی وقت معیوب رہی ہے تو دوسری قوم میں اس کو مستحسن سمجھا گیا ہے بلکہ خود ایک ہی قوم نے مختلف زمانوں میں مختلف معیار اخلاقیات کا قائم کیا آج اہل یورپ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے عورت کے احترام و اقتدار قائم کرنے میں غیر معمولی حصّہ لیا۔ لیکن انھیں لوگوں پر ایک زمانہ وہ بھی گزر چکا ہے جب عورت ان کے نزدیک بھیڑ بکری سے زیادہ کوئی بلند چیز نہ تھی اور ایک جائداد منقولہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت بھی حسب بیان مسٹر لوبک (Lubbock) آسٹریلیا میں اس کی تقریباً یہی حالت ہے ذرا ذرا سی بات پر اس کو مارنا، حد درجہ وحشیانہ سلوک اس کے ساتھ کرنا معمولی بات ہے، اور اگر بدقسمتی سے وہ کچھ حسین ہوئی تو اور قیامت ہے۔ افریقہ کا حال لٹورنو (Litourneo) نے لکھا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور مرد کو اختیار ہے کہ اس سے بار برداری کا کام

لے۔ اسی طرح ہمالیہ کے حصوں میں آریہ ہندوؤں نے تبتی قوموں کی طرح اشتراک فی النسواں اختیار کر رکھا ہے اور بازار کی دوسری جنسوں کی طرح عورت کی بھی خرید و فروخت ان کے یہاں رائج ہے وہ اپنی لڑکیوں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں اور متعدد بھائی صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کر لیتے ہیں جسے وہ حسب موقع و ضرورت دوسروں کو بھی کرایہ پر دیدیتے ہیں۔

نیوزی لینڈ میں لڑکی کا نکاح کرتے وقت باپ یا بھائی اس کے شوہر سے کہتا ہے کہ "دیکھو اگر تم اس سے مطمئن نہ ہو تو تمہیں اختیار ہے چاہے فروخت کر دو، چاہے مار ڈالو یا کھا جاؤ۔ الغرض تم اس کے مالک و مختار ہو"

پھر یہ حال صرف ان قوموں کا نہیں جو اب بھی جاہل و وحشی سمجھی جاتی ہیں بلکہ ان پر بھی گزر چکا ہے جو آج تہذیب و شائستگی کی علمبردار بنی ہوئی ہیں۔ چنانچہ روما کے قرون اولیٰ میں بھی بیوی محض ایک لونڈی کی حیثیت رکھتی تھی اور مقدس کاٹو (Cato) کے اس تاریخی واقعہ سے غالباً ناظرین آگاہ ہوں گے کہ اس نے اپنی بیوی مارشیا (Marcia) اپنے ایک دوست ہارٹن سیس (Hortensius) کو اُدھار دیدی تھی اور پھر اس کی موت پر واپس لے لی۔ الغرض ان کے یہاں بیوی کی کوئی جداگانہ حیثیت نہ تھی اور بازار کی دوسری معمولی جنسوں کی طرح اس کا لین دین ہو سکتا تھا۔ خود انگریزی قانون میں کسی وقت اس امر کی اجازت پائی جاتی تھی کہ ہر شوہر اپنی بیوی کو لکڑی سے زد و کوب کر سکتا ہے بشرطیکہ لکڑی انگوٹھے سے زیادہ موٹی نہ ہو۔

اس وقت ماں، بیٹی، بہن یا اسی طرح کی کسی اور قریبی رشتہ کی عورت سے نکاح

کرنا ناجائز قرار دیا جاتا ہی لیکن عہد عتیق میں اس کو معیوب نہیں جانتے تھے۔ اسٹرابو
(Strabo) کا بیان ہی کہ ۲۶ سال قبل مسیح عربوں میں اپنی بہنوں اور ماؤں
کے ساتھ تعلق جنسی رکھنا کوئی امر قبیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ عہد قدیم میں تعلق جنسی محض
ضرورتاً آبادی بڑھانے کے لیے پیدا کیا جاتا تھا اور اس میں کوئی خیال لذت و بدمستی
کا شامل نہ تھا۔ چنانچہ تمام ابتدائی مذاہب میں اس کا کچھ نہ کچھ ثبوت پایا جاتا ہی ہندوؤں
کے یہاں برہما کا اپنی بیٹی سرسوتی سے شادی کرنا مصریوں میں آہوں کا اپنی ماں سے
نکاح کرنا اور ڈین کا اپنی لڑکی فریگا (Frigga) کو قبالہ عقد میں لے آنا۔ جیوپٹر کا
اپنی بہن جونو (Juno) سے شادی کر لینا اصنمیات کے کھلے ہوئے واقعات ہیں۔

اجتماعی تعلق بھی کسی زمانہ میں بہت عام تھا۔ ہیروڈوٹس نے مساگیٹ
(Massagetae) قوم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے یہاں
ایک شخص ایک عورت سے شادی کرتا ہی لیکن پوری جماعت اس سے تعلق رکھتی ہی۔
یہ رواج اور اقوام میں بھی پایا جاتا تھا یہاں تک کہ مصریوں اور یونانیوں میں بھی اس
کو برا نہ جانتے تھے۔ چنانچہ اہل بابل میں یہ مذہبی دستور تھا کہ لڑکی مائلیتا دیوی کے معبد
میں جا کر اپنی عفت و دوشیزگی قربان کر دیتی تھی اور اسی نوع کی رسمیں آرمینیا، ٹائر اور
سڈون میں بھی پائی جاتی تھیں، لیبیان کی لڑکیاں شادی سے قبل تمام مصارف نکاح
اسی طرح کماتی تھیں اور ٹشیا میں بھی یہی رواج پایا جاتا تھا۔

اس وقت بھی جزائر مارکوئساس (Marquesas Islands) میں جو
جزائر فلپائن کا حصہ ہیں اور بعض افریقی قبائل میں اس طرح کا دستور موجود ہے حال کی
بات ہی کہ جزائر بلیرک (Balearic Islands) میں عام طور پر یہ رواج

قائم تھا کہ شب زفاف میں پہلے دلھن کے تمام مرد اقربا ترتیب عمر کے لحاظ سے مستفید ہوتے تھے اور پھر سب سے آخیر میں دولھا کو جانے کی اجازت ملتی تھی۔

ملابار میں کلیمر کے لوگ اپنی بیویوں کو باکرہ بنانے کے لیے مذہبی پوجاریوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور سنی گمبیا (Senigambia) میں اس خدمت کو سردار قبیلہ انجام دیتا ہے بعض قوموں میں اس غرض کے لیے مخصوص بُت بنائے جاتے ہیں اور "حق شب اولیں" (Jos Primae Noctis) کا معاملہ یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔

یونانی تہذیب کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں سیفو (Saffho) اور اُسکے شاگردوں کا غیر فطری استلذاذ بالنفس میں مشغول رہنا اور سقراط و افلاطون کا بھی مردوں کے لیے اس حرکت کو مناسب و جائز قرار دینا اس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ الغرض عہد قدیم میں اخلاق انسانی خواہ وہ جنسیات سے متعلق ہوں، یا زندگی کے کسی اور شعبہ سے زیادہ تر مذہبی خیالات کے زیر اثر قائم ہوئے اور دماغ انسانی نہ ان کے اسباب پر غور کر سکا اور نہ انجام و عواقب پر۔ لیکن بعد کو جب شعور انسانی نے ترقی کی تو اس نے کچھ نظریے بھی بنائے، دستور العمل بھی مرتب کیا اور علمی و فنی حیثیت سے اس قدر قدم بڑھایا اور اس باب میں زیادہ تر ہم اسی مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے کہ اہل یورپ جو تہذیب و شائستگی کے بڑے مدعی ہیں اور جو اپنے آپ کو عورت کا بڑا محسن سمجھتے ہیں اس باب میں کیا کیا اور آج کیا ہونے والا ہے۔

توریت اور اخلاق جنسی

موجودہ عیسوی اخلاق توریت کے بیان کیے ہوتے اخلاق پر قائم ہیں۔ عہد جدید میں انجیل کے بیانات

اور دیگر تعبیرات و تفسیرات کے مطابق کچھ حذف و اضافہ کر لیا گیا ہے۔ توریت میں اخلاق جنسی کی ابتدا اس اصول کی بنا پر ہوتی ہے کہ مرد و عورت کے درمیان تعلق جنسی افزائش نسل کے خیال سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ توریت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے زائد بیویاں کرنے کا رواج اُس وقت قائم تھا اور لامخ کا دو بیویاں رکھنا توریت سے ثابت ہے لیکن اسقف اعظم کو صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت تھی۔ بعد کو بادشاہوں کے لیے بھی یہی حکم نافذ کیا گیا، بلکہ سونے اور چاندی کی چیزیں بھی ممنوع الاستعمال قرار دی گئیں لیکن بادشاہوں نے نہ اُس کی پروا کی نہ اس کی۔ چنانچہ داؤدؑ کا متعدد بیویاں رکھنا اور سلیمانؑ کا تین سو کنیزیں رکھنا توریت سے ثابت ہے۔ قریب رشتہ کی عورتوں سے تعلق زناشوئی قائم کرنا بھی توریت سے ظاہر ہوتا ہے اور ابراہیمؑ کا اپنی سوتیلی بہن سارہ سے نکاح کرنا اس میں مذکور ہے۔ لوائرٹ (Levirate) توم کا قانون ایک مرد کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کرے۔ ابراہیمؑ کے ایک بچہ ان کی بیوی کی خادمہ سے بھی ہوا اور یعقوبؑ نے دو بہنوں سے شادی کی اور ان کی دو دو کنیزوں سے بھی ان کی اولاد ہوئی۔

عبرانی قانون میں بیوی، شوہر کی ملکیت ہوتی تھی اور وہ شوہر کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہ کر سکتی تھی۔ طلاق کا رواج تھا لیکن صرف مرد کی طرف سے۔ باپ کے اختیارات اولاد پر غیر محدود ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ ان کو ہلاک بھی کر سکتا تھا (لیکن عمل ہلاکت زیادہ تر لڑکیوں ہی تک محدود رہتا تھا) وہ لڑکیوں کو فروخت بھی کر سکتا تھا اور ان پر شوہروں کو وہی حق حاصل ہوتا جو کسی جائداد پر حاصل ہوتا ہے۔ عام معاشرت میں عورت کی عصمت و عفت کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی کیونکہ شادی شدہ

عورت و مرد کے ناجائز تعلق پر تو قتل تک کی سزا تھی لیکن دوشیزہ ہونے کی حالت میں عورت سے کوئی باز پرس نہ ہوتی تھی۔ لوطؑ کا جو قصہ توریت میں درج ہے اس سے پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی عصمت کا خیال اُس وقت اس قدر ضعیف تھا کہ مہمانوں کے سامنے انھیں پیش کر دیا جاتا تھا۔ الغرض یہ تھا عورت کا مرتبہ اور اخلاق جنسی عہد عتیق کا جس پر عیسویت نے اپنے اخلاق کی بنیاد قائم کی۔

انجیل اور اخلاق جنسی

مسیح نے جو تعلیم اخلاق جنسی کی پیش کی وہ از بس زیادہ عجیب و غریب تھی کیونکہ احتیاط کی وہ حد جو انھوں نے بیان کی کسی طرح قابل عمل نہ تھی آپ نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص کسی کی عورت کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہے تو گویا وہ اس کے ساتھ ارتکاب معصیت کا مجرم ہوتا ہے" اسی طرح طلاق کے متعلق ان کا یہ ارشاد تھا کہ "جو شخص بغیر الزام عصمت فروشی کے کسی عورت کو طلاق دیتا ہے وہ گویا اسے فحش پر مجبور کرتا ہے اور جو کوئی دوبارہ مطلقہ عورت سے شادی کرتا ہے وہ بھی حرام کاری کا مجرم ہوتا ہے" ظاہر ہے کہ عملی دُنیا میں یہ دونوں باتیں ناممکن العمل ہیں۔ نہ اُس قدر احتیاط ممکن ہے اور نہ اس قدر ضبط کسی عورت کو دیکھ کر بُرا خیال دل میں لانا اگر واقعی اسی قسم کی فحاشی ہے جس میں ایک شخص کی گردن جُدا ہو جانا چاہیے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کسی وقت دُنیا میں مرد کے وجود کو باقی نہ رہنا چاہیے تھا اور اگر طلاق کے لیے صرف عورت کی عصمت فروشی ہی جائز سبب ہو سکتا ہے تو معاشرت کے اطمینان کی پھر کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ مرد و زن کی باہمی جُدائی کے اور بھی سیکڑوں سبب ہو سکتے ہیں جن کا لحاظ حسب تعلیم مسیح ہونا نہ چاہیے۔ پھر یہ تعلیم اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ تعلق جنسی کی مخالفت میں اس حد تک غلو سے کام لیا جاتا ہے کہ "خدائی سلطنت" کا خریدار

صرف مخنثوں، ہیجڑوں اور نامردوں ہی کو قرار دیا جاتا ہی۔ اس کے بعد پال نے جو
درس پیش کیا اس سے بھی عورت کی غیر اہمیت ثابت ہوتی ہی کیونکہ شوہروں کی
اطاعت اُن پر فرض قرار دی گئی اور کلیسہ میں خاموش رہنے کا اُن کو حکم دیا گیا۔
کیونکہ شوہر عورتوں کے جسم کا نجات دہندہ ہی جس طرح مسیح رُوح کے نجات دہندہ تھے۔
پیٹر کی تعلیم بھی اِس باب میں کچھ زیادہ بلند نہ تھی۔ کیونکہ اس نے بدرجۂ مجبوری شادی
کو پسند کیا ورنہ وہ رہبانیت مطلق کا قائل تھا۔

ابتدائی عیسویت میں عورت ناپاک سمجھی جاتی تھی اور دُنیا میں تباہی لانے کا
باعث اسی کو قرار دیا جاتا تھا۔ ٹرٹولین (Tertullirn) عورت کو دوزخ
کا دروازہ بتاتا ہی اور ہیرونمس (Heironymus) شادی کو بُری عادت
قرار دیتا ہی۔ اسی طرح اوریجنس (Originus) نکاح کو معصیت بتاتا ہی اور
ٹامس اکوناس (Thomas Aquinas) اخیر تیرھویں صدی میں عورت کو
ایک مضرت رساں پیداوار سے تعبیر کرتا ہے۔

ظاہر ہی کہ جس تعلیم میں انسانیت کا اعلیٰ معیار مردوں کے لیے مخنث بن جانا ہو اور
جو عورت کو "دوزخ کا دروازہ" "مضرت رساں پیداوار" اور "نجس و ناپاک" وجود بیان کرکے
مردوں کے سر منڈھنا چاہتا ہو اور جو طلاق کا سدباب کرنے والا ہو وہ کیا معیشت و معاشرت
کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہی اور اُسے دنیا کیونکر قبول کرسکتی تھی۔

موجودہ اخلاقِ جنسی

اپٹن سنکلیر (Upton Sinclair) نے اپنی
مشہور کتاب "صحیفۂ حیات" (The Book of Life) میں اِس مسئلہ پر
بحث کرتے ہوئے بتایا ہی کہ اِس عیسوی تعلیم کا عملی نقطۂ نظر سے کیا حشر ہوا۔ وہ

لکھتا ہے کہ :-

"ادارۂ نکاح اس میں شک نہیں کہ نہایت بلند تعلیم پر مبنی ہے لیکن صحیح معنی میں نہ کبھی اس پر عمل ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل بھی یہی دیکھا گیا اور اب تو عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اب جو چیز نکاح کی جگہ رائج ہے اُسے ہم شناشی و فحاشی دونوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔"

اُس وقت کی جنسی و شہوانی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ :-

"آجکل کی عورت اور تعلیم یافتہ مردوں کی جماعت نکاح سے قبل جس طرح زندگی بسر کرتی ہے وہ مسیحی تعلیم کے لحاظ سے خواہ کچھ ہو لیکن سوسائٹی کے نزدیک وہ "تفریحات اندرون خانہ" سے زیادہ اہم نہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سے قبل فحاشی و عصمت فروشی کا تعلق زیادہ تر عورت سے تھا لیکن اب اسی حد تک مردوں سے ہے چنانچہ آپ مغرب کے ہوٹلوں میں دیکھیں گے کہ شام ہوئی اور عورتوں کے دھاوے مردوں پر شروع ہوگئے۔ گویا کہ یہ ایک جدید دور ہے جسے اخلاقِ جنسی کے لحاظ سے "مردانہ عصمت فروشی" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

اُس وقت دولت کا ایک بڑا مصرف اخلاق کی بے جا آزادی اور عورت کی عصمت کی ارزانی کو صفر کی حد تک کھینچ لاتا ہے۔ مغرب کی لکھتی جماعت کا کافی حصہ اپنے اوقات کا اس خیال میں صرف کرتی ہے کہ مسیح کی تعلیم رہبانیت کا انتقام کن کن جدید صورتوں سے لیا جائے۔ چنانچہ نیویارک کے ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اُس نے پندرہ سال میں ۹۰۰ ایسی لڑکیوں کو دیکھا جن کی انتہائی کمسنی

کی حالت میں عصمت دری کی گئی، یہاں تک کہ ان میں سے بعض ۹ ماہ کی تھیں!
غرباء کی جو حالت ہے وہ اِس سے زیادہ خراب ہے اور ناقابلِ بیان۔

اِس میں شک نہیں کہ بعض لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اس پر غور کر کے اصلاح کرنی چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے اور کامیابی کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ ان تمام خرابیوں کی ذمہ داری اولاً تو اس ابتدائی تعلیم پر عائد ہوتی ہے جس نے عورت کے درجہ کو پست کر کے غلامی کی حیثیت سے اُسے مرد کے سامنے پیش کیا اور دوسری اِس اصول پر کہ ایک وقت میں ایک ہی شادی کرنا چاہئے۔

مسیحی تعلیم کہتی ہے کہ اگر مرد و عورت میں سے کسی کو شریکِ زندگی نہ مل سکے تو اُسے چاہیے کہ خدا پر بھروسہ کر کے خاموش بیٹھ جائے کیونکہ وہی انسانی ضرورتوں کا پورا کرنے والا ہے یقیناً تعلیم اچھی ہے لیکن ایک حاجت مند کو صرف خدا کے بھروسہ کی تعلیم دینا اور عملاً اُس کی مشکلات کو دُور نہ کرنا کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک حبشی نے کہا تھا کہ یہ کیا بات ہے جب میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ "بارِ الٰہا ایک دَوڑتی مُرغی میرے پاس بھیج دے" تو یہ دُعا کبھی قبول نہیں ہوتی اور جب یہ دُعا کرتا ہوں کہ "مجھی کو اِس کے پیچھے دَوڑا دے" تو فوراً قبول ہو جاتی ہے۔

مذہبی اصولِ مذہب کے انحراف کا سب سے بڑا سبب اس قسم کی غلط تعلیم بھی ہوا کرتی ہے، کیونکہ ایک خاص حد تک تو انسان صبر و ضبط سے کام لے کر قانع رہ سکتا ہے لیکن اس کے بعد وہ اپنی خواہشات سے مجبور ہو کر کھُلم کھُلا کھیلتا ہے اور تعلیم ہی کو لغو سمجھنے لگتا ہے۔

مستقبل کا اخلاقِ جنسی

اربابِ نظر سے مخفی نہیں کہ دُنیا کی آزادی کے ساتھ

ساتھ اخلاق جنسی میں بھی بڑی آزادی پیدا ہو گئی ہے اور عورت کی ذہنی و علمی ترقی نے اُس کے اخلاق کا مفہوم بھی بڑی حد تک بدل دیا ہے۔

تقریباً ایک صدی قبل عورت کی مجبوری کی داستان یہ تھی کہ نہ اُس کو تعلیم دی جاتی تھی نہ سیاسی حقوق اُس کو حاصل تھے، نہ وہ تجارت کر سکتی تھی نہ کوئی فن سیکھ سکتی تھی اور نہ قانون کی نگاہ میں وہ مردوں کے برابر خیال کی جاتی تھی — لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں وہ مردوں کے دوش بدوش علوم و فنون حاصل کرتی ہے۔ ہر قسم کے پیشہ و تجارت میں برابر کا حصہ لیتی ہے۔ ملازمتیں کرتی ہے۔ رائے دینے کا مساوی حق رکھتی ہے۔ الغرض وہ سب کچھ کرتی ہے جو ایک مرد کر سکتا ہے اس لیے اگر اُس کا اخلاقی معیار بدل جائے تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔

وہ دَور جب مرد اُس پر حکومت کرتا تھا اور اُس کی حیثیت ایک کنیز سے زیادہ نہ تھی گزر گیا ہے، وہ اب خود مرد پر حکمراں نظر آتی ہے اور آزادی کے ساتھ جو جی میں آتی ہے کر بیٹھتی ہے۔ اس کے یہاں نہ کوئی اخلاقی قانون ہے نہ معاشری پابندی اس کی حالت اُس طائر کی سی ہے جو عرصہ تک قفس میں مقید رہنے کے بعد دفعتاً آزاد کر دیا جائے اور شوق پرواز اسے کسی ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دے وہ اگر کسی مرد سے شادی کرتی ہے تو اس خیال سے نہیں کہ تمدن و معاشرت کا نظام اس کا مقتضی ہے بلکہ صرف اس ارادے سے کہ اس طرح وہ اپنی آزادی کے لیے زیادہ وسیع بہانے پیدا کر سکے گی، نہ اُسے اولاد کی ضرورت ہے نہ شوہر کی، نہ اُسے کسی سرپرست کی حاجت ہے نہ رہبر و قائد کی۔ وہ ایک سیلاب ہے جو بند کو توڑ کر چاروں طرف پھیل گیا ہے اور جس کا روکنا اب کسی طرح ممکن نہیں اس لیے سوال یہ ہے کہ جب ابتدائے آزادی میں یہ حالت ہے تو آیندہ کیا

ہوگا اور عورت کی خود سری مستقبل میں کس معاشرت کو اختیار کرے گی اس کا بہترین جواب یورپ کے مشہور انشاپرداز ایچ جی ویلز H. G. Wells نے اپنے ناول "انسان خدا کا مانند" (Men Like the Gods) میں دیا ہے کہ کرۂ ارض کا ایک شخص کسی دوسرے کرہ میں پہنچ گیا جو بقدر تین ہزار سال زیادہ ترقی یافتہ تھا اور یہاں اس کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہاں نہ کسی کے جسم پر کپڑے کا نام ہے اور نہ غیرت و حیا کا کوئی مفہوم نہ وہاں شادی کا جھگڑا ہے نہ کسی اور پابندی کا۔ یعنی انسان بظاہر دیکھنے میں تو انسان، لیکن ہے حقیقتاً حیوان سے بدتر۔

عورت کی اس آزادی کا جو اقتصادی اثر دُنیا پر پڑتا ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کیونکہ بفرضِ محال اگر عورت نے کسی نہ کسی طرح بچہ جن دیا تو اس کی پرورش کون کرے گا نہ اس لحاظ سے کہ ابویت کی تعیین دُشوار ہوگی بلکہ اس بنا پر کہ عورت کو اتنی فرصت کہاں اور ہنگامۂ عالم میں اس کی شرکت تربیتِ اولاد کی اجازت کیونکر دے سکتی ہے۔ اس لئے دُنیا میں "اشتراکیت" کا پھیلنا یقینی ہے۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کی بقا و حفاظت صرف اسی طرح ممکن ہے کہ بالشویک روس کے موجودہ نظام کی مانند بچوں کی پرورش وغیرہ کلیتہً حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن اگر یہ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا۔ سنکلیر (Sinclair) نے عرصہ ہوا یہ تحریک ملک کے سامنے پیش کی تھی کہ جنسی جرائم کرنے والوں کو آختہ کر دیا جائے اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر رسل (Russell) مزاحیہ انداز میں لکھتا ہے کہ:-

"مستقبل میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ والدین میں سے جس کو چاہے آختہ کر دے"

رسل کا یہ خیال ہے کہ آیندہ زمانہ میں اخلاقی معیار بالکل بدل جائے گا اور ایک ہی شخص مختلف عورتوں سے خاندان بناتا چلا جائے گا۔ لیکن اس کا اختیار ہر شخص کو حاصل نہ ہوگا بلکہ خاص خاص لوگوں کو ہوگا اور اس لیے آیندہ دنیا کی نصف آبادی کے باپ صرف وزراء اور پادری ہوں گے۔

ہالڈین (Haldane) الگ مشہور ماہر علم الحیات لکھتا ہے کہ:-

"سنہ ۱۹۵۰ء تک ایسا طریقہ دریافت ہو جائے گا کہ عورت کے رحم سے جنین نکال کر اُس کو کیمیاوی محلول میں ڈال کر نشو و نما پانے کا موقعہ دیا جائے اس کے بعد وہ زمانہ آئے گا جب عورت کا رحم اس کے جسم سے علیحدہ کر کے بیس سال تک زندہ رکھا جا سکے گا جس سے ہر ماہ بیضۃ الجنین (Ovum) پیدا ہوتا رہے گا اور ۹۰ فی صدی کی نسبت سے یہ مادہ تشکیل جنین کا کام دے سکے گا اور ۹ ماہ کے بعد اس سے صحیح و سالم بچہ پیدا ہوا کرے گا۔ پھر جب اس طرح محبت جنسی اور تولید دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہو جائیں گی تو انسانی معاشرت و نفسیات میں تغیر عظیم واقع ہوگا اور دنیا بالکل نئے اُصول پر کاربند ہوگی۔"

ممکن ہے کہ ہالڈین نے جو کچھ لکھا ہے اِس میں مزاح کا پہلو شامل ہو، لیکن اِس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مغرب کی عورت کس حد تک آزاد ہو چکی ہے اور دُنیا کس خطرہ میں مبتلا ہے۔